

خاتون

جولائی 2017ء



ہر گھر کیلئے

ماہنامہ

حنا

جلد 39 شماره 6

جون 2017ء

قیمت -/60 روپے

بانی :

سردار محمود

مدیر اعلیٰ :

سردار طاہر محمود

مدیرہ :

تسليم طاہر

نائب مدیران :

ارم طارق

تحریر محمود

مدیرہ خصوصی :

فوزیہ شفیق

قانونی مشیر :

سردار طارق محمود

(ایڈوکیٹ)

آرٹ ایڈیٹر :

کاشف گوریجہ

اشتہارات :

خاندہ جیلانی

افراز علی نازش



# بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ناولٹ

- 130 ان لمحوں کے دامن میں ہمشیرہ انصاری  
210 محبت نام ہے جس کا سیرافک

## مکمل ناول

- 44 پریت نہ کچھ کوئی بشری سیال  
86 عشق سفر کی دھول حشریہ انبوت  
178 نئے خواب خوشنما تنوید زام

## افسانے

- 39 خالی دل جمیعہ اختر  
117 بکھرنے سے زرا پہلے رشاد احمد  
205 زرہ بے نشان مجاہد خالد

## اسلامیات

- 7 حمد میر تقی میر  
7 نعت بکرم آبادی  
8 پیارے نبی کی پیاری باتیں ادارہ  
13 فضیلت کی راتیں

## انشاء نامہ

- 21 قدرت اللہ شہاب کی باتیں ابن انشاء

## سلسلہ ناول

- 39 خالی دل جمیعہ اختر  
117 بکھرنے سے زرا پہلے رشاد احمد  
205 زرہ بے نشان مجاہد خالد  
22 اُم مریم  
160 پر بت کے اُس پار کہیں نایاب جیلانی

انتباہ: ہمارے ہمارے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پیش کردہ تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔



241	تسليم طاہر	238	بیاض	تحریم محمود	حاصل مطالعہ
252	افراح طارق	250	حنا کا دسترخوان	صائبر محمود	میری ڈائری سے
256	فوزیہ شفیق	247	کس قیامت کے یہ نامے	بقیس بیٹی	رنگ حنا
		245		مین مین	حنا کی محفل



سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔  
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ  
اردو بازار لاہور فون: 042-37310797, 042-37321690 ای میل ایڈریس،  
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com



قارئین کرام! جولائی کا شمارہ 2017ء پیش خدمت ہے۔

رمضان المبارک کے مقدس اور بابرکت مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ قارئین کو رمضان المبارک کی آمد مبارک۔ یہ خوش نصیبی ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ رحمتوں کی بارش لئے ہم پہ سایہ فگن ہے۔ قدرت نے ہمیں ایک بار بھر موقع دیا ہے کہ اس ماہ مقدس کی خیر و برکت سے ہم اپنے نامہ اعمال میں خیر کثیر کا اضافہ کر لیں۔

رمضان المبارک میں عبادتوں کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے۔ فرض عبادتوں کے علاوہ نفل، تراویح اور تلاوت کلام پاک کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ مہینہ بھر میں کم از کم ایک بار پورے قرآن کی تلاوت ضرور کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دیتا ہے وہ ایک سے زیادہ بار قرآن پاک ختم کرتے ہیں لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ عربی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر ہم قرآن پاک کا صحیح مفہوم جاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ جس میں دو جہاں کے علم کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اس ماہ مقدس میں ایک بار ترجمے کے ساتھ قرآن پاک ضرور پڑھیں تاکہ اس عظیم ہدایت سے روشناس ہو سکیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کے ذریعے عطا کی ہے اور اپنے دین کی صحیح سمجھ، فہم اور احساس حاصل کر کے نیکی اور سچائی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری عبادتوں کو قبول فرمائے اور ہم سب کو اس مبارک مہینے کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق فرمائے آمین۔

عید نمبر:- جولائی کا شمارہ ”عید نمبر“ ہوگا عید نمبر کے لئے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوادیں، عید نمبر میں مہندی کے ڈیزائن، عید کے اشعار اور دیگر دلچسپیوں کے ساتھ مصنفین اور قارئین سے عید سروے بھی شامل ہوگا، عید سروے کے جوابات اٹھارہ جولائی تک بھیج دیں۔

اس شمارے میں:- فضیلت کی راتیں، رمضان المبارک کی خصوصی تحریر، ام مریم اور نایاب جیلانی کے سلسلے دار ناول، بشری سیال، عرشہ راجپوت اور تمیلہ زاہد کے مکمل ناول، ہمشیرہ انصاری اور سویرا فلک کے ناول، برمشا احمد، عزہ خالد اور تحسین اختر کے افسانوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر  
سردار طاہر محمود



دل رفتہ جمال ہے اس ذوالجلال کا  
مجمع جمیع صفات و کمال کا

ادراک کو ہے ذات مقدس میں دخل کیا  
اودھر نہیں گزر گمان و خیال کا  
قدرت کی آن والے رحمت کی شان والے  
تجھ پہ جہاں تصدق او پاک جان والے

حیرت ہے عارفوں کو نہیں راہ معرفت  
حال کچھ اور ہے یاں انہوں کے حال و قال کا  
دونوں جہاں کی نعمت ہے مٹھیوں میں تیری  
بوسیدہ کپڑوں والے ٹوٹے مکان والے

ہے قسمت زمین و فلک سے غرض نمود  
جلوہ و گرنہ سب میں ہے اس کے جمال کا  
ایسے تھے آپ اہی کھولی زبان جس دم  
دم بھر میں بے زباں تھے ساری زبان والے

مرنے کا بھی خیال رہے میر اگر تجھے  
ہے اشتیاق جان جہاں کے وصال کا  
روضہ پہ آئے صبا تو جا کر یہ عرض کر دے  
مہجور گرب تک آخر پاکستان والے

اک جنبش نگہ کے سب منتظر کھڑے ہیں  
پر درد قلب والے پر سوز جان والے

میر تقی میر

جگر مراد آبادی

# دیوارِ فحش کی ریسری بائیس

ادارہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ”میں نہیں جانتا یہ قرآن کی آیت ہے (جس کی تلاوت مسنوخ ہو گئی یا قرآن کی آیت نہیں) (بلکہ حدیث ہے)“  
عبداللہ بن زبیر سے روایت ہے۔  
”اے لوگو! تحقیق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔“

”اگر ایک آدمی کو ایک وادی سونا مل جائے تو بھی قناعت نہیں کرے گا، دوسری وادی چاہے گا، اگر دوسری بھی مل جائے تو تیسری چاہے گا، بات یہ ہے کہ آدمی کا پیٹ مٹی ہی بھرتی ہے (یعنی موت) اور اللہ تعالیٰ اسی کی توبہ قبول کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع ہو۔“

باب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا، یہ دنیا کا حال (ظاہر میں) بہت شیریں ہر ابھرا ہے اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ آل عمران میں) فرمایا۔

”مرغوب چیزوں کی خواہش لوگوں کے لئے مزیں کر دی گئی ہے، عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے ڈھیر کے ڈھیر، عمدہ نشان زدہ گھوڑے اور چوپائے، کھیت یہ سب چیزیں دنیا کے ساز و سامان ہیں۔“

اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

”یا اللہ! ان چیزوں سے بچنے کی طاقت نہیں رکھتے مگر یہ کہ ان چیزوں کے ملنے سے خوش ہوتے ہیں جن کی محبت تو نے ہمارے دل میں ڈال دی ہے، یا اللہ! میں یہ چاہتا ہوں ان چیزوں کو ان ہی کاموں میں خرچ کروں جن میں

باب، مال کے فتنے سے ڈرتے رہنے کا

## بیان

اور اللہ تعالیٰ (سورہ تغابن میں فرماتا ہے) تمہارے مال اور اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہیں۔

## آدمی کی حرص

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔

”آدمی (کی حرص) کا یہ حال ہے کہ اگر اس کے پاس دو وادیاں مال (یا سونا) ہو تو اس پر بھی قناعت نہ کرے گا (تیسری وادی ڈھونڈے گا اور آدمی کا پیٹ صرف اور صرف مٹی ہی بھرے گی اور اللہ تعالیٰ اسی کی توبہ قبول کرتا ہے جو اس کی طرف (دل سے) توبہ کرتا ہے۔“

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایات ہے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔

”اگر آدمی کے پاس ایک وادی مال اسباب ہو تو بھی دوسری وادی کی آرزو کرے گا اور آدمی کی آنکھ اسی وقت بھرے گی، جب مٹی میں گڑے گا اور اللہ اسی شخص کی توبہ قبول کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔“ ابن عباس



خرچ کرنا چاہیے۔“

اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ ہود میں) فرمایا۔

”جو شخص (نیکیاں کر کے) دنیا کے سازو

سامان اور اس کی زندگی کا طلب گار ہوگا، ہم ایسے لوگوں کے اعمال کا بدلہ دینا ہی میں ان کو پرادیں گے اور وہ دنیا میں گھانا نہیں اٹھائیں گے، پر ان لوگوں کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، دنیا میں جتنے نیک کام کیے، وہ آخرت میں کسی کام نہیں آئیں گے، سب (حرف غلط کی طرح) مٹ جا رہے۔“

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

”میں ایک رات (اپنے گھر سے) باہر نکلا، کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکیلے جا رہے تھے، ایک آدمی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہیں ہے، میں یہ سمجھ کر کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اپنے ساتھ لے چلنا پسند نہ کیا ہو (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہیں گیا) دور رہی دور چاند کے سائے میں چلے لگا، یک بارگی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگاہ پھیری تو مجھے دیکھ لیا اور پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

میں نے کہا۔

”میں ہوں ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اللہ مجھ

کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان کرے۔“

فرمایا۔

”ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! ادھر آ۔“

اس وقت میں لمحہ بھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو لوگ دنیا میں بہت مال و دولت رکھتے

ہیں، آخرت میں وہی نادار ہوں گے، البتہ وہ شخص جس کو اللہ نے دولت دی ہو پھر وہ دائیں

## دینے والا ہاتھ

حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا (کچھ روپیہ مانگا)، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عنایت فرمایا پھر سوال کیا تو پھر دیا پھر فرمانے لگے۔

”حکیم یہ دنیا کا مال (ظاہر میں) تو ہر ا بھرا شیریں (اور خوشنما ہے) ہے لیکن جو کوئی اس کو سیر چمسی سے لے گا زیادہ حرص نہ کرے گا تو اس میں برکت ہوگی اور جو کوئی اس میں نیت لگا کر (حرص اور طمع کے ساتھ) لے گا اس کو برکت نہ ہوگی، اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جو کھاتا ہے، پر سیر نہیں ہوتا اور یہ بھی سمجھ لے کہ اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔“

## آدمی جو مال اللہ کی راہ میں دے

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”تم میں کون ایسا ہے جس کو اپنے وارث کا مال خود اس کے مال سے زیادہ پیارا ہو؟“

لوگوں نے کہا۔

”ایسا تو کوئی ہیں ہے، ہر ایک کو اپنا ہی مال

زیادہ پیارا ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”پھر تو (یہ سمجھ لو کہ) آدمی کا مال وہی ہے جو اس نے آگے بھیجا اور جتنا مال چھوڑ گیا اس کے وارثوں کا ہے۔“

## دنیا میں مال دار



اس وقت میں نے کہا۔  
”اے جبریل! گو وہ زنا اور چوری کرے؟“

انہوں نے کہا۔  
”ہاں، (گو وہ زنا اور چوری کرے)“  
پھر انہوں نے کہا، پھر میں نے کہا ”گو وہ زنا اور چوری کرے؟“ ہاں اگرچہ وہ شراب بھی پئے۔“ اور ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب مرتے وقت لا الہ الا اللہ کہے (توحید پر خاتمہ ہو۔)

### مال جمع کرنا

ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، میں مدینہ کی کالی پتھریلی زمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا، اتنے میں سامنے سے احد پہاڑ دکھائی دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ!“  
میں نے عرض کی۔

”حاضر ہوں میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”اگر میں پہاڑ کے برابر سونا میرے پاس ہو اور تین دن سے زیادہ اس میں ایک انثرنی برابر سونا اپنے پاس رہنے دوں تو یہ مجھ کو اچھا نہیں لگتا (بلکہ تین دن کے اندر سب ہانٹ دوں) البتہ اگر کسی کا قرض مجھ پر ہو تو اس کی ادائیگی کے لئے کچھ رکھ چھوڑ دوں تو یہ اور بات ہے، میں سارا سونا اللہ کے بندوں میں بانٹ دوں، دائیں بائیں پیچھے (تینوں طرف والوں کو) یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلنے لگے پھر فرمایا۔  
”جو لوگ دنیا میں بہت مال و دولت رکھتے

بائیں اور آگے پیچھے (چاروں طرف) اس کو لٹائے (مٹا جوں کو دے) اور دولت نیک کام میں خرچ کرے، وہ آخرت میں نادر نہ ہوگا۔“

ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔  
”آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک صاف ہموار میدان میں بٹھا دیا جس کے ارد گرد پتھر تھے اور فرمایا۔

”جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں تم یہاں بیٹھے رہو۔“

ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پتھریلی زمین میں تشریف لے گئے، اتنے دور چلے گئے کہ میری نظر سے غائب ہو گئے اور بہت دیر لگائی، اس کے بعد میں نے دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لا رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں۔  
”تو زنا اور چوری کرے۔“

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ پہنچے تو مجھ سے نہ ہانپا، میں نے کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ مجھ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سے صدقہ کرے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پتھریلی زمین کے کناروں پر کس سے باتیں کر رہے تھے، میں نے تو کسی شخص کی آواز نہیں سنی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ جواب دیتا ہو۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ جبریل علیہ السلام تھے، اس کالی پتھریلی زمین کے کنارے میں مجھ سے ملے اور کہا، تم اپنی امت کو یہ خوش خبری سنا دو جو کوئی تمہاری امت میں سے ایسی حالت میں مر جائے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتا ہو (گو دوسرے گناہوں میں گرفتار ہو) وہ (ایک نہ ایک دن) ضرور بہشت میں جائے گا۔“

ہیں، آخرت میں وہی نادار اور مفلس ہوں گے، البتہ جو شخص اپنے مال و دولت کو دائیں بائیں پیچھے تینوں طرف والوں کو تقسیم کرتا رہے (جوڑ کر نہ رکھے) وہ تلاش نہ ہوگا اور قسم کے (مٹی لوگ) کم ہیں۔“

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔  
”جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں تو یہیں

نظر رہا رہے، سرکنا نہیں۔“

یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندھیری رات میں اتنے دور نکل گئے کہ نظر سے غائب ہو گئے پھر میرے کان میں کچھ آواز آئی اور آواز بھی بکارنے کی، میں ڈرا، کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی واقعہ پیش نہ آیا ہو (کسی دشمن نے حملہ کیا ہو) اور میں نے قصد کیا، آگے بڑھ کر دیکھوں لیکن مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔

”جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں تو یہاں سے نہ سرکنا۔“ آخر وہ اسی جگہ ٹھہرا رہا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو میں نے عرض کی۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے ایک آواز سنی تھی تو ڈر گیا تھا، کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقصان نہ پہنچا ہو اور میرے دل میں جو آیا تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔  
”ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! تو نے آواز سنی تھی؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ جبریل علیہ السلام کی آواز تھی، جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے، کہنے لگے، تمہاری امت میں سے جو کوئی اس حال میں مر جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرتا ہو تو بہشت میں جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”گودہ زنا اور چوری کرے؟“ انہوں نے کہا۔

”گودہ زنا اور چوری کرے۔“

احد کے برابر سونا

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو بھی میں اس پر خوش ہوں گا کہ تین دن گزرنے سے پہلے اس میں سے کچھ بھی میرے پاس باقی نہ رہے (سب تقسیم کر دوں) البتہ اگر کسی کا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ رکھ چھوڑوں تو یہ اور بات ہے۔“

مال دار کون ہے؟

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”امیر اور تو نگری بہت مال و اسباب ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ اصل تو نگری دل کی تو نگری ہے۔“

باب، فقیری کی فضیلت کا بیان

سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سے گزرا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے پاس ایک شخص (ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا۔  
 ”اس شخص کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“  
 انہوں نے کہا۔

”یہ شریف (مال دار) لوگوں میں سے ہے، اللہ کی قسم یہ شخص ایسا ہے، اگر کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے تو اس کا پیغام منظور ہوگا، اگر کسی کی سفارش کرے تو لوگ اس کی سفارش سنیں گے۔“

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو رہے پھر ایک اور شخص (جلیل بن سراقہ یا اور کوئی) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سے گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی شخص (ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے پوچھا۔  
 ”اس شخص کو تم کیسا سمجھتے ہو؟“

انہوں نے کہا۔  
 ”یہ تو ایک مسلمان غریب آدمی ہے، یہ بے چارہ اگر آپہیں نکاح کا پیغام بھیجے تو منظور نہیں کیا جائے گا، اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش منظور نہیں کی جائے گی، (نہیں مانی جائے گی) اور اگر کوئی بات کرے تو اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ پچھلا (محتاج) شخص پہلے مال دار شخص سے، گویا آدمی زمین بھر کر ہوں تو بھی بہتر ہے۔“

عمران بن حصین سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”میں نے بہشت میں جھانکا، دیکھا تو وہاں وہ لوگ زیادہ ہیں جو دنیا میں فقیر اور محتاج

تھے اور دوزخ میں بھی جھانکا، وہاں عورتیں بہت تھیں۔“  
 انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ کہتے تھے۔  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرتے دم تک بھی دسترخوان پر کھانا نہیں کھایا، نہ باریک چپانی بھی تناول فرمائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا۔  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی اور میرے توشہ خانہ میں کوئی غلہ نہ تھا جس کو کوئی جان دار کھاتا، البتہ کچھ جو بڑے ہوئے تھے، میں وہی (ایک مدت تک) کھاتی رہی، آخر اکتا کر جب بہت دن گزرے (وہ جو ختم نہیں ہوتے تھے) تو میں نے ان کو مایا تب وہ ختم ہو گئے۔“

باب، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گزران کا بیان

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا کرتے تھے۔  
 ”قسم اس پروردگار کی جس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں) مارے بھوک کے اپنا پیٹ زمین سے لگا دیتا، بھی ایسا ہوتا بھوک کی شدت میں ایک پتھر پیٹ پر باندھ لیتا، ایک دن میں سر راہ جہاں پر سے لوگ گزرا کرتے تھے، بیٹھا، اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے، میں نے ان سے قرآن کی ایک آیت پوچھی، میرا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں۔“

☆☆☆

## فضلیت کی راتیں

اللہ رب العزت کی رحمتوں، بخششوں اور کرم نوازیوں کا خاص مہینہ رمضان المبارک شروع ہو چکا ہے، یہ ایک ایسا عظیم مہینہ ہے جس کے پہلے عشرے میں بے انتہا رحمتوں کی بارشیں ہوتی ہیں اور دوسرے عشرے میں رب کائنات اپنے گناہ گار بندوں کی نافرمانیوں کو درگزر فرماتے ہیں، جبکہ آخری عشرے میں ایسے مومن عاصیوں کو جہنم سے نجات عطا فرماتے ہیں جن کے لئے دوزخ کی سزا مقرر ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ اس ماہ مبارک کا ذوق و شوق اور احترام و تعظیم کے ساتھ استقبال کریں اور اس کی خیرات و برکات سے اپنی جھولیاں بھر لیں، اس ماہ معظم میں وہ کام ہوتا ہے جو دوسرے مہینوں میں نہیں ہو پاتا، قرآن مجید کا اس مہینے میں خاص تعلق ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ اس میں قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جاتا ہے، پڑھنا بھی آسان معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس سہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، دوسرے یہ کہ برائیوں سے بچنا اس ماہ میں دشوار نہیں ہوتا بلکہ طبع سلیم کے لئے آسان ہوتا ہے کہ نافرمانیوں اور اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغاوت کے اعمال سے باز آ جائے، اگر گزشتہ گیارہ ماہ میں برائیوں کو چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی تو اب رمضان کی صورت میں اچھا موقع ہے کہ خواہش نفس کی پیروی ترک کر دی جائے، نیز

نیکیاں بھی اس ماہ مبارک میں سہل محسوس ہوتی ہیں، لہذا بندوں کو چاہیے کہ اس ماہ نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں کہ خوب اجر و ثواب کمائیں، کیا معلوم کہ آئندہ رمضان شریف تک آپ اور ہم زندہ بھی نہیں رہیں۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے ذوق و شوق سے ماہ رمضان المبارک کا انتظار فرماتے تھے، ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب رجب المرجب کا مہینہ آتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی فرحت و مسرت کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے۔

”کہ اے اللہ! ہمارے لئے (زندگی و صحت میں) رجب اور شعبان کے مہینوں میں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان شریف کے مہینے تک پہنچا دے تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ اس ماہ مبارک کی خیرات و برکات سے خود کو بہرہ مند کر سکیں۔“

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر لوگوں کو رمضان کی فضلیت کا علم ہو جاتا، تو میری امت سارا سال رمضان رہ جانے کی تمنا کر لیتی۔“

طبرانی کی روایت میں ہے کہ، جب رمضان شریف کا مہینہ آتا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”تمہارے پاس رمضان آ گیا ہے، برکت

ہے۔“ بعض روایات میں ”مرۃ الشیطان“ کا لفظ ہے، یعنی باغی سرکش قسم کے شیطان کو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ایسے شیطان پھر رمضان المبارک میں لوگوں کو بہکانے آ نہیں سکتے کہ لوگوں سے بڑے بڑے گناہ سرزد کروائیں۔  
الغرض آدمی کو چاہیے کہ رمضان کے اس تربیتی مہینے سے خوب استفادہ کرے اور ایسا نہ ہو کہ خواب غفلت میں لگا رہے اور یہ بابرکت مہینہ ہاتھ سے نکل جائے۔

ماہ رمضان قرآن و سنت کے آئینے میں

### رمضان قرآن کا مہینہ

رمضان شریف کے مہینے میں انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ”القرآن“ نازل کی گئی جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے، ”رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور وہ ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راست دکھانے والی اور حقوق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

### رمضان شب قدر کا مہینہ

پھر اس ماہ کے جس جزو وقت میں قرآن مجید کو اتارا گیا، وہ رات کا وقت تھا جس کی الگ حرمت و عظمت بن گئی، چنانچہ اسے ”لیلۃ القدر“ کا نام عطا ہو گیا، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے ”ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے، فرشتے اور روح (جبریل علیہ السلام) اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں، وہ رات سراسر سلامتی ہے طلاع فجر تک۔“ (سورۃ القدر) شب قدر کی خصوصیات پر مزید روشنی ڈالتے

کا مہینہ جس کے دوران اللہ پاک تمہیں (اپنی رحمت و مغفرت سے) گھیرے میں لے لیتا ہے، خطائیں درگزر فرماتا ہے، رحمت نازل فرماتا ہے اور دعا قبول فرماتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ خیر اور بھلائی کے میدان میں تم لوگوں کا مقابلہ کیسا ہوتا ہے اور تمہیں لے کر فرشتوں سے نذر کرتا ہے، لہذا تم لوگ اللہ کو اپنی طرف سے بھلائی دکھاؤ، کیونکہ بد بخت اور قسمت کا مارا وہ شخص ہے جو اس جیسے مہینے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہ گیا۔“

درحقیقت ماہ رمضان نفس و روح کی تربیت کا بہترین کورس ہے، اس میں آدمی چاہے تو بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، سدھار سکتا ہے، اصلاح کر سکتا ہے، بہت کچھ بنا سکتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے باغیانہ رویہ اختیار کرنے کے پیچھے دو عناصر سب سے زیادہ کارفرما ہوتے ہیں، ایک انسان کا اپنا نفس امارہ ہے جس کا کام ہی انسان کو برائی کی جانب دھکیلنا ہوتا ہے تاکہ انسان ہلاکت کا شکار ہو جائے، ادھر اللہ پاک نے اس نفس امارہ کے تقاضوں اور خواہشوں پر پابندی لگا دی کہ رمضان المبارک کے دنوں میں کھانے، پینے اور شہوانی خواہش پوری کرنے کی اجازت نہیں، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نفس پھر کمزور پڑ جاتا ہے، اس کی رغبتوں کا زور ٹوٹا ہوا ہوتا ہے، چنانچہ ذرا سی ہمت کر لے تو انسان اپنی نفسانی خواہشات پر رمضان شریف میں پاسبانی قابو پا لیتا ہے اور دوسرا جو ہے انسان کا دائمی دشمن شیطان ہے، خواہ انسانی شیطان ہو یا جنی شیطان، جس کے ورغلانے پر انسان دھوکے میں پڑ جاتا ہے، جہاں تک جنی شیطان کا تعلق ہے تو ایک متفق علیہ حدیث نبوی میں یہ ارشاد آیا ہے۔

”شیطان کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا

ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا۔

”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے نبیوں کے پیروکاروں پر فرض کیے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی، چند مقرر دنوں کے روزے ہیں، اگر کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ ادا کریں، ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے، لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔“ (سورۃ البقرہ)

### روزے کی فرضیت اور تراویح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”تم لوگوں کے پاس رمضان کا مبارک مہینہ آچکا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے تم پر فرض کیے ہیں۔“ (نسائی بیہقی)

جناب نضر بن شیبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ رب العزت نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے ہیں اور میں تم پر رمضان کی رات کا قیام (نماز تراویح) سنت قرار دیتا ہوں۔“ (مسند احمد، سنن بیہقی)

### روزے کا اجر و ثواب

ویسے تمام اعمال صالحہ اور عبادات تو اللہ ہی کے لئے انسان کرتا ہے اور اللہ کو بھی یہ بات

”ح، م، قسم ہے اس کتاب میں کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے، ہم (ایک رسول) بھیجنے والے تھے، آپ کے پروردگار کی رحمت کے طور پر یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے، آسمانوں اور زمین کا رب اور ان دونوں میں موجود ہر چیز کا رب، اگر تم واقعی یقین رکھنے والے ہو، کوئی (حقیقی) معبود اس کے سوا نہیں ہے، وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، (وہ) تمہارا رب ہے اور تمہارے تمام آباء و اجداد کا بھی رب ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔“ (سورۃ الدخان)

### رمضان روزوں کا مہینہ ہے

ماہ رمضان وہ مخصوص مہینہ ہے جس میں روزے رکھنا فرض کر دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے، لہذا اب سے جو شخص اس (رمضان کے) مہینہ کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے، اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا، (اس لئے یہ طریقہ چھپیں بتایا جاتا ہے) تا کہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار اور اعتراف کرو اور یہ کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔“ (سورۃ البقرہ) نیز اللہ تبارک و تعالیٰ نے روزے فرض کرتے ہوئے درج ذیل حکم نامہ صادر فرمایا۔

اول مرتبہ پڑھنے سے گناہوں کی مغفرت ہوگی،  
دوم مرتبہ پڑھنے سے دوزخ سے آزاد ہوگا،  
تیسری بار پڑھنے سے جنت کا مستحق ہوگا۔

### شب قدر

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا  
سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
نے ارشاد فرمایا۔

”شب قدر کو تلاش کرو رمضان کے آخری  
دس راتوں کی طاق راتوں میں۔“

### شب قدر کی دعا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا  
سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
سے میں نے عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول صلی  
اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے بتائیے کہ اگر مجھے معلوم ہو  
جائے کہ کون سی رات شب قدر ہے تو میں اس  
رات اللہ سے کیا عرض کروں؟ اور کیا دعا  
مانگوں؟“

آپ نے فرمایا کہ یہ عرض کرو۔  
”ترجمہ، اے اللہ! آپ معاف کرنے  
والے ہیں اور کریم ہیں، غصہ کو پسند کرتے ہیں، لہذا  
مجھ سے درگزر کیجئے۔“

### پہلی شب قدر

حضور انور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ  
وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں سے جو  
مرد یا عورت یہ خواہش کرے کہ میری قبر نور کی  
روشنی سے منور ہو تو اسے چاہیے کہ ماہ رمضان کی  
شب قدروں میں کثرت کے ساتھ عبادت الہی  
بجالائے، تاکہ ان مبارک اور معتبر راتوں میں  
عبادت سے اللہ پاک اس کے نامہ اعمال سے

معلوم ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے روزے کو خاص اس  
کے لئے بنایا اور یہ کہ خود ہی اس کا بدلہ ہے، سیدنا  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”روزے دار کا ثواب اللہ تعالیٰ کے علاوہ  
کوئی نہیں جانتا۔“ (طبرانی، معجم)

جناب ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے  
روایت ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ  
وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ نے (حدیث قدسی میں)  
فرمایا، انسان کے تمام کام اس کے لئے ہیں، البتہ  
روزہ میرے لئے ہے، میں خود اس کا بدلہ (ہوں  
یا) جتنا چاہوں گا دوں گا۔“ (بخاری، مسلم،  
نسائی)

### روزہ دار کی دعا مقبول ہے

سرور کائنات، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا  
ارشاد گرامی ہے، تین اشخاص کی دعا رد نہیں ہوتی،  
ایک روزہ دار کی، دعا جب وہ افطار کے وقت دعا  
کرے، دوسرے عدل و انصاف قائم کرنے  
والے حاکم وقت کی دعا اور تیسرے مظلوم کی دعا،  
اللہ پاک ان افراد کی دعاؤں کو بادلوں سے اوپر  
اٹھا لیتا ہے، ان کے لئے آسمان کے دروازے  
کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ فرماتا ہے۔

”میری عزت و جلال کی قسم! اے بندہ!  
میں تیری مدد ضرور کروں گا، اگرچہ کچھ بعد ہی  
سہی۔“ (مسند احمد، ترمذی)

### ماہ رمضان کے خصوصی وظائف

ماہ رمضان کی پہلی شب بعد نماز عشاء ایک  
مرتبہ سورہ فتح پڑھنا بہت افضل ہے۔  
رمضان شریف میں ہر نماز عشاء کے بعد  
روزانہ تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھنے کی فضیلت ہے،



کریں، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما کر انشاء  
اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے گا۔

### تیسری شب قدر

ماہ رمضان کی پچیسویں تاریخ کی شب قدر  
کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، بعد سورہ  
فاتحہ کے سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاص پانچ  
پانچ مرتبہ ہر رکعت میں پڑھیں۔  
بعد سلام کے کلمہ طیبہ ایک سو مرتبہ پڑھیں۔  
باہ گاہ رب العزت سے انشاء اللہ تعالیٰ بے  
شمار عبادت کا ثواب عطا ہوگا۔

پچیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے  
پڑھیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر  
تین تین مرتبہ، سورہ اخلاص تین تین مرتبہ  
پڑھیں، بعد سلام کے ستر مرتبہ استغفار پڑھیں۔  
پچیسویں شب قدر کو دو رکعت نماز پڑھیں،  
ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر تین تین  
مرتبہ، سورہ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھیں، بعد  
سلام کے ستر مرتبہ استغفار پڑھیں۔

پچیسویں شب قدر کو دو رکعت نماز پڑھیں،  
ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک  
ایک مرتبہ، سورہ اخلاص پندرہ پندرہ مرتبہ  
پڑھیں، بعد سلام کے ستر مرتبہ شہادت پڑھیں۔

### چوتھی شب قدر

سیاسیوں شب قدر کو بارہ رکعت نماز تین  
سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے  
بعد سورہ قدر ایک ایک مرتبہ، سورہ اخلاص پندرہ  
پندرہ مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے ستر مرتبہ  
استغفار پڑھیں، انشاء اللہ اس نماز کے پڑھنے  
والے کو اللہ تعالیٰ نبیوں کی عبادت کا ثواب عطا  
فرمائے گا۔

برائیوں کو مٹا کر نیکیوں کا ثواب عطا فرمائے۔  
شب قدر کی عبادت ستر ہزار شب کی  
عبادتوں سے افضل ہے۔

### نفل نماز

اکیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے  
پڑھے، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے، سورہ قدر  
ایک بار، سورہ اخلاص ایک ایک مرتبہ پڑھے بعد  
سلام کے ستر مرتبہ درود پاک پڑھے۔  
انشاء اللہ تعالیٰ اس نفل نماز کے پڑھنے  
والے کے حق میں فرشتے دعائے مغفرت کریں  
گے۔

اکیسویں شب کو دو رکعت نماز پڑھے، ہر  
رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر ایک ایک  
بار، سورہ اخلاص تین تین بار پڑھے، بعد نماز سلام  
پچیس کر ستر مرتبہ استغفار پڑھے۔  
انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز اور شب قدر کی  
برکت سے اللہ پاک اس کی بخشش فرمائے گا۔

### دوسری شب قدر

ماہ مبارک کی تیسویں شب کو چار رکعت نماز  
دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے  
بعد سورہ قدر ایک ایک بار اور سورہ اخلاص تین  
تین مرتبہ پڑھیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ واسطے مغفرت گناہ کے یہ  
نماز بہت افضل ہے۔

تیسویں شب قدر کو آٹھ رکعت نماز چار  
سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ  
کے سورہ قدر ایک ایک مرتبہ، سورہ اخلاص ایک  
ایک بار پڑھیں۔

بعد سلام کے ستر مرتبہ کلمہ تمجید پڑھیں اور  
اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب

ستائیسویں شب کو سورہ ملک سات مرتبہ پڑھنا واسطے مغفرت گناہ بہت فضیلت والی ہے۔

### پانچویں شب قدر

انیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاص تین تین بار پڑھیں، بعد سلام کے سورہ الم نشرح، ستر مرتبہ پڑھی۔ یہ نماز کامل ایمان کے لئے بہت افضل ہے۔

ماہ رمضان کی انیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاص پانچ پانچ مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے درود شریف ایک سو مرتبہ پڑھیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز کے پڑھنے والے کو دربار خداوندی بخشش مغفرت عطا کی جائے گی۔

ماہ رمضان المبارک کی انیسویں شب کو چار مرتبہ سورہ واقعہ پڑھیں، انشاء اللہ تعالیٰ ترقی رزق کے لئے بہت افضل ہے۔

ماہ رمضان کی کسی شب میں بعد نماز عشاء سات مرتبہ سورہ قدر پڑھنی بہت افضل ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے سے ہر مصیبت سے نجات حاصل ہوگی۔

### جمعۃ الوداع

رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو بعد نماز ظہر دو رکعت نماز پڑھیں، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ زلزال، ایک بار، سورہ اخلاص دس بار دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ کافرون تین تین مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے دس بار درود شریف پڑھیں، پھر دو رکعت نماز پڑھیں،

ستائیسویں شب کو دو رکعت نماز پڑھیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر تین تین مرتبہ، سورہ اخلاص ستائیس مرتبہ پڑھ کر گناہوں کی مغفرت طلب کریں، اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف فرمائے گا انشاء اللہ۔

ستائیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ نکاثہ ایک ایک مرتبہ، سورہ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھیں، اس نماز کے پڑھنے والے پر سے اللہ تعالیٰ موت کی سختی آسان کرے گا، انشاء اللہ تعالیٰ اس کو عذاب قبر بھی معاف ہو جائے گا۔

ستائیسویں شب کو دو رکعت نماز پڑھیں، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ اخلاص سات سات مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے ستر مرتبہ استغفار کی تسبیح پڑھیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز کو پڑھنے والے اپنے مصلے سے نہ اٹھیں گے کہ اللہ پاک اس کو اور اس کے والدین کے گناہوں کو معاف کر کے مغفرت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس کے لئے جنت کو آراستہ کر د اور فرمایا کہ وہ جب تک تمام بہشتی نعمتیں اپنی آنکھ سے دیکھ لے گا، اس وقت تک اسے موت نہ آئے گی، واسطے مغفرت یہ دعا بہت افضل ہے۔

ستائیسویں شب کو چار رکعت نماز پڑھیں، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر تین تین مرتبہ سورہ اخلاص پچاس پچاس مرتبہ پڑھیں، بعد سلام سجدہ میں سر رکھ کر ایک مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھیں۔

اس کے بعد جو حاجت دنیاوی و دنیوی طلب کریں، ستائیسویں شب قدر کو ساتوں حم پڑھیں، یہ ساتوں حم عذاب قبر سے نجات اور مغفرت گناہ کے لئے بہت افضل ہے۔

پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ نکاث ایک بار سورہ اخلاص دس بار، دوسری رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے آیت الکرسی تین مرتبہ سورہ اخلاص پچیس مرتبہ، بعد سلام کے درود شریف دس مرتبہ پڑھیں۔

اس نماز کے بے شمار فضائل ہیں اور اس نماز کے پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ قیامت تک بے انتہا عبادت کا ثواب عطا فرمائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

### رمضان کی آخری رات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

”رمضان کو آخری رات میں آپ کی امت کے لئے مغفرت و بخشش کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔  
”وہ شب قدر ہوئی ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”شب قدر تو نہیں ہوئی، لیکن بات یہ ہے کہ عمل کرنے والا جب اپنا

عمل کر دے تو اس کو پوری اجرت مل جاتی ہے۔  
رمضان المبارک

1۔ صبح آنکھ کھلے ہی تین دفعہ درود شریف پڑھیں اور اپنی ہتھیلیوں پر پھونکیں، پھر یہ ہتھیلیاں منہ پر پھیر لیں۔

2۔ روزہ رکھنے کی نیت کے بعد 21 مرتبہ ”الملک“ پڑھیں اور سینے پر پھونکیں۔

3۔ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے 21 مرتبہ ”الغفار“ پڑھیں اور پھر کام شروع کریں۔

4۔ دوپہر کی نماز کے بعد 21 مرتبہ ”اتھار“ پڑھیں اور دل کی دھڑکن کی جگہ پھونکیں۔

5۔ دوپہر کے بعد تھوڑی دیر آرام کی غرض سے سونے لگیں تو 21 مرتبہ ”النجیر“ پڑھیں۔

6۔ نیند سے اٹھنے کے بعد 21 مرتبہ ”الکبیر“ پڑھیں اور پھر دل کی جگہ پھونکیں۔

7۔ اگر کسی وقت جھنجھلاہٹ یا غصہ آئے تو فوراً ”الحفیظ“ پڑھیں، غصہ دور ہو جائے گا۔

8۔ اگر روزہ میں قوت برداشت ختم ہو رہی ہو تو

### وظیفہ برائے شادی

صرف رمضان کی گیارہویں اور بارہویں روزے کی درمیانی رات کے بعد نماز عشاء دو رکعت کر کے بارہ نفل اس طرح پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد بارہ مرتبہ سورہ اخلاص پڑھیں، بارہ نفل پڑھ کر سو مرتبہ درود شریف پڑھیں پھر بارہ نفل اور درود شریف کا ثواب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچائیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ پاک کے حضور گزرا کر خلوص و انکساری عاجزی سے کم از کم پندرہ منٹ تک اپنے لئے یا اپنی بیٹی کے لئے یا اپنی بہن کے لئے اچھے رشتے کی دعا کریں، انشاء اللہ اگلے رمضان المبارک سے پہلے مراد پوری ہوگی۔

21 مرتبہ ”القیٰت“ پڑھیں اور انگلیوں پر بھونک کر انگلیاں سونگھ لیں، بھوک اور پیاس فوراً ختم ہو جائے گی۔

9۔ روزہ کھولنے سے کچھ دیر پہلے دسترخوان پر بیٹھیں اور 21 مرتبہ ”الواسع“ پڑھیں اور یہ سوچیں کہ ساری نعمتیں آپ کے سامنے ہیں، لیکن خدا کے حکم کی وجہ سے آپ نے سب کچھ اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔

10۔ عشاء اور تراویح کے بعد 21 مرتبہ ”القیٰت“ پڑھیں۔

11۔ رات کو سوتے وقت سینے پر ہاتھ رکھ کر 100 مرتبہ ”الباعث“ پڑھیں اور 21 مرتبہ درود شریف پڑھیں اور آرام سے سو جائیں۔

رمضان شریف گزرنے کے بعد عید کے روز آپ اپنے آپ کو نیا انسان محسوس کریں گے، خود اعتمادی آپ کے اندر ظاہر ہوگی، قوت فیصلہ بڑھ جائے گی، آپ اپنے مسائل کے متعلق پورے اطمینان سے سوچ سمجھ کر صحیح فیصلہ کریں گے اور اس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ اسلام میں جو احکامات ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ہزاروں بھلائی رکھی ہے۔

### سحری اور افطاری کی فضیلت

مسلمانوں اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق، سحری کھانا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”سحری کھالیا کرو، اس لئے کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔“ طبی نقطہ نظر سے بھی سحری کھانا صحت کے لئے بہت مفید ہے، چودہ سو سال پہلے جب علم طب اپنے تاریک دور میں تھا، سرکارِ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”روزہ رکھو تو صحت مند رہو گے۔“ میڈیکل سائنس نے آج کل انکشاف اور اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ انسان جسم کے اندرونی نظام کے توازن کو برقرار رکھنے اور اسے تقویت پہنچانے کے لئے انسان کو گاہے بگاہے بھوکا پیاسا رہنا چاہیے، یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ روزے سے معدہ کو تقویت پہنچتی ہے، دل و دماغ کو راحت اور جسم کو آرام ملتا ہے، ضرب ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”ہر گندگی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی چیز بنائی ہے اور جسم کو امراض سے پاک کرنے والی چیز روزہ ہے اور روزہ آدھا صبر ہے۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”لوگ ہمیشہ خیر پر ہی رہیں گے، جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں گے، یعنی غروب آفتاب ہوتے ہی فوراً روزہ کھول لیا کریں گے۔“ (بخاری و مسلم عن سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”جب تم روزہ کھولنے لگو تو کھجوروں سے افطار کرو، کھجور سرا پا برکت ہے، اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لو، کیونکہ وہ ظاہر اور باطن کو پاک کرنے والا ہے۔“ (ترمذی عن سلمان بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

بلاشبہ روزہ انسان کے نفس اور جسم دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں کی اصلاح کرتا ہے۔

☆☆☆☆

مطابق قدرت اللہ شہاب ایک آئس برگ ہیں، برف کا پہاڑ، ایک درجہ پانی کے اوپر دس درجے نیچے، ایک طرف درویش خدا مست ہیں، دوسری طرف شوخ جنگ افسانہ نگار، ایک طرف الحاج، تہجد گزار، اعتکاف نشین، دوسری طرف بقول ایک صاحب کے راہن ہڈ کے ہم زلف۔

1948 میں کشمیر پر حملہ ہوا تو لوکری چھوڑ کر اڑی یا تار اڑا کھل میں جا بیٹھے، لیکن ہم سے پوچھیے تو ان کا مزاج اس سے پہلے سے بلکہ لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا۔

قطہ بنگال کے دنوں میں جب کہ یہ نئے نئے آئی سی ایس ہوئے تھے اور مدناپور میں تملوک کے ایس ڈی او تھے تو انہوں نے اپنی نگرانی میں بیوپاریوں کے گودام لٹوا دیے تھے، جن میں ہزاروں بوریاں لالہ پتال لال اگر وال نے موقع مناسب پر سونے کے مول بیچنے کے لئے ذخیرہ کر رکھی تھیں، ان پر ایک تحقیقاتی کمیٹی بھی بیٹھی تھی، لیکن یہ دیکھ کر لوگ تو ان کو پوجنے لگے ہیں، بیٹھی ہی بیٹھی رہ گئی۔

اور بھاگل پور کا واقعہ تو اس سے بھی عجیب ہے، کوئٹہ ایڈیا تحریک زورور پر تھی، ایک گاؤں میں لوگوں نے سرکاری ڈاک خانہ جلا دیا تھا، اور پر کی سطح پر فیصلہ ہوا، کہ یہ پورا گاؤں جلا دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، چنانچہ کمشنر میکفرسن ڈپٹی کمشنر بریڈو، ڈی آئی جی پولیس کچھ نفری لے کر تیل کے کنستروں سے مسلح شہاب صاحب کی عمل داری میں پہنچ گئے، انہوں نے پوچھا۔

لاہور اور کراچی کے کئی اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ قدرت اللہ شہاب جو اردو کے ایک نامور ادیب ہیں، بھیس بدل کر اور جان بھیلی پر رکھ کر ان علاقوں میں گھس گئے جو ہمارے نزدیک عرب علاقے ہیں اور ہمارے دشمنوں کی اصطلاح میں ”اسرائیلی“ وہاں یہ بیت المقدس میں گھومے پھرے، عربوں کے گھروں میں گئے، ان کے انڈر گراؤنڈ لیڈروں سے ملے، کیونکہ یہ اسح کے مجاہدین کے ساتھ بااں کی مدد و اعانت سے ہی تو گئے تھے اور اسرائیلی چہرہ دستیوں کے ثبوت مع فلم فوٹو وغیرہ لے کر واپس پہنچ گئے اور وہاں یونیسکو کے پلیٹ فارم سے ایسی مصر کے کی تقریر کی کہ اسرائیلی اور حامیان اسرائیل بوکھلا کر رہ گئے، اقوام متحدہ کے اس پلیٹ فارم سے نہ صرف اسرائیل کی مذمت ہوئی، بلکہ یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کو نفیثش کے لئے خود بھاگ کر تل ایبیب جانا پڑا۔

☆☆☆

ہم نے یہ خبر پڑھی اور آنکھیں ملیں، پھر اپنے چٹکی لی، یہ جاننے کے لئے کہ ہم جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں کیونکہ ہم اس قسم کی جرات کے تحمل نہیں ہو سکتے، ہمارا واسطہ زیادہ تر کاغذی شیروں کے ساتھ پڑتا ہے، سچ مچ کا شیر صرف چڑیا گھر میں یا ایم جی ایم کی فلموں میں نائل پر دیکھا ہے۔

دیکھا جائے تو اس میں چٹکی لینے کی چنداں بات بھی نہ تھی، کیونکہ ایک صاحب کے قول کے

”خیریت؟“

جواب ملا۔

”ہم فلاں گاؤں جلانے آئے ہیں۔“

یہ بولے۔

”مجھ سے اجازت لے لی؟“

کمشنر وغیرہ بہت ہنسے اور بولے۔

”تو کون ہے؟“

انہوں نے کہا۔

گئے، ساری پارٹی کو بے نیل و مرام غصے کے شعلے اگلنے لوٹا بڑا۔

چیف سیکریٹری کے ہاں طلبی ہوئی تو یہ استغنے جیب میں رکھ کر لے گئے، انہوں نے کہا برخودار تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، ایک گاؤں جل جاتا تو سارے بہار میں آگ لگ جاتی، لیکن اتنے بڑے بڑے حاکموں کی، حکم عدولی نہیں کیا کرتے، اب جاؤ میں سمجھ لوں گا۔“

تترہ اس کہانی کا یہ ہے کہ راجندر پرشاد جو ان ہی نواحیات کے رہنے والے تھے اور بعد میں بھارت کے صدر ہوئے، یہ ماجرا سن کر ایک جلوس لئے زندہ باد کے نعرہ لگاتے ان کے گھر پر آئے اور اس رشتے سے بعد میں تاحیات ان کو عید پر عید کارڈ بھیجتے رہے۔

☆☆☆

جھنگ اور لائل پور کی ڈپٹی کمشنری کے زمانے میں بھی یہ ہارون الرشیدی کیا کرتے تھے، یعنی بھیس بدل کر شہر اور دیہات میں گھومنا کرتے تھے، وہاں انہوں نے لوگوں کے لئے جو کچھ کیا اس کی بناء پر اب تک یاد کیے جاتے ہیں، لیکن وہاں کے ہیروں اور جاگیرداروں کو یہ ایک آنکھ نہ بھائے اور آکر ان کی ڈپٹی کمشنری چھڑا کر انہیں ہالینڈ بھیج دیا گیا۔

دوسرے پھر جب عالمی جاگیرداروں کو ان کی آزاد طبعی پسند نہ آئی تو ان کو ہالینڈ بھیجا گیا، ایران کے بادشاہ فتح علی شاہ قاجار کے ملک اشترآپر بھی یہی گزری تھی، ایک بار بادشاہ نے کچھ اشعار لکھے جو نہایت پیچ پوچ تھے، ملک اشترآ سے رائے مانگی تو انہوں نے کہا۔

”حضور! یہ کہاں کی شاعری ہے۔“

بادشاہ نے غصے ہو کر اسے طویلے میں بند کر دیا، کچھ دن بعد پھر بادشاہ نے فکر سخن کی اور ملک

”میں اس علاقے کا ایس ڈی او، آپ کتنے بھی بڑے حاکم ہوں یہ علاقہ میری تحویل میں ہے، یہاں کے نظم و نسق کا میں ذمہ دار ہوں، آپ لوگ چلے جائیے۔“ وہ اور زیادہ ہنسے کہ چہ پدی چہ پدی کا شور با۔

ان کے پاس ایک اردلی تھاشیر خان، جہلم کا رہنے والا، اس نے انہوں نے کہا۔ ”دیکھو شیر خان! یہ صاحب لوگ گاؤں کو جلانے آئے ہیں، تم میرا حکم مانو گے؟“ بولا۔

”حضور آپ ہی کا حکم مانوں گا۔“ انہوں نے فرمایا۔ ”اچھا تو ان صاحب لوگوں میں سے جو بھی اس دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے اس کو گولی مار دے۔“

وہ اور بھی بگڑے دل تھا، بولا۔ ”جناب! اگر حکم ہو تو، یہ لوگ اگر نہ بھی نکلیں تب بھی گولی مار دوں؟“ انہوں نے کہا۔ ”نہ نہ ایسا مت کرنا۔“

یہ بات ان افسران عالی مقام کو سنا کر کبھی گئی تھی، ڈی آئی جی صاحب نے انھیں کی کوشش کی، لیکن شیر خان کی بندوق کی نال دیکھ کر سہم

اشعراء کو بلایا تاکہ آکر داد دیں، انہوں نے شعر سنے اور اٹھ گئے۔

شاہ نے پوچھا۔  
”کہاں چلے؟“

بولے۔

”پھر طویلے جاتا ہوں۔“

☆☆☆

لاہور کے ایک اخبار نے کمال کیا، ان کے عرب مقبوضہ علاقوں میں جانے کی خبر دی اور سات ہی ٹانکا لگایا کہ یہ کس ملک کا جعلی پاسپورٹ بنا کر گئے تھے؟ وہ کوئی پاکستان کا دشمن ملک ہی ہو سکتا ہے، ان کی تحقیق ہوئی چاہیے، تب ہمیں معلوم ہوا کہ افریح کے مجاہدین جب چھاپہ مارنے جاتے ہیں تو باقاعدہ پاسپورٹ اور ویزا کے ساتھ جاتے ہیں، سرحد پر اسرائیلی افسروں کو بتاتے ہیں کہ ہم آپ کے علاقے میں بم پھینکنے جا رہے ہیں، وہ کہتے ہیں، اچھی بات ہے اور مہر لگا کر اجازت دے دیتے ہیں، بلکہ آدی بھی ساتھ کر دیتے ہیں، تاکہ کوئی ان کو منع نہ کرے۔

دوسری بات بھی ایسی ہی جوڑ دی کہ ایک صاحب جو شہاب کے دوست ہیں، پچھلے دنوں کراچی سے لندن آتے ہوئے ماسکو اترے تھے اور ایک محفل میں پاکستان بھارت کی کنفیڈریشن کے بارے میں خیال آرائی کرتے سنے گئے، لیجئے ”رائی“ یہ تھی کہ کوئی صاحب جو شہاب کے ایک ہزار ایک دوستوں میں سے ہوں گے، پی آئی اے کی اس فلاسٹ سے آئے جو ماسکو کے راستے جاتی ہے، اتر کر ماسکو کی سیر بھی کی ہوگی، اگرچہ کوچن سے ان کے ملنے کا امکان کم ہے، بہر حال پر بت یہ بنا کر ضرور قدرت اللہ شہاب لندن میں بیٹھے پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن بنا رہے ہوں، خبر سے خبر یوں ہی نکلتی ہے بلکہ نکالی جانی

ہے۔

وہ بزرگ بڑے دور اندیش تھے، جن کی چھاتی پر سے چوہا گزر گیا تو رونے لگے، لوگوں نے کہا۔

”میاں اس میں کیا بات گھبرانے اور رونے کی ہے۔“  
بولے۔

”میں چوہے کو نہیں روتا، چوہے کے پیچھے بلی دوڑی آئے گی، بلی کے پیچھے کتا آئے گا، کتے کے پیچھے پولیس کا پیادہ آئے گا اور پھر پوری فوج پریڈ کرتی میری چھاتی پر سے گزر گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔“

شہاب صاحب سمجھے ہوں گے کہ انہوں نے اسرائیل پر چھاپہ مار کر بڑا کام کیا، یہاں ایک معمولی اخبار والے نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے شنگوی ماری اور چاروں شانے چت کر دیا، واہ بھی واہ اخبار والو!

☆☆☆

### ہماری مطبوعات

ماں می قصہ اللہ شہاب

یا خدا

طیف نضر ڈاکٹر سید عبداللہ

طیف نزل

طیف اقبال

انتخاب کلام میر مرزی عبدالحق

قواعد اردو

لاہور اکیڈمی - لاہور





اُم مریم

اٹھارویں قسط کا خلاصہ

سلیمان خان روشنی کو پروپوز کرتے ہیں مگر ساتھ ہی کچھ شرائط بھی رکھ دیتے ہیں، روشنی ہر شرط بخوشی ماننے پہ آمادہ ہے، یہ بات سلیمان کے لیے اطمینان کا باعث بنتی ہے۔  
قد رکارزلٹ سلیمان کی توقع کے مطابق نہیں ان کی تنبیہ اودا پسند کے گفت کا وعدہ قدر کو مزید محنت پہ آمادہ کر چکا ہے۔  
علی شیر قدر کو پھر اسے حق میں، ہوا کر لیتا ہے، علی شیر وہ واحد شخص ہے جو سلیمان کی روشنی سے ہونے والی ملاقات کا گواہ ہے اور انہیں ملک میل کرنے کا ارادہ باندھے ہوئے ہے۔  
عمر اور حجاب کی سر راہ ہونے والی ملاقات میں سب کلامی حجاب کو عمر سے بدگمان کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

انیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





”میری طرف سے آپ کو پوری اجازت ہے، جو مرضی کر لیں، بس یہ یاد رکھیں میں نے ہارنا نہیں سیکھا، یہ بھی مت بھولنا والدہ کہ آپ لوگوں کی ایسی حرکتیں خود میرے دل سے رشتوں کا لحاظ ختم کر رہی گی۔“ اب کے وہ بولا تو لہجہ متعادل تھا، نہ وہ غرایا نہ غصہ کیا، آپاس کے کمرے سے نکلی تو صرف تھکی ہوئی نہ تھیں، پر مردہ اور طول بھی تھیں، انہیں اس وقت سے خوف آ رہا تھا جب اس گستاخ لڑکے کی وجہ سے انہیں اپنے جان سے پیارے بھائی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا۔

☆☆☆

اطراف میں سرسبز و شاداب کھیت تھے، جن کی قطار در قطار کناروں پر بند گوبھی کے پھول ہرے ہو رہے تھے اور ان کی باس فضا میں ہر سو پھیلی محسوس ہوتی تھی، ان ہی کھیتوں میں کسان گوڈی کر رہے تھے اور گوبر سے بھری کھاد کی ریڑیاں الٹ رہے تھے، تازہ ہنری اور کھاد کی جوتی جلی غم باس ہوتی ہے وہ شہر کے بایسوں کو ناگوار لگتی ہے، جیسے ایلوں کا دھواں یا پگھلی لسی کی مہک ناگوار لگتی ہے، وہ بھی جب یہاں آیا تو جلدی مانوس نہیں ہو سکا تھا مگر اب کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا، یہ سارے منظر روز نگاہوں کا حصہ بنتے۔

کالج آتے جاتے اس نے موڑ کاٹا اب کھیت پیچھے رہ گئے تھے، ایک نیم پختہ راستہ چار دیواری تک جاتا تھا، جہاں گیلے آلو پے اور آلو بخارے کے پودوں کی ابھی پتوں اور پھولوں سے نا آشنا ٹہنیاں خمی دکھائی دیتی تھیں، ان درختوں کو لگائے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، شاید وہاں انکوروں کی تیل بھی تھی اور بالکل آخر میں قطع کے دائیں جانب کونے میں ایک مسجد تھی، وہ اسی مسجد میں نماز ادا کر کے آیا تھا، ابھی صبح ہی وہ ایسی پگھنڈی پر جا رہا تھا کہ اس راستے پر ایک بانکا متکبر اصل مرغ جس کے پروں کے گرد جھالرس تھیں اکڑا ہوا رقص کرتا آیا اور اسے دیکھ کر یکدم کھیت میں اتر گیا، بھاگ گیا، عمر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی، اسے وہ لڑکی یاد آئی جس کی رنگت سورج کی اولین کرنوں کی طرح اچلی تھی، جو راستہ روک کر اپنے تئیں اسے زچ کیا کرتی تھی، مگر اس کے میدان میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر ایسی بھاگی کہ اب سامنا ہو جانے پہ بھی انجان بن جایا کرتی۔

اسے گاؤں کا ماحول بہت پسند آیا تھا، جہی تو اپنی رہائش کے لئے اس نے اس حصے کا انتخاب کیا تھا، اسے یاد تھا جب چند دن کے لئے وہ خالہ کے گھر گیا تھا، تو سب سے زیادہ اس کی حجاب کے دادا جان سے گاڑھی چھیننے لگی تھی، وہ بھی اسے بہت اہمیت اور محبت سے نوازتے دو اہم رشتوں کا یکجہت بچے سے کھوجانا انہیں اس کے لئے بہت حساس کر گیا تھا، شام کو فرصت کے اوقات میں جب وہ نہما دھوک لٹھے کا کھڑکھڑاتا ہنہند اور آدھے بازوؤں کی بنیان زیب تن کر کے چارپائی پر بیٹھ جاتے جس پہ غائب خالہ پہلے ہی کوئی کھیس یاد چادر بچھا گئی ہوتی تھیں تو وہ اسے اٹھوا دیتے کہ انہیں بان کی چارپائی پر لیٹنا بھانا تھا۔

گرمیوں میں بان کی بنت میں سے ہوا کا چلن ان کے گرمی سے ستائے ہوئے بدن کو ٹھنڈک دیتا، تب سمیل ان کا بھاری بھر کم حقہ ٹھہٹھا ہوا غسل خانے میں لے جاتا اور اسے تازہ کرنے لگتا۔ خوب خوب نہلاتا، پانی بدلتا اور پھر دادا جی خود آ جاتے، وہ ان کے ساتھ ساتھ ہوتا، دادا جان

نالی سے منہ لگا کر گڑ گڑاتے ہوئے فالتو پانی خارج کر دیتے یہ بھی ایک فن تھا کہ کتنا پانی نکالنے سے کش لگاتے ہوئے زیادہ زور بھی نہ لگے اور اتنی تیزی سے بھی نہ سانس کھینچا جائے کہ تمباکو جل جائے، نال سے منہ لگا کر پانی کا تناسب درست کرنے کی سہیل کو اجازت نہ تھی، چلم وہ خود تیار کرتے، یہ تو واقعی ایک فن تھا وہ اس تیاری میں کسی اور کی مداخلت برداشت نہ کرتے، چاہے عزیز ترین حقہ شناس دوست ہی کیوں نہ ہو۔

چلم کے گلے میں کس قسم کا دیسی گڑ ڈالنا ہے اور اس پر کھبل تمباکو کو کونسی تھیلیوں پر کتنا مسل کر اس پر بچھانا ہے اور انگوٹھے سے کتنا دبانا ہے اور آخر میں انہی سبھی میں سلگتی چھال سے چلم کو کتنا اور کس انداز میں بھرتا ہے کہ نہ تو وہ اتنی ٹھوس دھری جائے کہ ہوا کا گزر مشکل ہو جائے اور نہ اتنی چھدری کہ ایک ہی کش سے اس کی چنگاریاں یکدم سلگنے لگیں اور بھسم ہو جائیں، اسے یہ سارا پر اس بہت انٹرٹیننگ لگتا تھا، دادا اس سارے خوشگوار من پسند مرحلے سے خوشی و طمانیت بھرے انداز میں گزر کر اپنی بان کی چار پائی پر دراز اس تازہ سلگتے ہوئے حقے کی نال منہ میں دبا کر ایک کش لیتے اور افلاک کی سیر کو مکمل جاتے، ایسے میں اگر کوئی گھریلو معاملہ درپیش ہوتا تو ان کی بے ساختہ سادہ لوح زبان کے جوہر بھی عمر کو لطف سے ہمکنار کرتے، تب بھی اس دن دادا ایسے ہی حقہ تازہ کروا کے چار پائی پر دراز ایک کش لے کر افلاک کی سیر سے واپس لوٹے تو اس سے بات چیت کرنے لگے۔

”ہاں ولی منڈیا..... تو پڑھد ایں؟“  
”جی.....!“

اس دن حد سے بڑھ کر گرمی تھی، گرمی سے زیادہ جس تھا، وہ بازو کھجاتے ہوئے کچھ بے زاری سے بولا۔

”کنویں ہے؟“

اسے سمجھ نہ آئی کیا سوال ہوا، اس کی جگہ خالہ نے انہی کی زبان میں جواب دیا تھا اور اس کی بے چینی محسوس کرتے فریج سے پانی کی بوتل لا کر اس کے آگے رکھی۔

”ابھی تم یہ پیو، پھر میں فالے کا شربت بنا کر لاتی ہوں۔“ انہوں نے محبت سے کہا تھا، عمر نے پانی کو بوتل اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور بوتل واپس رکھ دی، بوتل بالکل نچ تھی، اس کی انگلیوں میں اس کی خشکی بہت دیر تک سنسناتی رہی، کھلاحن جس کے ایک کونے میں دھریک کا درخت تھا، اس سے اتنے پتے گرتے کہ سینے والے کے لئے دبا ل جان ہو جاتے، دن میں کئی بار جھاڑ دینے کے باوجود ہر جانب زرد پتے سرکتے رہتے، دوسرے کونے میں چھت پر جانے کو سڑھیاں تھیں، جس کے نیچے سلگتے اپلوں پہ دھری چانی میں دھیرے دھیرے گرم ہوتے دودھ کی سطح پر خزاں زدہ پتوں جیسے تانبے رنگ کی بالائی کی تہہ اتنی تھنی ہوئی کہ انگلی چھو کر اس میں چھید کرنا مشکل ہو جاتا، اسی صحن میں جباب اور حرم بھی تھیں، جباب گھنٹوں کے بل رہتی تھی پھر کھڑے ہونے کی کوشش میں کبھی گر جاتی اور کبھی کچھ دیر قائم رہتی اور کھٹکھاریاں مارتی۔

”خالہ جانی گاؤں بہت اچھی جگہ ہوتی ہے، میں بھی گاؤں میں شادی کروں گا، گاؤں میں رہوں گا۔“

اس نے اپنی خواہش جس وقت ظاہر کی بد قسمتی سے اسی وقت اس شخص نے گھر میں قدم رکھا اور یہ بات پوری جزئیات کے ساتھ سنی اور زہر سے بھر گیا، زیادہ غصہ اسی بات پہ آیا تھا کہ غانیہ نے جوان ہوتے لڑکے سے بھی وہ فضول بات کہہ دی ہے جو اس سے کہی گئی تھی، حجاب کے لئے عمر کی نسبت کی خواہش، یہی وجہ تھی کہ اس کا رویہ اتنا شدید ہو گیا تھا۔

اس نے گہرا سانس بھرا اور ماضی کی یادوں سے نکل آیا، آج اسے خالہ کی یادداشت سے آ رہی تھی، اس نے گاڑی کی رفتار تھوڑی تیز کی، سائے ڈھل رہے تھے، سودہ سلف لے کر واپس آتے شام ڈوب جاتی، دائیں جانب سڑک سے ذرا ہٹ کر تین چار منزلہ سرکاری عمارت تھی وہ شہر کے مشہور ٹیپو میں پہنچا تو چار بج چکے تھے، مہینے بھر کا راشن بیک کرواتے مزید ٹائم لگ گیا، ملازم سے سامان کے بڑے بڑے شاپر ز گاڑی کی ڈکی میں رکھواتے اسے کسی کی پریش نگاہوں کا احساس جاگا تو بے اختیار نظر اٹھائی، مصروف شاہراہ کے دوسری جانب وہ کسی خاتون کے ساتھ کھڑی نظر آئی تو عمر ایک لمحے کو اس حسین اتفاق یہ حیرت میں مبتلا ہوتا کچھ جلدی میں گاڑی میں بیٹھتا اسی سمت آ گیا تھا، گوکہ ارادہ محض اسے زنج کرنے کا تھا جبھی بریک اس کے پاس لے جا کر لگائی اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

”السلام علیکم!“ وہ خود پیش رفت کر گیا تھا حجاب نے تو اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر ہی خاتون کا ہاتھ پکڑ کر چلنا شروع کر دیا تھا، حالانکہ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتاتا تھا وہ لوگ کسی کی منتظر ہیں۔

”وعلیکم السلام!“ جواب اس کی بجائے اس خاتون نے دیا، جو چادر میں لبوس تھیں، بڑانٹیس سا سوٹ پہن رکھا تھا، عمر پہلی بار متوجہ ہوا وہ تو دیکھ ہی بغور رہی تھیں، نظرس ایسی تھیں گویا پہچان نہیں پائیں، سوالیہ انداز میں بینی کو بھی دیکھا، جس کے چہرے پہ سختی کے رنگ گہرے تھے۔

”خالہ جانی، کیسی ہیں آپ، اف خدایا کتنا بدل گئی ہیں۔“ عمر نے ہی پہچان کا مرحلہ طے کیا تھا، غانیہ کے اعصاب کو جھٹکا لگا، وہ ٹھٹک کر ٹھم گئیں تب ان کی نگاہ نہایت گورے چنے پہلی نظر میں پسند آ جانے والے نو جوان چہرے پہ پڑی۔

”کون..... عمر.....؟“ وہ ششدری اسے دیکھ رہی تھیں، گویا یقین نہ آتا ہو۔

”جی خالہ جانی! قسم سے آج دل سے یاد کر رہا تھا آپ کو، کیسی ہیں آپ؟“ وہ وہیں ان سے لپٹ گیا، غانیہ کی تو حالت ہی غیر ہونے لگی تھی، بے اختیار رو پڑیں۔

”جھوٹا۔“ حجاب منہ ہی منہ میں بد بدائی، عمر نے صاف سنا مگر توجہ نہیں دی۔

”اتنے ناراض تھے عمر، کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا، کبھی یاد نہیں کیا، خالہ اتنی بری بھی نہیں تھی بیٹے۔“ عمر نے ان کی حالت کے پیش نظر انہیں سنہال کر گاڑی میں سہارا دے کر بٹھایا۔

”میں آپ سے خفا نہیں ہو سکتا کبھی خالہ جانی، اگر ہوتا تو خود ملتا ایسے آپ سے اور اس سے ذرا پوچھیں، کیا میں نے آپ کو سلام نہ بھیجا تھا۔“ اس نے تاچہرا لئے کھڑی حجاب کو معاملے میں کھیٹا، انداز شرارتی تھا، جیسی وہ بھڑک اٹھی۔

”مما کس کی باتوں میں آ رہی ہیں، ایک نمبر فراڈ ہے یہ شخص، میں نے پہچان کر خود اپنا

تعارف کروایا مگر یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ وہی عمر ہیں یعنی ہمارے کزن، اتنی نفرت کرتے ہیں یہ ہم سے کہ کیا بتاؤں۔“ وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی، عمر نے بہت دلچسپ نظروں سے اس کا تپا تپا سرخ چہرہ دیکھا اور مسکرایا۔

”جی جی..... اتنا غصہ۔“ اس نے اسے اور چڑایا اور پھر سے غانیہ کی سمت متوجہ ہو گیا۔  
 ”خالہ جانی میں اس کے کالج میں ٹیچر ہوں، یہ بات دیکھیں کیسے کر رہی ہے مجھ سے، استاد سے ایسا رویہ رکھتے ہیں، مجھے تو اس کے بات کرنے کے انداز پہ ہی اعتراض ہے، آپ سے تو بالکل الگ ہے، اپنے ابا پہ گئی ہوگی ہے نا؟“

”شٹ اپ چپا کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ غصیلے جذبات پر قابو پائے بغیر تلخ آواز میں بولی، عمر نے غانیہ کو یوں دیکھا گویا کہہ رہا ہو، دیکھ لیں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا، خود غانیہ بھی حجاب کے طرز عمل پہ کم حیران نہ تھی۔

”حجاب..... بری بات ہے بیٹے..... بھائی بہت بڑے ہیں آپ سے۔“ انہوں نے سرزنش کی۔

”ہرگز نہیں، یہ میرے بھائی نہیں ہیں۔“ وہ فی الفور بدکر انکاری ہوئی، غانیہ شرمندہ نظر آئیں، عمر کو مسکراہٹ ضبط کرنا محال ہو گیا۔

”آپ ان کی گاڑی سے تو باہر نکلیں، بھائی ہمیں لینے آئیں گے تو کہاں نظر آئیں گے ہم انہیں۔“ اس کا موڈ ہنوز سوائیزے پر تھا، عمر زور سے چونکا۔  
 ”کون لینے آ رہا ہے آپ کو خالہ جانی، جہان؟“

”ہاں بیٹے، بچپن سے ملانے لاتا ہے کبھی کبھار بچہ! اسے کچھ کام تھا بس آتا ہوگا، میں نے سوچا ادھر سے کچھ ضرورت کی چیزیں لے لوں تو خوش بختی سے آپ مل گئے، اب آیا کرنا مجھ سے ملنے، بلکہ اپنا نوں نمبر تو ضرور ہی مجھے دے دو، خود رابطہ کر لیا کروں گی اپنے بیٹے سے، پہلے ہی اپنی غفلت یہ بہن سے بہت شرمندہ ہوں، روز محشر نظریں کیسے ملا پاؤں گی اس سے کہ اس کے جگر گوشے کی حفاظت بھی نہ کر سکی۔“ وہ پھر رونے لگیں، عمر کا دل دکھ سے بھر گیا، اس نے پھر انہیں ساتھ لگا لیا تھا۔

”آپ میرے گھر چلیں خالہ، یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں، پلزز انکار نہیں کیجئے گا۔“  
 ”اس نوازش کے لئے شکریہ، مگر ہم نہیں آ سکتے۔“ غانیہ سے پہلے وہ بولی تھی، وہ بھی بڑا ناک چڑھا کر غرور سے، عمر کو بے حد برا لگا۔

”میں تم سے نہیں اپنی خالہ سے بات کر رہا ہوں سمجھیں؟“ وہ ڈانٹنے بغیر نہ رہ سکا۔  
 ”وہ میری ماں ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”وہ میری بھی کچھ لگتی ہیں۔“ عمر نے جواباً اسی کے انداز میں جتلیا، اس کے انداز میں کہیں بھی دوستانہ پن نہیں تھا، نہ رعایت نہ کوئی حوصلہ دینے والا انداز، غانیہ حیرت سے دونوں کو یوں الجھتے دیکھ رہی تھیں۔

”تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“



”جی..... میں اس کالج میں لیکچرار ہوں خالہ جانی جہاں یہ پڑھتی ہے۔“ جواب بھی عمر نے دیا، غانیہ کی حیرت دو چند ہو گئی۔

”بیٹے آپ نے مجھے بھی بتایا تک نہیں۔“ شکوہ زبان پہ آ گیا، عمر نے اسے طنز یہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ مجھ سے لڑے یہ تھوڑا ہے۔“

”حمدان ابھی تک نہیں آیا، فون ملاؤ بیٹے بھائی کو بچے ہمیں ڈھونڈنا پریشان نہ ہو رہا ہو۔“ غانیہ کا دھیان بٹ گیا تھا، انہیں حمدان کی فکر ہو رہی تھی اب۔

”مجھے بتائیں نمبر خالہ جانی، میں بات کرتا ہوں۔“

”مجھے کہاں نمبر یاد رہتے ہیں بیٹے، حجاب کے فون میں ہو گا۔“ انہوں نے کھڑی دیکھتے ہوئے کہا، عمر نے اسے سر د نظروں سے دیکھا۔

”نمبر بتائیں گی محترمہ.....؟“ حجاب نے اسے گھورتے ہوئے نمبر دہرایا، عمر نے خود رابطہ کیا اپنا تعارف کروا کے صورتحال بتائی تھی، پھر مطمئن ہو کر غانیہ کی سمت متوجہ ہوا۔

”خالہ جانی بارمن کے دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اسے ادھر جانا پڑے ہے تو آنے میں درمی ہو جائے گی، ممکن ہے صبح ہی آ پائے، وہ یہی بتانے کو کال کرنے لگا تھا آپ کو، میں نے بتا دیا آپ لوگوں کو ساتھ لے جا رہا ہوں، یہ پس خود بات کریں۔“ اس نے فون ان کے حوالے کیا اور خود اس کی طرف متوجہ ہو گیا، جو ابھی تک ضدی انداز لئے باہر کھڑی تھی۔

”سن لیا تم نے؟ تمہارا بھائی نہیں آ سکے گا اس لئے میرے ساتھ ہی چلو۔“ وہ زچ کرنے والے انداز میں جتا رہا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ پھنکاری۔

”اور میں اس دن والا رہ استعمال کروں گا، پھر نہ کہنا میری ماما کے سامنے بھی شرم نہیں کی۔“ عمر نے فون پہ مصروف غانیہ پہ نگاہ ڈالتے اسے اور چڑایا اور دھمکایا، حجاب کا رنگ بالکل اڑ گیا۔

ہر ایرے غیرے سے ملتا تھوڑی ہے  
میرا دلبر ایسا دیا تھوڑی ہے  
میں تو اس کو بیشک اپنا کہہ سکتا ہوں  
اس نے اب تک ایسا مانا تھوڑی ہے

بظاہر سرگرمیٹ سلگا تا وہ زیر لب گفتگو کیا تھا، پھر دھواں اڑاتے اس کے بالکل فق ہوتے چہرے کو دیکھا اور حنظل لیتا بیٹنے لگا۔

”تشریف رکھیے۔“ پچھلا دروازہ کھولتے وہ بہت موزب انداز میں جھکا، حجاب ہونٹ بھیجنے کھڑی تھی، غانیہ کو ہی مداخلت کرنا پڑی۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے، میں چند لمحوں اپنے بیچ کے ساتھ سکون سے گزار لوں۔“ ان کا لہجہ تھکا ہوا ضرور تھا مگر چہرے پر ان کی خوشی تھی، حجاب کچھ بول نہیں پائی، چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”دیکھ لو، میں پھر بیت لیا اور اب میں ہی بیٹا کروں گا انشاء اللہ۔“ دروازہ بند کرنے کے



بہانے وہ کھڑکی پہ جھک کر اسے ہی سنارہا تھا، حجاب نے گھبرا کر غانیہ کو دیکھا مگر ان کے انداز سے صاف لگتا تھا وہ یہ بات سن نہیں پائی ہیں، اسے قدرے اطمینان ہوا، عمر نے اندر بیٹھ کر گاڑی اشارت کر دی، پھر سارے راستے وہ غانیہ سے ہی بات چیت میں مصروف رہا تھا، ہاں البتہ گاہے لگا ہے اس پہ بیک ویو مر سے نگاہ ضرور ڈال لیتا، راستے سے اس نے ہونٹ کے آگے گاڑی روک کر بہترین کھانا پیک کر دیا تھا۔

”اکیلے رہتے ہو گے بیٹے؟“ غانیہ کی پیاسی نظریں اس کے چہرے سے نہیں ہٹتی تھیں۔  
 ”اور کیا خالہ جانی، اکیلے لڑکے کو کون اپنی بیٹی دیتا ہے، اس سے تو نوجوان اور حسین لڑکیاں بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتیں کہیں کوئی الزام ہی نہ لگ جائے۔“ حجاب پہ نگاہ جما کر کہتا وہ اسے زہر سے بھی برا لگا۔

”میں خود کروں گی اپنے بیٹے کی شادی، خوب صورت ہو پڑھے لکھے ہو، ایک چھوڑ ہزار لڑکیاں مل جائیں گی آسانی سے۔“ غانیہ نے پیار بھری تسلی دی، وہ باقاعدہ مسکرانے لگا۔  
 ”شکریہ خالہ جانی، ایک لڑکی مجھے پسند کرتی ہے، اس سے ملوادوں گا آپ کو، اگر پسند آجائے آپ کو تو شادی کر دیتے مجھے مانتیں تو کوئی اور سہی۔“  
 ”واقعی.....؟“ غانیہ کو عجیب سی حیرت ہوئی۔

”جی خالہ.....!“ اس نے انکساری کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔  
 ”کون ہے..... کیسی ہے؟“ ان کا انداز ایک دم سے بجھ گیا، جسے عمر نے اپنے دھیان میں محسوس نہ کیا، اس کی تو ساری توجہ حجاب یہ بھی جس کا چہرہ ایسے کھڑکی کی طرف تھا کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی اس کے تاثرات نوٹ نہ کر سکا۔

”آپ کو ملوادوں گا خالہ جانی، ایسے کیا بتاؤں۔“ غانیہ چپ کر گئیں، مگر میں ان کا استقبال بی جان نے کیا تھا، وہ بے حد خوش ہو میں تھیں غانیہ اور حجاب سے ٹکر۔

”ارے عمر مجھے فون کر دیتے، میں خود کھانا لیکانی اپنے ہاتھ سے اپنی بیٹیوں کے لئے۔“ عمر نے انہیں پیک کر لیا ہوا کھانا تھا دیا، تو وہ اسے ڈانٹنے لگیں۔

”اتنی جلدی آپ اہتمام کیسے کر سکتی تھیں بی جان، خالہ جانی تو اب یہاں آتی رہیں گی آپ یہ شوق پھر پورا کر لینا،“ وہ مسکرایا تھا، پھر غانیہ کی سمت متوجہ ہوا۔  
 ”خالہ جانی! کھر کیا لگا آپ کو؟“

”تمہاری بیوی آجائے گی تب یہ مکان گھر بنے گا بیٹے! اللہ تمہیں سچی اور دائمی خوشیاں نصیب فرمائے آمین۔“

کھانا چاروں نے اکٹھے کھایا، پھر عمر خود جائے بنا کر لایا تھا، ساتھ بی جان کے ہاتھ کا بنا سگر بیلا تھا، حجاب فون پہ حمد ان سے بات کر رہی تھی، یہ جان کر اس کا موڈ بگڑ گیا تھا کہ حمد ان آج نہیں آ سکتا اور انہیں کل واپس جانا ہوگا۔

”بھائی کبھی آج ہی باہر کرنا تھا۔“ وہ کلس کر کہہ رہی تھی، عمر نے دھیان سے اسے دیکھا۔  
 ”اگر حمد ان آ بھی جاتا تب بھی میں آج تم لوگوں کو واپس نہ جانے دیتا، لہذا اپنا موڈ درست

رکھو۔“ وہ ٹوکے بغیر نہ رہا۔

”مما مجھے نیند آ رہی ہے سونا ہے مجھے۔“ وہ پیرنچ کر بولی۔

”ہاں تو جاؤ، کس نے روکا، خالہ جانی تو ابھی میرے ساتھ ڈھیروں باتیں کریں گی، ہے نا خالہ جانی۔“ وہ ان کے ساتھ لپٹ کر لاڈ اٹھوانے لگا، حجاب پیر پختی باہر نکل گئی تھی، لی جان نے ہی اسے کمر دکھایا، خود اس کے پاس بیٹھ گئیں، وہ کب سوئی گرم لحاف میں پتا ہی نہ چلا، صبح غائبہ سو رہی تھیں جب اس کی آنکھ کھل گئی، پہلے نماز ادا کی پھر یونہی باہر نکل آئی، گھر روشن کھلا اور قدیم طرز پر بنا ہوا تھا، باغیچے کے پاس کھڑے ہو تو باہر دور تک کا منظر نظر آتا تھا مگر ابھی یونہیں پھٹی تھی، سفید سحر بہت آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے روشن ہو رہا تھا، بلند عمارت جو شاید سرکاری تھی سورج کے سامنے جاٹ تھی، صرف اس کی زرد اور نیم روشن علاتیں تاریکی کی چادر میں سنہری دھاروں کی صورت بہتی تھیں، ایک سیاہ رنگ کی اوڑھنی میں دکتی لکیش کے ٹانگوں کی صورت اسے ہونے کی خبر دیتی تھیں، وہ مبہوت ہوئی قدرت کے نظارے میں مگن تھی، جب اپنے پیچھے کسی کی آہٹ پا کر پلٹی اور عمر کو موجود پا کر بد مزاسی ہو گئی۔

”السلام علیکم! ہیو اے ٹاس ڈے۔“ وہ صلح جو انداز میں مسکرا رہا تھا، سفید ٹوپی سر پہ تھی، ہلکی شیو کا نیلا غبار چہرے پہ، وہ اتنا معصوم لگ رہا تھا مگر حجاب کو نہیں۔

”گھر کیسا لگا نہیں؟“ وہ کتر اکر نکل رہی تھی جب عمر نے پھر ٹوکا اور باقاعدہ راستہ روک لیا، حجاب کو اس کے یہ انداز برے لگتے تھے، پتا نہیں وہ اتنا سرکش کیوں تھا۔

”جیسا گھر والا ہے، فضول۔“ وہ پھٹکار کر بولی، عمر مسکرانے لگا۔

”سنو، تم مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتیں تو کیا سمجھتی ہو، بتا دو مجھے بھی رشتے کے تعین میں سہولت ہو۔“ وہ گویا اس کی کل کی بات سے حظ لے رہا تھا۔

”بھائی بہت پیارا رشتہ ہے، میں تو تم سے دشمنی بھی نہ کروں۔“ وہ جتلا کر بولی، عمر نے گہرا سانس بھرا۔

”دشمنی نہ کرو، شادی ہی کر لو پھر۔“

”سٹ اپ۔“ حجاب شرم سے سرخ پڑ گئی، وہ کتنا منہ پھٹ تھا۔

”تم شروع سے ہی بدتمیز ہو، حرم ابھی لڑکی ہے، تم نہیں۔“

”تو اسی سے شادی کر لو۔“ وہ غصے میں آؤٹ ہو گئی، اب کے عمر کچھ نہیں بولا، سینے پہ ہاتھ

باندھے اسے اندر جاتے خود سے دور ہوتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

”آپ کو صاحب بلاتا ہے بیٹا! دوپٹہ ڈھنگ سے لے کر جاؤ، ڈرائیونگ روم میں اور بھی مہمان ہیں۔“

وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی، مگر کوئی چینل پسند نہیں آتا تھا، کبھی کوئی لگاتی کبھی کوئی، تب ہی آیا ماں دسک دیتی ہوئی اندر آ گئیں، اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور ٹی وی کا ریموٹ تھوڑی کے نیچے نکا کر انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”کون سا مہمان آگیا وہ بھی پپا کا جس سے مجھے ملوانا ضروری ہے؟“ اس کی الجھن بے جا نہ تھی، مون ایسے اسے خواہ مخواہ کبھی کسی کے سامنے نہ لاتے تھے۔

”مجھے نہیں پتا بیٹا! صاحب خود بتا دیں گے آپ چلو تو۔“ انہوں نے ادھر ادھر نظر مار کر خود اس کا دوپٹہ اٹھایا، بہت پیارے سے رنگوں کے استراج سے مزین براؤڈ ڈکدر کے سوٹ میں بال پونی میں سیٹے وہ بڑی بی بی بچی لگ رہی تھی، انہیں لکلی ہوئی اگر ٹراؤز شرٹ وغیرہ پہنی ہوئی تو پہلے بدلنے پہ آمادہ کرنا پڑتا، بہر حال جو اک مرحلہ ہوتا، قدر کو خرچے کرنے کی عادت تھی جبکہ وہ پرانے دور کی سادہ لوح عورت تھیں، جنہوں نے کم از کم قدر سے ملنے سے پہلے تک خردوں کا منہ بھی نہ دیکھا تھا، وہ کچھ نہ بولی، ریوٹ پھینک کر بستر سے اتر آئی، جوتا پہن رہی تھی جب آیا ماں نے اس کے اوپر دوپٹہ ڈالا۔

”اچھی طرح لو۔“ انہوں نے پھر تاکید کی۔

”اچھی طرح ہی رہی ہوں۔“ وہ اسی بار بار کی تاکید پہ ہی چڑی تھی اور دوپٹہ سنبھالتی ان سے پہلے کمرے سے نکل آئی۔

”یہ پپا کے سارے کام ختم ہو گئے ہیں جو وہ آج کل زیادہ تر گھر پہ ہی پائے جاتے ہیں۔“ اس نے آیا ماں کو دیکھتے ہوئے شرارت کی، انہوں نے گھورا تھا، دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں، سلام آیا ماں نے کیا، وہ خاموش کھڑی تھی۔

”آپ نے بلایا پپا.....؟“ تب اس کی نگاہ سامنے صوفے پہ براجمان اس نہایت گورے چٹے پہلی نظر میں ہی پسند آ جانے والے شخص پہ پڑی جو بہت متانت سے ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا، انہیں رو بردو پا کر استرا تا اٹھ کھڑا ہوا مگر اٹشتے ہی ایک چیتے کی طرح چوکننا اور ہوشیار نظر آنے لگا۔

”بیٹھو بیٹے آپ، حمدان آپ بھی تشریف رکھیے۔“ مون کا لہجہ نرم تھا، حمدان نے سرخم کیا اور واپس اسی پوزیشن میں بیٹھ گیا، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے ترجمے زادے سے اس کے پپا بہت مقناقیسی شخصیت کے مالک تھے، ان کی شخصیت میں کوئی جادو سا تھا جیسے کہ کسی کے بھی سامنے ہوں تو کچھ سوچتا نہیں، اس نے لوگوں کا یہی تاثر دیکھا تھا ان کے مقابل، لیکن یہ نوجوان بہت براعتا نظر آتا تھا، اس کی بے بس کر دینے والی گہری نظریں وقفہ وقفہ سے قدر کے چہرے کے گرد خوشبودار حصار کھینچنے لگی تھیں۔

”بیٹے آپ سے ذکر کیا تھا، حمدان آپ کو اسٹڈی میں، ہیلپ کریں گے آئی ہو پ کہ نیکسٹ ٹائم آپ میرا مطلوبہ رزلٹ لاپائس کی انشاء اللہ یہ بہت جینکس ہیں۔“ پپا اس کا تعارف کردار ہے تھے، اس کی تیوری چڑھ گئی، اسے ایک دم بے تحاشا غصہ آ گیا۔

(پپا بھی حد کرتے ہیں کبھی کبھی، ایک بے نکے بندے کے سامنے اپنی ہی بیٹی کو ڈی گریڈ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی)۔

آیا ماں چائے لے آئیں، کہ یکا یک فون کی بیل ہونے لگی آیا ماں کو پھر باہر جانا پڑا فون سننے چائے بنانے کا کام از خود اس پہ آ گیا۔

”جینی.....؟“ مون کو چائے گاگ دے کر وہ اس کی سمت متوجہ ہوئی، بلکہ متوجہ کیا ہوئی،

صرف مخاطب کیا، دیکھیے بغیر نخوت بھرے انداز میں، انداز صاف جلتا تھا اگر باپ کا لحاظ نہ ہوتا تو کبھی زحمت نہ کرتی چائے بنانے کی، کہ سامنے موجود شخص کی نظروں کا بار بار اٹھنا خون میں ابال ڈالنے کا باعث تھا، حمدان چونکا اور سنبھلا۔

”ایک چیچ۔“

وہ آج بھی تپتا شعلہ تھی، آگ کا شعلہ، نارنجی رنگ کا، دل جانتا تھا کہ چھونے سے ہاتھ جل جائے گا مگر پھر بھی چھونے کو دل چاہتا تھا۔

”بیٹا صاحب آپ کے لئے فون ہے، آپ کی آپا جان ہیں۔“ آیا ماں پھر آگئیں، مون زور سے چونکے، چہرے پر عجیب سا نظارہ لہرایا، کپ ہاتھ میں لئے غلٹ میں اٹھ کر کمرے سے نکل گئے، آیا ماں پہلے ہی مڑ چکی تھیں، قدر نے سکون کا آزادی کا سانس لیا اور کپ زور سے اس کے سامنے میز پر پٹخا۔

”اٹھاؤ، پیو اور پھر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ وہ غضب ناک ہو کر دھیسے لہجے میں آواز دبا کر غرائی، حمدان کا رنگ یکدم بالکل سرخ ہو گیا، وہ اس کے مزاج سے کچھ کچھ آشنا تھا، مگر اس حد تک بے لحاظی برتنے کی اندازہ بالکل نہ تھا، جیسی اس کے اوسان بالکل خطا ہو گئے۔

”تمہیں ذرا سی بھی عقل اگر ہے تو سمجھ لو مجھے تمہاری ہیپ کی ضرورت نہیں۔“ وہ دانت بھینچ کر بولی، بار بار ایسے دروازے کی طرف دیکھتی تھی جیسے باپ کی آمد سے خائف ہو، حمدان سمجھا مگر اس کا سمجھ کا وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

”آپ بہت بد تمیز ہیں، سر کی بیٹی نہ ہوتیں تو اس گستاخی کا جواب بھی ضرور دیتا، بہر حال، سن لیں میں آپ کے نہیں سر کے حکم کا پابند ہوں۔“ حمدان نے بہت محل کا مظاہرہ کیا تھا اس کے باوجود اسی کا آفسرانہ رعب و دبدبہ عود کر آیا تھا لہجے میں، وہ طنز یہ تحارت آمیز انداز میں مسکرائی، یوں گویا اس پر اس کی اوقات واضح کرنا مقصود ہو۔

”تو تم نہیں مانو گے؟“ سوال عجیب تھا، سوال کرنے والی کا انداز عجیب تر، وہ اس بار غصے میں نہیں لگی تھی، حمدان کو اس کا لہجہ پر اسرار محسوس ہوا، حمدان نے کپ واپس میز پر اس کی جانب سر کیا، جسے ابھی تلک اس نے چھوا بھی نہیں تھا، وہ بہت خود دار تھا، عزت سے پیش آنے والوں کے لئے سب کچھ لٹا سکتا تھا، محبت کی خاطر جان قربان کر سکتا تھا، مگر جہاں عزت نفس محفوظ نہ تھی، وہاں کچھ نہیں تھا، وہاں محبت بھی نہ کوئی خالص جذبہ اہمیت رکھتا تھا۔

”یہ بات آپ سمجھیں محترمہ، آپ کے سمجھنے کی ہی ہے سوچیں مجھے اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہیں؟ مجھ سے کچھ کیوں چاہا رہی ہیں کہ میں کیوں کروں، آپ اگر مجھ سے پڑھنا نہیں چاہتی ہیں تو کچھ بھی کریں، اور مجھ سے نجات حاصل کر لیں، جو بھی آپ کو کرنا ہو گا مکمل تک کر لینا ہو گا، ورنہ محل چار بجے سے سرنے مجھے آڈرڈ کر لیا ہے اور میں ان کی بات رو نہیں کر سکتا، چلتا ہوں۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اس کے تاثرات دیکھنے کو کبھی نہیں رکا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکل کر چلا گیا، قدر جو دانت بھینچے سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات مکمل ہونے اور پھر اپنی بھڑاس نکالنے کی منتظر تھی، آگ مگولہ ہوئی اسے گالیاں دیتی رہ گئی، اس پر بھی طیش ختم نہیں ہوا تو اس کے لئے خود تیار کیا

چائے گانگ (چاہے وہ کتنی ہی مجبوری میں کیا تھا، مگر کیا تو تھا، باعث تو ہیں، یہی چیز تھی، آگ لگانے کا باعث تھی یہی چیز تھی، جسے وہ چھوئے بنا اٹھ کر چلا گیا تھا)، اس نے اٹھا کر دیوار سے دے مارا، اپنی وقتی شکست کا احساس اس کی آنکھوں کی جلم بڑھا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کے تین بجتے کو تھے، ستارہ سحری آب و تاب سے چمک رہا تھا، کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، صرف کھڑکی کے شیشے سے آتی چاند کی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، کروٹیں بدلتے پہلو دکھنے لگے تو اٹھ کر کھڑکی میں آن کھڑے ہوئے، درتے کا پٹ واکیا تو سبزے کی کیلی مہک رات کے آخری پہر کی نم ہوا کوٹ بستہ بنائے ان کے چہرے کو ٹھنڈا کرنے لگی، آسمان صاف تھا اور ستاروں سے سجا جگمگ کر رہا تھا، وہ سارے رات نہیں سوئے تھے، آپا کی باتیں ان کے ذہن سے نہیں نکل رہی تھیں۔

”انہوں نے ایسا کیوں کہا؟“ سوال تھا کہ زہر میں بجھاتیر، جو بار بار حلقوم جاں میں پیوست ہوتا تھا۔

”قدر ابھی بچی ہے، اس عمر میں بچیاں نادان بھی ہوتی ہیں اور بہت جذباتی بھی، اپنی سیاست وغیرہ یہ لعنت سمجھو مون اور زیادہ ناظم بچی کو دو، ویسے بھی جوان ہو گئی ہے، آج نہ کل اس نے میرے گھر کی ہو جانا ہے تو پھر وہ پہلے سی بات نہیں رہتی، میری بات سمجھ رہے ہو؟“ انہوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے سوال کیا، مون متحیر تھے، جھٹ بھکا رہا بھر سکے۔

”تم جتنا اس پر توجہ دو گے مون وہ اسی قدر تم پر اعتماد کرے گی، اس کا اعتماد جتنا بڑھے گا کسی دوسرے کو اتنا ہی اس پر حادی ہوئے گا، اولاد خاص کر بیٹی کا معاملہ بہت نازک ہوا کرتا ہے مون، میں نہیں چاہتی خدا نخواستہ تمہیں اس طرف سے معمولی سا بھی دکھ پہنچے۔“ اور مون پہلی بار چونکے تھے، ٹھٹک گئے، انہیں آپا کی آواز میں پہلی بار تشویش اور محبت کے ساتھ ساتھ مئی کا بھی احساس ہوا تھا، اس بار وہ بھکا رہا نہیں بھر سکے۔

”آپا.....!“ وہ بولے تو ان کے لہجے میں عجیب سا خوف پنہاں تھا۔

”بولو میرے چاند۔“ وہ جیسے داری صدقے ہوئیں، ان کی محبت ان کے معاملے میں معمولی سا بھی ہیر پھیر نہیں کرتی تھی۔

”مجھ سے کچھ مت چھپائیں، اگر کوئی بات ہے، تو کھل کر کہہ دینے میں ہی بھلائی ہے، خاص طور پر قدر کی، آپ سمجھ رہی ہیں؟“ وہ بولے تو ان کا لہجہ از خود مخصوص پٹھانی دبدبہ اور سختی سمیٹ لایا تھا، جتنی تو آپا لرز گئی تھیں، ٹھرا گئیں۔

”کچھ غلط مت سوچو مون..... اللہ کا واسطہ ہے، قدر کے متعلق تو بالکل نہیں، وہ تو بہتے پانی کی مانند صاف شفاف اور پاک ہے، کیسے یقین دلاؤں۔“ انہوں نے روٹھائی ہوئی کہا، دل رو دیا، کیسی عجب مشکل کا شکار ہو گئی تھیں، زندگی میں اتنا کھن مرحلہ تو کبھی نہ دیکھا تھا، جس سے اب دو چار ہوئیں، ایک طرف اولاد بھی، دوسری جانب وہ بھائی جسے اولاد سے بھی زیادہ پیارا رکھا، قدر اس کے جگر کا ٹکڑا تھی، وہ ہرگز برداشت نہ کر پاتیں مون یا پھر قدر کو معمولی سا بھی علی شیر گزند پہنچائے،

مگر بے بسی کا عالم یہ تھا کہ اولاد کی خامی اس کی غلطی بھی کہنے والی نہ تھی، بلکہ یہ خامی اور غلطی نہیں تھی، وہ تو مجرم ہونے جا رہا تھا، وہ اسے مجرم ہونے سے کیسے روکتیں۔

”میری ایک بات مانو گے مون؟ پلیز انکار نہ کرنا۔“ اس بار بھائی کو چپ پا کے انہوں نے خود اس مشکل کے درمیان بچاؤ کا راستہ نکالنا چاہا، گو کہ امید کم تھی مگر کوشش میں کیا حرج تھا۔

”کیا بات.....؟“ مون کی قدرے توقف سے بے حد سنجیدہ آواز سننے کو مل سکی، انہوں نے گہرا سانس بھرا، یوں گویا کہ کسی کٹھنائی کو عبور کرنے سے قبل حوصلہ مجتمع کیا جائے۔

”گو کہ تم پہلے بھی مجھے انکار کر چکے مگر مون اس بار سوچ کر جواب دیتا کہ اگر میں یہ بات پھر کر رہی ہوں تو اس کے پیچھے گہری مصلحت بھی ہو سکتی ہے اور کسی بڑے نقصان سے بچنے کی بہترین حکمت عملی بھی۔“

”کیا مطلب.....؟“ مون مزید الجھ گئے۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“ ان کا دماغ جھننے لگا تھا جیسے، ذہن اس وقت بالکل خالی تھا اور نہ کچھ سوچنے کے قابل ہی، وہ بس ان کی اگلی بات کے ہی منتظر تھے۔

”اسے میری گزارش سمجھ لو، رند نہ کرو، علی شیر کو ایکشن لڑنے کے لئے ٹکٹ دے دو مون۔“ وہ جیسے جیتی ہوئیں اور مون کا جانے کب کار کا ہوا سانس بحال ہوا۔

”آپ کو علی شیر فورس کر رہا ہے آپ؟“ محض ایک لمحہ لگا تھا انہیں اصل بات تک پہنچنے میں، آپا بری طرح گزر بڑائیں۔

”بجہ ہے، بس ضد کر رہا ہے۔“ انہوں نے بات کو ہلکا پھلکا بنا کر پیش کرنا چاہا، مون نے بے اختیار نفی کی۔

”مجھے سیاست میں آنے اٹھارہ سال ہو گئے، ابھی تک کامیابی کے اس گراف تک نہیں پہنچ سکا ہوں آپا جو میرا ہدف تھا، جو میری محنت اور محنت سے بھی زیادہ میری دیانت داری اور اخلاص کا متقاضی تھا، پتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ پاکستان ہے، جہاں حکمرانوں نے تعلیم کو اس لئے مہنگا کر دیا کہ عام آدمی کی سوچ کو نکھار اور روشنی نہ مل سکے، گرچہ اتنی عام ہو گئی ہے کہ ایک معمولی سے معمولی کام بھی بغیر بھاری رشوت یا بڑی سفارش کے ممکن نہیں رہا، سیاست میں ہر اس غلط چیز کو اپنا لیا گیا جو ناجائز اور حرام بھی، میں ان سب چیزوں سے بچ کر چلا ہوں، دامن صاف رکھا، میرا منشور ہی یہی تھا ہے اور انشاء اللہ رہے گا، آپ نے جب پہلی بار مجھ سے علی شیر کے لئے یہ بات کی میں نے انکار کر دیا، وجہ صرف اپنا اصول بتایا، یہ اصول اتنا کڑا نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر کرنا پڑا، پتا ہے کیوں؟ کیونکہ مخالف ساری پارٹیوں میں یہی خرابی اپنی جڑیں پھیلا چکی ہے، میں حقدار کو حق دینے کا قائل ہوں، ممکن ہے علی شیر اس کا اہل ثابت ہو جائے مگر بات پھر وہیں آگئی کہ اس چیز سے مخالفوں کو مجھ پر انگلی اٹھانے کا موقع ملے گا، علی شیر تو کیا اگر قدر بھی مجھ سے اس چیز کی خواہش کرتی تو میں اسے بھی انکار کر دیتا، آپ بچے کو سمجھائیں جو منصب جو اہمیت میں نے اسے دی وہ سب سے خاص اور معتبر ہے، اگر وہ اس اہمیت کو پوری طرح پک کرے گا تو اسے کسی اور شے کی حاجت نہیں رہے گی۔“

جواب تسلی بخش تھا مگر تسلی کیسے ہو سکتی تھی، وہ بے بس تھیں، بے بس اب بھی رہیں۔  
 ”یہ سب باتیں میں اسے سمجھا چکی مگر.....“  
 ”مگر کیا.....؟“ وہ متحیر ہوئے، سوال کر لیا۔

”نہیں ماننا، ایک ہی رٹ ہے۔“ انہوں نے سرد آہ بھری، گویا معاملے کی سنگینی کا کچھ کچھ ادراک بھائی کو سونپنا چاہا۔

”تو اسے صاف انکار کر دیں، بتا دیں ایسا قیامت تک ممکن نہیں۔“ مون اب کے جھلائے۔  
 ”سمجھایا، سب کچھ کر لیا، وہ نہیں سمجھ رہا، الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔“ اب کے وہ روہا نسی ہو گئیں، مون بھونچکے رہ گئے۔

”کیسی الٹی سیدھی باتیں؟ آپا کیا بہتر یہ نہ ہوتا کہ آپ پہلے ہی یہ بات مجھے بتائیں؟ بتائیں مجھے وہ کیا دھمکی دے رہا ہے آپ کو؟“ اب کے وہ بری طرح خفا ہوتے ناراضی سے سوال کر رہے تھے، آپا کے آنسو بہہ نکلے، مرد عورت کی مجبوریوں کو بے بسیوں کو کبھی نہیں سمجھتا، یہ بات ایک بار پھر ان پر پوری سفاکی سے دہاں ہوئی۔

”چپ کیوں ہیں آپا؟“ اب کے وہ لہجے پہ بھی کنٹرول نہ کر سکے، ایک طرح سے انہیں ڈانٹا، ان کا دکھ کم ہوتا، گلے سے آنسوؤں کا گولہ پیچھے اترتا تو کچھ بولنے کے قابل بھی ہوتیں، ان کی یہ خاموشی ہی مون کے غصے کو پیش کو بڑھا رہی تھی۔

”آپ کی اس وقت کی یہ خاشی بہت نقصان کا باعث بن سکتی ہے آپا، میں علی شیر سے خود بات کر لیتا ہوں۔“ انہوں نے جیسے ان سے بات ختم کی، آپا آنسو پونچھیں بوکھلائیں، وہ جتنا بے لحاظ ہو رہا تھا، بہتر تھا، دونوں کا آتما سا منانہ ہوتا، مون تو ماہر تھا ڈور کاٹنے میں، علی شیر تو ساتھ میں اعتماد کا فون کرنے پہ بھی تھلا ہوا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں، میں اسے خود سمجھا دوں گی۔“ انہوں نے بے ساختہ منت کی، مون اب کے کچھ نہیں بولے، رابطہ کاٹ دیا پھر انہوں نے ہر اس ممکن حد تک سوچا تھا جس تک علی شیر جاسکتا تھا اور وہ ممکن حد ہر حد ان کی ذات کی عزت کی ہی دجھیاں اڑاتی تھی، سگریٹ پھونکتے رات گزری، یہاں تک کہ پہلے تہجد اور پھر فجر کی اذانیں بھی ہونے لگیں، اس کے بعد کچھ دیر بعد آس پاس سے گھر کی کئی کھڑکیاں روشن ہونے لگیں، بڑے ذوق شوق سے موزن کی پکار یہ لبیک کہتے نمازی مسجد کی طرف جانے لگے، کھلی کھڑکی سے لوگوں کے قدموں کی چاپ کھنکارنے کی آوازیں گلا صاف کرنے اور کسی شناسا کو دیکھ کر سلام کرنے کی آوازیں اب ان کی پریشان خیالی میں روزن بنا رہی تھیں، ان کی تھکی ریتھکی کی مظہر آنکھیں نیم خوابیدہ سائعتیں مزید تھکنے لگیں، انہی تھکے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ خود بھی وضو کے ارادے سے واش روم کا رخ کر چکے تھے۔

☆☆☆

غم و دکھ کے یہ اشارے تم نہ سمجھو گے  
 جودن ہم نے تمہارے بن گزارے تم نہ سمجھو گے  
 تمہیں کیسے بتائیں تم ہمارے واسطے کیا ہو



سمندر کی کہانی میں کنارے تم نہ سمجھو گے  
بس اتنا جان لو کہ اک شخص سے ہم نے محبت کی  
ہمارے ٹوٹنے کا کھیل پیارے تم نہ سمجھو گے  
ہزاروں مشکوں سے کھیل کر بھی جیتنے والے  
یہ آخر کس جگہ پہ آگے ہارے تم نہ سمجھو گے

سردگر بے حد خوشگوار ہوا چل رہی تھی، جس کی وجہ سے نہر کے ارد گرد کھڑے چھوٹے چھوٹے  
پودے جھوم جھوم کر لہرا رہے تھے اور جواو نچے نچے قد آور درخت تھے، ہوا کی وجہ سے ان کے  
پتے ایک دوسرے سے مل کر تالیاں بجاتے محسوس ہو رہے تھے ہوا شاخوں سے گزرتی تو شاں شاں  
کی آوازیں پیدا ہونے لگتیں، آسمان کہیں سے نیلا کہیں سے سرمئی کہیں سے سیلی رنگ کا ہو رہا تھا،  
ایسے جیسے ابھی بارش برسنے لگے گی، ان کی گاڑی اب گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکی تھی اور جیسے  
جیسے گھر سے نزدیک ہو رہی تھی اس کا دل ڈوب رہا تھا، انہوں سے ملنے کی خوشی پہ اک شخص کی  
نظروں کا تسلط کا خوف حاوی تھا، اس نے گہرا سانس بھر کے ہر خیال جھٹکنا چاہا اس نے کھڑکی سے  
باہر نگاہ کی، نہر کا پانی بہت مدھم سروں میں بہت سبک خرامی سے بہہ رہا تھا نہر کے کناروں سے  
آگے دور تک پھیلا سبزہ جیسے بارش میں نہایا ہوا تھا، کھلا کھلا سبز رنگ آنکھوں کو سکون دے رہا تھا،  
نہر کے کنارے ننھے ننھے پودے دراصل پھولوں کے تھے یہ غور کرنے پہ اس پہ کھل سکا تھا، سرخ  
پیلے اور جانی گلاب کے پھول۔

اس کے برابر ڈرائیو گیک سیٹ پہ بیٹھا حمدان بھی آج بہت چپ تھا، بہت خاموش خاموش سا پتا  
نہیں کیوں، نہر گزرتی باقاعدہ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا گہرا تپوں میں ڈوبا دل ابھر کر  
خوف بھرے انداز میں دھک دھک کرنے لگا، وہ دل سے دعا کر رہی تھی، عباس سے اس بار سامنا  
نہ ہو، مگر آزمائش ختم نہیں ہوئی، دعا ابھی ہونٹوں کی قید سے آزاد نہ ہوئی تھی کہ وہ نظر آ گیا۔

سیاہ کرتا شلوار میں گریبان کھولے منہ میں جلتا سگریٹ دبائے نیم باز نظروں سے اسے ہی  
دیکھتا ہوا، نظریں نہیں کہ تلواریں وہ سخت سخت ہونے لگتی، سہم گئی، بے ساختہ حمدان کو دیکھا، جس  
کے ہونٹ باہم تھپتھپتے ہوئے تھے۔

وہ آئیں ہمارے پینڈ خدا کی قدرت ہے  
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے پینڈ کو دیکھتے ہیں

وہ تہتہ لگا رہا تھا، حمدان کا رنگ اسی لحاظ سے سرخ ہوا اور خوف سے حرم کی گھمکھی بندھ گئی،  
حلق خشک ہو کر ترنخا۔

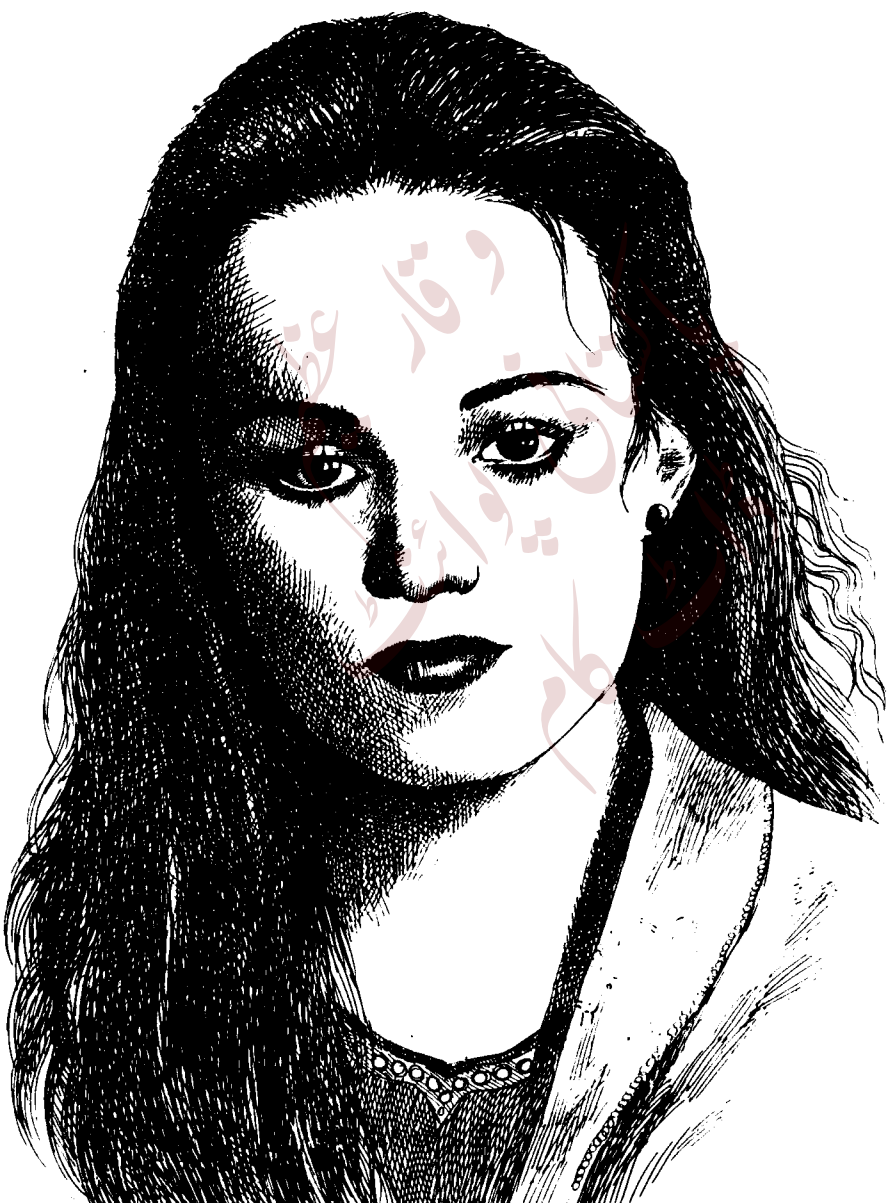
بہاروں پھول برساؤ

ہمارا محبوب آیا ہے

حرم کو لگا اس کا مقصد ہی حمدان کو طیش دلانا ہے اور وہ اپنی کوشش میں کچھ اتنا ناکام بھی نہیں  
رہا، گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو بے اختیار حرم کی چیخ نکل گئی تھی۔

(جاری ہے)

تجلی اول  
تحسین اختر



وہ طنز سے بولی تھی۔

”ہمارے تو دل پر بھی جو چڑھ جائے، وہ مشکل ہی سے اترتا ہے، باقی رہی خوبیوں کی بات تو ذرا فرصت سے اور محبت کی نگاہ سے دیکھیں گی تو ایک نہیں کئی خوبیاں نظر آئیں گی۔“ ساتھ ہی اس نے پھول نگر کے برآمدے میں کھیلنے دوڑتے بچوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا وہ بھی اس کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتے تھے، ماہ بقانے یہ منظر بھی ناگواری سے دیکھا تھا۔

”میری یہاں بہت عزت ہے کیوں میری عزت خراب کرنے پر تل گئے ہو۔“ وہ ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے بچوں کو دیکھ کر بولی تھی۔

”محبت کسی کی عزت خراب نہیں کرتی بلکہ یہ تو عزت بڑھاتی ہے۔“ وہ بولا تھا اور ماہ بقا طنز یہ مسکرائی تھی۔

”بہت خوب، اپنے مزاج جیسی کسی تھرڈ کلاس کتاب یا ناول کا فقرہ سنایا ہے یا کسی گھٹیا ترین مودی کا ڈائلاگ بولا ہے بہر حال یہ طے ہے کہ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے ان خیالات پر، آئندہ اگر یہاں آنے کی زحمت کی تو اچھا نہ ہوگا۔“ وہ اس شخص سے باتوں میں کبھی نہ جیت سکی تھی اس لئے مزید اس کی پرشوق اور پریش نگاہوں کا مرکز بنے رہنے کی بجائے اس نے اپنی چیز واپس موڑی تھی۔

”جاری ہیں؟“ پیچھے سے آواز آئی تھی اور اس نے اپنی رفتار تیز کر لی تھی۔

”خدا حافظ۔“ وہ پھر بولا تھا۔

”ڈھیٹ ابن ڈھیٹ۔“ ماہ بقا نے برآمدے میں پہنچ کر یونہی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا، امید تو یہی تھی کہ وہ جاچکا ہو گا مگر وہ ویسے ہی سینے پر ہاتھ باندھے اسے دیکھتے ہوئے کھڑا تھا، وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر آگئی تھی۔

”کیوں آتے ہو روز یہاں؟“ اس نے پھول نگر کے پیچھے کمرے کی کھڑکی کھول رکھی تھی اور سیبوں کی مہک سے لدی ہوا اس کو مدہوش سا کر رہی تھی، جب اس نے اس کو چڑھائی چڑھتے اور پھر سیبوں کے باغ میں کھڑے دیکھا تھا، اس شخص نے تو معمول ہی بنالیا تھا، وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر غصے سے کھول کھلی تھی اور پھر اپنی چیز کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر آگئی تھی، اب اس کا رخ پیچھے باغ کی طرف تھا، سیبوں کی خوشبو سے لدا ہوا اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس شخص کے پاس لے گئی تھی۔

”یونہی گھومنے پھرنے۔“ اس نے اپنی پر شوق نگاہیں اس چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں والی گڑیا پر نکالی تھیں۔

”جگہ گھومنے پھرنے کے لئے عام نہیں ہے، تم اچھی طرح جانتے ہو یہ پھول نگر کے احاطے کا باغ ہے۔“ وہ تنہا کرتے ہوئے بولی تھی۔

”ہمیں تو اس پر چلنے میں مزہ آتا ہے جو شاہراہ عام نہیں ہوتی۔“ اس نے اچک کر تازہ سیب شاخ پر سے توڑا تھا اور دانتوں سے پکھر پکھر کرنے لگا تھا، ماہ بقا کو اس کی یہ حرکت بدگیزی کے سوا اور کچھ نہ لگی تھی۔

”میرا خیال ہے تم ایسے نہیں مانو گے میں خان بابا (چوکیدار) کو بلائی ہوں، وہی تمہیں سبق سیکھائیں گے۔“

”جو محبت کا سبق سیکھ جائے پھر کوئی اور اس کو کیا سکھائے گا، آپ ناحق تکلیف ہی کریں گی۔“ اس نے اسے تپایا تھا۔

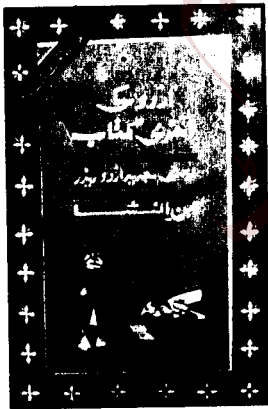
”میرا خیال ہے آپ کی زبان پر جو لفظ چڑھ جائے وہ مشکل ہی سے اترتا ہے۔“ اس کے علاوہ تو اور کوئی خوبی آپ میں نظر نہیں آتی۔“

شگفتہ شگفتہ رواں دواں



اردو کی آخری کتاب

طنز و مزاح



لاہور اکیڈمی

پہلی منزل محلہ امین میڈین مارکیٹ 207 سرگرم روڈ اردو بازار لاہور  
فون: 042-37310797, 042-37321690

☆☆☆

بشر کے روپ میں دلربا طلسم بنے  
شوق میں دھوپ ملائیں اس کا جسم بنے  
وہ معجزات کی حد تک پہنچ گیا قاتل  
حرف کوئی بھی لکھوں اس کا اسم بنے  
وہ بولا تھا اور ماہ بکا کارواں رواں کان بن  
گیا تھا، وہ منہ موڑ کر مسکرائی تھی مگر وہ غفران ہی  
کیا جو اس کی ہر ادھر نثار نہ ہو جائے۔

”تمہاری محبت تو مجھے کچھ بھی کرنے نہیں  
دیتی، گھر میں دل نہیں لگتا، رباب کہتی ہے، اپنا  
بوریا بستر اٹھاؤ اور ماموں کے گھر ہی چلی جاؤ۔“  
”ہاں تو صحیح کہتی ہے وہ شرارتی ملی، ایک نہ  
ایک دن تو تمہیں اس گھر میں آنا ہی ہے نا۔“ وہ  
رباب کی بات کا مزہ لیتے ہوئے بولا تھا اور ماہ بکا  
شرم سے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

”کیا ہوا میں نے کچھ غلط کہا۔“ وہ اس کی  
چھوٹی کھینچتے ہوئے اسے چھیڑنے لگا تھا۔

اس کی امی جان ننھی بچیوں کی طرح اس  
کے گھنے اور موٹے بالوں کی دو چوٹیاں گوندھتی  
تھیں اس کے بال ہی اتنے بھاری تھے کہ ایک  
ہاتھ میں آتے ہی نہ تھے، رباب اسے اکثر کہا  
کرتی تھی، غفران نامی جن تمہارے گھنے اور لمبے  
بالوں پر ہی عاشق ہوا ہے، مگر وہ جانتی تھی وہ  
غفران کو بالوں سمیت ساری کی ساری پسند تھی  
اسے بھی اپنے ماموں کا یہ ہونہار اور پڑھا لکھا بیٹا  
بہت پسند تھا، چونکہ گھروں اور دلوں میں کوئی  
فاصلہ نہ تھا اس لئے ان کی محبت، اپنائیت اور  
چاہت کے پیڑے تلے خورد و بولی کی طرح خوب ہی  
پھل پھول رہی تھی۔

☆☆☆

”یہ کیا ہے؟ اب تو سارا دن ہی مصروف  
رہتے ہو، آفس کا کام بھی گھر اٹھا لاتے ہو۔“

منا (41) جون 2017

گئیں، رہی محبت تو وہ غفران کے گھر میں لگے ہار  
سنگھار کے درخت تلے کھڑی کرلائی رہی، ہار  
سنگھار کا وہ درخت جوان کی محبت کے ہر پل کا  
امین تھا اب خائن بنا کھڑا تھا، ماموں کے گھر کے  
پھیرے جو ماہ بقا کسی طواف کی مانند لگاتی تھی، وہ  
بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے، شرارتی بی  
خاموش تھی کہ اب محبت اور چاہت دونوں طرف  
خاموشی تھی۔

☆☆☆

”تم حدیقہ سے شادی کر رہے ہو؟“ اس  
ایک سوال میں اتنی آہیں تھیں کہ ہار سنگھار کا پیڑ  
سوکھنے لگا تھا۔

”میری مجبوری ہے۔“ کیسی سرد اور قاتل  
ہوا چلی تھی سارے جذبے سوکھے بتوں کی مانند اڑ  
گئے تھے۔

”کیسی مجبوری؟“ شکر ہے محبت نہ کہا تھا۔

”باس کی نوازشیں اور عنایتیں، میں اب  
عادی ہو گیا ہوں، ان کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔“  
”سچ کہو تو تم حدیقہ کی تربتوں کے عادی ہو  
گئے ہو۔“ یہ جملہ اس نے ایسے بولا تھا جیسے اپنی  
محبت کی قبر پر دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر مٹی ڈالی  
ہو اور اس دن اس نے واقعی ہار سنگھار کے ویران  
اور اجڑے پیڑ تلے اپنی محبت دفن دی تھی، وہ اپنی  
محبت کی خالی ڈولی لئے گھر لوٹ آئی تھی ہمیشہ  
ہمیشہ کے لئے۔

☆☆☆

غفران بھائی بدلنے والے لگتے تو نہ تھے مگر  
بہت سے عام مردوں کی طرح وہ بھی دولت پر  
ریجھ گئے، کیا یہ دولت بڑے بڑوں کا تپا پانچہ کر  
دیا کرتی ہے کیا یہ ہاتھ کا میل اس طرح کسی کے  
نصیب دھو جاتا ہے کہ پھر اس کے نصیب کی سختی  
پر کچھ بھی لکھا نہیں جاتا۔

ابھی ابھی وہ ممانی جان کو سوتا دیکھ کر ان کے  
ڈھیروں ڈھیر برتن جو دو پہر کے کھانے کے بعد  
یونہی بڑے تھے دھو کر چکن سے نکلی تھی اور غفران کو  
کاغذ قلم سے سرکھپاتا دیکھ کر اس کے پاس آگئی  
تھی۔

”ہوں، آفس کا کام نہیں ہے۔“ وہ کاغذ پر  
جھکے جھکے بولا تھا۔

”تو پھر کیا ہے، گرمیوں کی لمبی دوپہریں  
آرام کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔“ اس نے جھک  
کر غفران کے ہاتھ سے قلم کھینچ لیا تھا۔

”ادھو، قلم دو نا، تنگ مت کرو۔“ وہ  
جھجھلاتے ہوئے بولا تھا۔

”کیا لکھ رہے ہو۔“ وہ قلم مٹھی میں دبا کر  
شرارتی انداز میں پوچھنے لگی تھی۔

”یار باس کی بیٹی ایم ایس سی کر رہی ہے،  
تالائق سی ہے، انہوں نے مجھے کہا ہے کہ میں ان  
کی بیٹی کو نوٹس بنا دوں تاکہ اس سال وہ اچھے  
نمبروں سے پاس ہو جائے۔“ غفران نے اس کی  
مٹھی میں دھلم نکال لیا تھا اور ایک بار پھر جھک  
کر کچھ لکھنے لگا تھا، ماہ بقا کچھ دیر تو اس کے پاس  
بیٹھی رہی تھی پھر بور ہو کر اپنے گھر آگئی تھی۔

☆☆☆

اب اٹھ کر تیرے پاس سے جائیں تو کس کے پاس  
ہر لمحہ اپنے سامنے یہ ہی سوال تھا  
رسوائیوں کی دھوپ میں تپتے تھے شام تک  
سایہ اگر کہیں تھا تو تیرا خیال تھا  
پھر یوں ہوا کہ نوٹس بنانے میں غفران نے  
سخت محنت کی اور باس کی بیٹی پاس ہو گئی، مگر اس  
امتحان میں جس میں ماہ بقا کا کوئی ذکر نہ تھا وہ فیل  
ہو گئی، ماہ بقا کا حسن، اس کی گھٹنے اور لمبے بالوں  
میں گوندھی مٹھی دو چوٹیاں نکلیں نقش سنہری تراشیدہ  
زلفیں باس کی بے پناہ عنایتوں تلے دب کر رہ

ماتھے کی بندیا سے ہے لپٹا سات سروں کا راگ  
 گال پہ کالے تل کا پہرہ  
 ناک میں لو لنگ سنہرا  
 پتلی لمبی گردن یہ یہ حسن کا سا گر سنہرا  
 سپنوں کی وہ رانی اک دن پگھٹت ہے جب آئی  
 من کی سچی دولت کو لیکھوں نے آگ لگائی  
 ٹوٹ گیا مٹی کا گھڑا اور پتھر بن گئی آپ  
 اس ناری کے ہاتھ لگے بس بے تعبیر خواب  
 من کی چٹکی کی کو کو میں

اب وہ ہر پل روئے

چاند کی بڑھیا چرخہ کا تے سارا عالم سوئے

سالوں لگے تھے اسے موت سے لڑتے اور  
 زندگی کی طرف آتے آتے، پھر اس نے وہ محلہ وہ  
 شہر وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا تھا اور یہاں سیبوں کی  
 خوشبو تلے ”پھول ٹکر“ کی بنیاد رکھی تھی جہاں بے  
 سہارا بچے اور عورتیں پناہ گزین تھیں، محبت کی قبر  
 میں جب محبت کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی تھیں تب وہ  
 اجنبی شخص ایک بار پھر اس کے دل میں سیندھ  
 لگانے روز آتا تھا وہ محبت کا کشکول تھا اسے اس  
 تلک آتا تھا اس کے پاس تھا ہی کیا جو اس کے  
 کا سے میں ڈالتی، ایک ٹوٹا پھوٹا وجود اور خالی  
 دلی، ویسے بھی اس بھری دنیا میں اس کے لئے ہر  
 مرد ”غفران“ ہی تھا۔

☆☆☆

شرارتی ملی کی سوچیں جانے کہاں سے  
 شروع ہوئی تھیں اور کہاں پر جا رہی تھیں اور محبت  
 نے جس کو ناگ بین کر ڈسا تھا وہ ساری سوچوں  
 سے عاری ہو گئی تھی، وہ گوشت پوست سے پتھر  
 میں ڈھل گئی تھی، نہ اب نیند اپنی رہی تھی اور نہ  
 سکون، کبھی تو سارا دن سوتے ہوئے گزر جاتا اور  
 کبھی ساری ساری رات افسر شاری کرتے  
 ہوئے، جانے محبت مر کر اپنی روح اس میں چھوڑ  
 گئی تھی یا واقعی اس میں غفران نامی جن کھس کر  
 بیٹھ گیا تھا اور جس دن اس نے اپنی چھت پر  
 کھڑے ہو کر سرسری سی نظر ماموں کے صحن میں  
 ڈالی تھی اور حدیقہ اور غفران کو اکٹھے بیٹھے دیکھا تھا  
 اس دن تو وہ پاگل ہی ہو گئی تھی، میڑھیاں ایک  
 طرف تھیں اور وہ بے دھیانی میں چھت پر سے  
 دوسری طرف اتر گئی تھی جہاں میڑھیاں تو کیا کوئی  
 سہارا بھی نہ تھا جو اسے زمین اور آسمان کے  
 درمیان مطلق رکھتا، اس کی چپٹیں شاید گلی کے ہر  
 شخص نے سنی تھیں مگر کوئی اس کے لئے کچھ نہ کر  
 سکا تھا، ایک ناگ ٹوٹی تھی اور دوسری جانے کتنی  
 زخمی اور پھر ریڑھ کی ہڈی پر ایسی ضرب لگی تھی کہ  
 وہ چلنے پھرنے سے بھی رہ گئی تھی، اس نے ہسپتال  
 میں اکثر غفران اور حدیقہ کو آتے جاتے دیکھا تھا  
 اور کس دل سے دیکھا تھا یہ وہی جانتی تھی یا اس کا  
 رب، حدیقہ اس کو دیکھ کر افسوس کرتی تھی اور  
 غفران کیا سوچتا تھا وہ یہ نہ جانتی تھی اور نہ جانتا  
 چاہتی تھی۔

روپ سلونا، بادراجوبن، نٹ کھٹ اس جیسے بال  
 چھم سے من میں آن اترتی  
 آن اترتی بے خود کرتی  
 اس کی شوخ ادا

اس کو چھو کر ایسا لالھے مٹھی بیچ ہوا  
 سیدھی ناگ میں چٹکی بھر سیندھ لگائے آگ

درویش و ایک جوکر  
بشری سیال





در اصل وہ ارم آفندی کو نہیں محبت کو دھکے دے کر گھر سے نکال رہی تھی۔

”شفق!“ اس نے لاؤنج کے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑ کر دیکھا تھا۔

”اچھا نہیں کیا آپ نے میرے ساتھ۔“ اس کے لہجے کی تڑپ اندر کے کرب کا پتا دے رہی تھی، وہ بنا پللیں جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میرا سب کچھ داؤ پر لگا کر، مجھے میرے شوہر کی نظروں میں ذلیل کروا کر آپ کہتے

ہیں۔“ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی جس کا مطلب تھا تم اب جاؤ،

اور وہ چلا گیا تھا، شفق شاہ نے مڑ کر بیڈروم کے بند دروازے کو دیکھا اور گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

”شہر و شاہ کو فاج کا ایک ہوا ہے۔“

”وہ کیسے ہو سکتے ہیں آپ کے شوہر؟ ان کی اور آپ کی ایج میں اتنا ڈفرنس۔“ وہ دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کے پتھر ہوتے وجود کو دیکھ رہا تھا، وہ کیسی بے جان مورتی کی طرح کھڑی تھی۔

”شفق! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ اس کا بازو پکڑ کر ہلایا تو گویا اس کا سکتہ ٹوٹا۔

”چلے جائیں یہاں سے آپ۔“ اس کے اندر جوار بھانا اٹھ رہا تھا۔

”از میر شاہ اس کے متعلق کیا سوچے گا۔“ یہ خیال ہر خیال پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

”میں اس طرح یہاں سے.....“

”ارم آفندی جائیں یہاں سے۔“ اس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر کی جانب دھکیلا تھا۔

”دوبارہ کبھی میرے سامنے مت آنا۔“

مکمل ٹائون



زرینہ شاہ شوہر کے پاؤں دبا رہی تھی جب انہوں نے بتایا۔

”اللہ خیر کرے۔“ انہوں نے بے اختیار کہا۔

”اس وقت کہاں ہے شہروز بھائی۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

”ڈاکٹروں نے لا علاج قرار دے کر گھر بھیج دیا ہے۔“ وہ طنز سے گویا ہوئے۔

”اور ان جیسوں کی اللہ خیر نہیں کرتا، جب رسی کھینچنے پر آتا ہے تو.....“ دانستہ بات ادھوری

چھوڑ کر وہ مسکراتے لگے، زرینہ شاہ نے متاسف نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”خدا کی طرف سے آزمائشیں ہوتی ہیں یہ، اللہ سے ہر دم دعا مانگتے رہنا چاہیے کہ سب کو

آزمائش سے بچائے۔“ انہیں شوہر کے رویے پر بہت افسوس ہو رہا تھا، جو اپنے ہی خوئی رشتے دار کی اتنی تکلیف پر خوش ہو رہے تھے۔

”ان جیسوں کے لئے بیماری یا کوئی بھی مصیبت آزمائش نہیں بلکہ سزا ہوتی ہے، خود اس

نے کم ظلم کیے ہیں ساری زندگی، دیکھو کیسے شان سے اکڑا کر کر زمین پر قدم رکھتا تھا، اب بے بسی

سے بستر پر پڑا ہے، دوسروں کو حقیر جاننے والا اب خود اس روم تک نہیں جاسکتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”انسان کی فطرت ہے، دوسروں پر آنے والی آزمائش اسے سزا لگتی ہے اور خود پر اگر

مصیبت آجائے تو وہ اسے آزمائش سمجھتے ہیں۔“ نا چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئیں۔

”تم سے کس نے کہا ہے مجھ و عطا سنانے بیٹھ جاؤ۔“ ارباز شاہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ ڈر گئی۔

”تمہارا جو بھی مطلب ہو، مجھ سے الجھنے کی

ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے پاؤں سے ہٹائے تھے۔

”ہو سکتا ہے اب از میر شاہ باب کی عبادت کو آئے۔“ زرینہ شاہ نے دل میں آئی ہوئی ایک

بات کہہ دی جس سے ارباز شاہ کا موڈ مزید گھڑ گیا۔

”آتا ہے تو آئے، ہمیں کیا؟“ وہ درشتی سے بولا۔

”ہو سکتا ہے ساتھ گزریا کو بھی ساتھ لے آئے۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی اور اس کا یہ کہنا

غضب ثابت ہوا۔

”خبردار اگر اس کو اس گھر میں قدم بھی رکھنے کی اجازت دی تو، وہ میرے لئے اسی دن

مر گئی تھی جب وہ از میر شاہ کے ساتھ اس حویلی سے میری اجازت کے بغیر بھاگی تھی۔“ وہ

رعونت سے بولے۔

”وہ بھاگی نہیں تھی، نہ ہی اس کی بھاگنے کی عمر تھی، اس کی جان کو خطرہ تھا اس لئے۔“

”بس زرینہ بیگم!“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔

”جو کہ دیا اسے زہن نشین کر لو، شفق شاہ اس حویلی میں قدم بھی نہ رکھنے پائے۔“ اور وہ

اس شخص کی فرعونیت سے واقف تھیں، اس لئے اس وقت خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

اپنی گاڑی کو ٹیک لگا دے وہ اس کے گھر کے سامنے گھڑا بارش میں بیگ رہا تھا، آسمان بھی

زور دھور سے آنسو بہا رہا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھیرے۔

”ایسا ہو گا میرے ساتھ، یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“ اس نے پیاسی نظروں سے شفق

”ایسا تو ایک نہ ایک دن ہوتا ہی تھا، غلطی اس کی نہیں میری ہے، جودل میں خوش گمانی بال لی کہ شاید.....“ اسے شفق شاہ سے ایسی امید ہرگز نہ تھی، وہ بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔

”شاہ جی!“ شام ہو رہی تھی، گھر میں گہری چپ کا راج تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی، اس کے مخاطب کرنے پر بھی اس کے ساکت وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی تھی۔

”یوں مجھ سے منہ موڑ کر مت کھڑے ہوں، میری طرف دیکھیں، میری بات سنیں۔“ وہ لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے بولی تھی، مگر جواب نہ دار۔

”کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“ از میر شاہ کی مسلسل خاموشی اسے خوفزدہ کر رہی تھی، وہ اور آگے آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑنا چاہا مگر وہ جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ اس نے سوال کیا مگر وہ تو شاید کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”شاہ جی!“ وہ کسی خوف کے زیر اثر زور سے چلائی، اس نے اپنا ہاتھ پھیر لیا۔

”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ وہ اس سے دور ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھا، وہ بھی اس کی تقلید میں اس کے برابر جا بیٹھی۔

”آپ کو مجھ سے بات کرنی پڑے گی، میری بات سنی ہوگی آپ کو۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”میں تم سے محبت کا اظہار کروں تو تمہیں تکلیف ہوتی ہے، تم مجھ پر بڑے بڑے الزام لگاتی ہو اور وہ کیا کہہ رہا تھا؟“ اس کے لفظ کسی تیز

شاہ کے گھر کے بند گیٹ کی طرف دیکھا تھا، یہاں آنے سے پہلے بہت کچھ سوچ کر آیا تھا، اس سے اظہار محبت کرے گا، اسے اپنی سچی اور بے لوث محبت کا یقین دلانے گا، اسے منا کر ہی دم لے گا، مگر وہاں آ کر اسے جو شاک لگا تھا تو اس کا سنبھلنا مشکل ہو گیا تھا۔

بارش نے ہر طرف جل جھل کر دیا تھا، مگر وہ ہر احساس سے گویا عاری ہو چکا تھا، اس سے دور جانے کا تصور ہی جان لیوا محسوس ہو رہا تھا۔

”کو چل پڑا ہوں دل سے مگر چاہتا ہوں میں وہ اٹھ کے مجھ کو روک لے اور راستہ نہ دے

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا، دل میں عجیب سا درد اٹھا تھا جو رفتہ رفتہ سارے بدن میں پھیل رہا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ وہ دل لے کر تمام عمر وہیں بیٹھا رہے، مگر اس میں شفق شاہ کا نقصان تھا۔

☆☆☆

از میر شاہ بہت پریشانی کے عالم میں آفس سے نکلا تھا، آج ایسے بی بی جان اور زوہرہ کی یاد شدت سے آرہی تھی، وہ شفق شاہ کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا، سوچ کر آیا تھا کہ آج اسے بتائے گا کہ کتنی طویل مسافت وہ اذیتیں اور تنہائی کے عذاب سہتے ہوئے گزرا آئے ہیں، مگر یہاں تو کچھ اور ہی اس کا منتظر تھا، اسے کئی گھنٹے ہو گئے تھے اسی طرح کھڑے ہوئے، اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں، مگر وہ جیسے ہر احساس سے عاری تھا۔

”تو آخر وہ وقت آ گیا، جس کا مجھے ڈر تھا۔“ بارش نے ہر طرف جل جھل کر دیا تھا، کچھ ایسی ہی بوند باندی اس کے اندر بھی ہو رہی تھی، بارش تھم گئی تھی اور اب خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں جو اس کے زخموں کو چھین رہی تھیں، اس کو اس کی بے بسی کا احساس دل رہی تھیں۔

دھار چھری کی مانند اس کے وجود کو کاٹ رہے تھے، مگر اسے احساس نہ تھا۔

”اس کے قول اور فعل کے لئے میں ذمہ دار نہیں ہوں، مگر میں نے نہ کچھ غلط کیا ہے اور نہ کروں گی، میرا ضمیر مطمئن ہے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”میں تمہیں یہاں تمہاری Safety کے لئے لایا تھا، تمہاری جان کو خطرہ تھا وہ اب ٹل گیا، میری طرف سے تم آزاد ہو، جہاں جانا چاہو چلی جاؤ۔“ اس نے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا، وہ بے یقین لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جس کے ساتھ مرضی جاؤ، مجھے اعتراض نہیں ہے۔“ سگریٹ منہ میں دبا کر اس نے اسے شعلہ دکھایا تھا، دکھ سے شفق شاہ کا دل پھٹنے لگا تھا، از میر شاہ نے سگریٹ کا دھواں چھوڑا تو وہ کھانسنے لگی، مگر اس پر اثر نہ ہوا۔

”بند کریں سگریٹ پیٹا۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھیننا چاہی، مگر از میر شاہ نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔

”سگریٹ پیٹا گناہ ہے، میں جانتا ہوں۔“ اس نے ایک لمبا کس لے کر دھواں فضا کے سپرد کیا۔

”مگر شوہر سے بے وفائی کرنے سے بڑا گناہ نہیں ہے۔“ اس کی طرف دیکھے بنا وہ بولا تو شفق شاہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اس قدر شکی ہیں، اگر علم ہوتا تو ماریہ سے دوستی نہ کرتی نہ ہی اس کے گھر جاتی۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل کر گالوں پر بہنے لگے تھے، مگر آج اس کے آنسو از میر شاہ پر کوئی اثر نہ کر رہے تھے۔

”میں نے آپ کے ساتھ کوئی بے وفائی نہیں کی، میرا بچپن جوانی، سب ٹائم آپ کے

سامنے ہے، مجھے بتائیں کب میرے کردار میں کوئی خامی دیکھی آپ نے؟“ اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”مجھے اتنا کم عقل اور کم علم مت سمجھو، وہ کل کا لڑکا اور تم اتنی سی بچی مل کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے، کچھ لمبی میری نظروں سے مخفی نہیں تھا، بس میں خاموش تھا تو صرف اس لئے کہ.....“

”لیف از میر شاہ!“ اس نے زور سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتی۔“ اس کی برداشت جواب دے گئی تھی یہ الزامات سن کر۔

”ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ دھوکہ کھا جاؤں۔“ وہ استہزاء انداز سے ہنسا۔

”انسوس ہو رہا ہے مجھے آپ کی سوچ پر، اتنے سال میں نے آپ کو اپنے ماں باپ عزیز رشتہ دار، دوست استاد اور سب سے بڑھ کر ہمدرد اور غمگسار سمجھے رکھا، ہر رشتے کی جگہ آپ کو دے دی، مگر آج بتا چلا آپ صرف اور صرف میرے شوہر ہیں، تنگ نظر اور شکی۔“ از میر شاہ کے الزام نے اسے بے حد دکھایا تھا۔

”اس سے تو بہتر تھا مجھے میرے ماں باپ کے پاس رہنے دیتے۔“ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

”تم ابھی بھی اپنے ماں باپ کے پاس جا سکتی ہو، کس نے روکا ہے تم کو جاؤ۔“ وہ مڑا اور وارڈ روب میں سے اپنے کپڑے نکال کر بیگ میں ڈالنے لگا، وہ ششدر رہ گئی، از میر شاہ کا یہ روپ اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔

”کیا کر رہے ہیں آپ؟“ وہ آگے بڑھی اور اسے روکنا چاہا۔

”پکینگ کر لو، ہم واپس جا رہے ہیں۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ بولا تھا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ اس کے تہور دیکھ کر گھبرا گئی۔

”دس منٹ کے بعد ہم یہاں سے نکل رہے ہیں، میں انکار نہیں سنوں گا، تم پیکنگ کرنی ہے تو کرو ورنہ ایسے ہی لے جاؤں گا۔“ وہ آنسو بہاتی جاتی تھی اور ساتھ ہی پیکنگ کر رہی تھی، از میر شاہ نے اسے بہت رو لایا تھا۔

☆☆☆

وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے سیدھا اپنے روم میں آیا تھا، یہ بھی اچھا ہوا کہ کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا، ورنہ اس کا گیلیا لباس، شدت ضبط کے باعث سرخ ہوتی آنکھیں اور شکستہ انداز بہت سے راز کھول دیتا، بہت سے سوال اٹھاتا جو اسے گوارا نہ تھا۔

”محبت بھی کیسی کیسی آزمائشیں لے کر آتی ہے، انسان کے وہم و گمان میں بھی جو بات نہیں ہوتی وہ ہو جاتی ہے، محبت کی قسمت میں ٹھوکریں اور درد بھری ٹیوں لگتی ہے؟“ بارش میں اتنی دیر بھیگنے سے اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا، اس پر کچھی طاری ہو رہی تھی، مگر اسے پرواہ نہ تھی۔

”شفق میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس کے اندر کوئی زور سے چلا یا۔

”جب سے تمہیں دیکھا، دل نے جہیں اپنا اور صرف اپنا ماننا شروع کر دیا، کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا کہ تم یوں ملنے سے پہلے ہی پھنچ جاؤ گی۔“ وہ بے دم ہو کر بند پر گر گیا تھا۔

”وہ شخص تمہارے باپ کی عمر کا ہے، وہ تمہارا شوہر کیسے ہو سکتا ہے، کیوں کیا تمہارے والدین نے یہ ظلم تم پر؟“ اسے اب اس پر بھی ترس آ رہا تھا، وہ تو از میر شاہ کو شفق شاہ کا باپ سمجھتا رہا تھا، اس انکشاف نے کہ از میر شاہ اس کا شوہر ہے جہاں اس کا دل توڑا وہیں اسے شفق

سے بھی ہمدردی ہونے لگی۔

”میرے آنے کے بعد اس نے اسے کیا کہا ہو گا؟“ اف۔“ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا، ایک نئی پریشانی اور بے چینی اسے لاحق ہو گئی تھی، اس کا دماغ سن ہو رہا تھا، اس نے بمشکل لباس تبدیل کیا اور دوبارہ لیٹ گیا۔

وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر بے حد حیران تھا، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ مارے کو کچھ نہیں بتائے گا، وہ اسے شفق سے بدگمان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اتنا لمبا سفر بہت خاموشی سے گزرا، اس کی جانب سے رخ موڑ لے وہ گاڑی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر کو بغور دیکھتے ہوئی سوچوں میں گم تھی، اسے از میر شاہ سے ایسے رویے کی بالکل امید نہ تھی، دل اس کی باتوں سے بہت دکھا تھا۔

”نیچے اتر دو۔“ اس نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روک لی تھی، رات کافی زیادہ ہو گئی تھی، از میر شاہ نے ہوٹل میں قیام کا فیصلہ کیا تھا، وہ خاموشی سے اس کے ساتھ آگئی تھی۔

”آ جاؤ کھانا کھا لو۔“ وہ صوفے پر بیٹھی تھی، از میر شاہ بیڈ پر بیٹھا تھا، سامنے ٹیبل پر ویٹر کھانا رکھ گیا تھا، وہ اسے کھانے کے لئے بلایا تھا خود جا کر چیئر پر بیٹھ گیا۔

”بھوک نہیں ہے۔“ اس نے سارا دن بھی کچھ نہیں کھایا تھا اور از میر شاہ کی باتوں نے اسے بہت دکھی کیا تھا اس کو بھوک تو لگی تھی مگر اس وقت کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”اوکے! ایڑیو دس۔“ از میر شاہ نے کندھے اچکائے اور کھانا کھانے لگا، وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ جو اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا، چائے تک نہ پیتا تھا اس وقت اس

کے سامنے بیٹھا اکیلا، بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا، اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

نا چاہتے ہوئے بھی وہ منتظر رہی کہ وہ اسے دوبارہ کہے گا، مگر اس نے اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔

”جائے پیو گی؟“ از میر شاہ بخور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور داش روم میں چلی گئی، وہاں جا کر جی بھر کر روئی، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر اسے سزا دینے کے لئے ایسا کر رہا ہے، وہ باہر نکلی تو از میر شاہ کے ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر دیکھ کر سلگ اُگی۔

”یہ میں آپ کو نہیں پینے دوں گی۔“ اس نے آگے بڑھ کر ڈبیا اس کے ہاتھ سے چھٹی تھی۔

”سگریٹ واپس کر دو شوق شاہ!“ وہ بنجیدگی سے بولا۔

”نہیں کروں گی۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کیا تھا، از میر شاہ کے تیور خاصے خطرناک تھے، وہ ڈر گئی۔

”پچھتاؤ گی۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا، اس کی آنکھوں میں اترتے غصے کو وہ دیکھ چکی تھی۔

”میری زندگی میں پچھتاؤوں کے سوا کچھ نہیں لکھا از میر شاہ!“ اس نے اسی کے انداز میں بات کی، چند ثانیے وہ بخور اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

”ادھر رکھ دو ڈبیا۔“ اس نے اپنی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔

”نہیں دوں گی، بتا چکی ہوں۔“ وہ ہٹ دھری سے بولی، از میر شاہ کے بگڑتے تیور اسے ڈرارہے تھے، مگر وہ لہجہ کو مضبوط کر کے بے خونی

سے بولی۔

”مجھ سے ضد مت کرنا۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تختی سے پکڑا، اس کے لہجے کا پتھر یا انداز اس وقت شوق شاہ کے دل پر مکا بن کر لگا تھا، اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگیں۔

”آپ مجھ پر دھونس جما سکتے ہیں، زبردستی اپنی ہر بات منوا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں آپ کو کسی غلط بات سے روک سکتی۔“ وہ آنسو پینے کی کوشش میں بے حال تھی۔

”میں نے تو کہا ہے آج سے سب پابندیاں ختم، جاؤ تم آزاد ہو، کسی صحیح یا غلط کے لئے میں تم کو نہیں روکوں گا شوق شاہ!“ اس کی آنکھوں میں جمنا لگتے ہوئے وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا تھا، اس کا لہجہ اس کی گرفت سے زیادہ سخت تھا۔

”بہت ظالم ہیں آپ۔“ اس نے دوسرا ہاتھ آگے کر کے سگریٹ کی ڈبیا ٹیبل پر اچھال دی، از میر شاہ نے فوراً اس کی کلائی چھوڑ دی، وہ واپس مڑی اور صوفے پر جا بیٹھی، سر گھٹنوں میں دے کر وہ روئے لگی۔

”زورہ تم نے ٹھیک کہا تھا، سگریٹ واقعی دل کو بہلاتی ہے اور غم کو بھی کم کر دیتی ہے، مگر بعض غم اتنے بڑے اور گہرے ہوتے ہیں گھن کی طرح انسان کو چاٹ جاتے ہیں، وہاں پہنچو سا سلگتا ہوا شعلہ کیا کرے، ایسے میں انسان خود سگریٹ کے ساتھ جلا، سلگتا اور دھواں دھواں ہونے لگتا ہے۔“ اس نے ایک لمبا کشی لگا کر دھواں فضا کو سپرد کیا، دھوئیں کے اس پار شوق شاہ کی دھندلی دھندلی تصویر اسے نظر آ رہی تھی، وہ سمجھ نہ پایا شوق شاہ کے عکس کو وقت، سگریٹ کے دھوئیں یا بدگمانی میں سے کس چیز نے دھندلایا

تھا۔

تمام رات وہ سو گنگ کرتا رہا تھا اور شفق شاہ روم کے باہر بنی گیلری میں کراؤ نہ بھاتی رہی تھی۔

☆☆☆

”بھائی آج اتنا زیادہ سو لیا، خیریت؟“ رات ہو گئی تھی، مگر وہ اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلا تھا، ماریہ اسے دیکھنے آ گئی۔

”ہاں، بس طبیعت کچھ اچھی محسوس نہیں ہو رہی۔“ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اس کی خوبصورت، گہری آنکھیں زیادہ سونے سے کچھ سوچ گئی تھیں اور اچھی لگ رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ ماریہ کو تشویش ہونے لگی۔ ”آپ نے شفق کی بات کو دل پر لے لیا؟“ اسے شفق پر غصہ آنے لگا تھا۔

”نہیں یار!“ اس نے نور اسرفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

”موسم کا اثر ہے شاید۔“ وہ بات بٹا گیا۔ ”موسم تو اتنا پیارا ہے، موسم کا اثر نہیں ہے، ہاں دل کے موسم کی بات کر لیں۔“ اس نے بغور بھائی کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”دل کا موسم بھی ایک دم پرنیکٹ ہے۔“ وہ ہنس دیا۔

”آپ شفق کو بھول جائیں، کل پارٹی میں اتنی لڑکیاں ہوں گی کوئی سی بھی پسند کر لیجئے گا، ہم آپ کا رشتہ وہاں کروا دیں گے۔“ اس نے اپنے بھائی کو اس سے پہلے بھی اداس نہیں دیکھا تھا، اسے رہ رہ کر شفق پر غصہ آرہا تھا۔

”اوکے میم!“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فرمانبرداری سے کہا تو وہ ہنس دی۔

”اب آپ جلدی سے فریش ہو کر آ جائیں کھانے پر ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ اٹھ

کر باہر کی جانب بڑھی، اس کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”لکھوں میں کیا سے کیا ہو گیا، ایسا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا جو ہو گیا۔“ وہ سردوں ہاتھوں میں تمام کر بیٹھا تھا۔

”یہ کہہ دینا، بھول جاؤ اسے بہت آسان ہوتا ہے ماریہ، مگر اس پر عمل کرنا شاید دنیا کا سب سے مشکل کام۔“ وہ اپنی ہتھیلیوں کو سامنے پھیلائے بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔

”دل پر کب کسی کا اختیار ہوا ہے، یادوں کو کون اپنے کنٹرول میں کر سکا ہے، یہ سب بے اختیاری جذبے ہیں، انسان کو بے بس کر کے اس کا تماشا دیکھتے ہیں۔“ وہ فریش ہو کر آیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کتنا بدل دیا تھا تمہاری محبت نے مجھے، سب کچھ بہت نیا اور اچھا اچھا لگنے لگا تھا، یا اللہ! اگر نصیب میں جدرائی میں لکھی ہوتی ہے تو پھر تو ہم انسانوں کے دلوں میں محبت جیسا جذبہ ڈالتا ہی کیوں ہے، جب مرضی تیری ہی مانتی ہوتی ہے ہم نے، تو پھر محبت کرنے کا اختیار بھی ہم سے واپس لے لے۔“ چند گھنٹوں میں ہی اپنا آپ اسے بہت کمزور اور بیمار محسوس ہونے لگا تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا شفق شاہ میرے ساتھ، میں نے کیا گناہ کیا تھا جس کی تم نے مجھے یہ سزا دی۔“ وہ چشم تصور میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”آپ نے کب اچھا کیا میرے ساتھ ارم آفندی!“ آئینے میں اس کی شبیہ ابھری، وہ دم سادھے کھڑا تھا۔

”میرے شوہر کی نظروں میں مجھے گرایا۔“ وہ شکوہ کنان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”شفق!“ اس کے لب کے لب بے بس قیدی

پرندے کی مانند پھر پھڑپھڑائے تھے، اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر آئینے پر پھیرا، اس کا عکس غائب ہو گیا۔

”شفیق! سنو رکو۔“ وہ تیزی سے مڑا، مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔

”تو یہ طے ہوا شفق کہ میں تم کو نہیں بھلا سکتا۔“ وہ سر تھاڑے وہیں بیٹھ گیا تھا، اس کے چہرے پر شدید اذیت تھی۔

☆☆☆

رات کی سیاہ چادر پر صبح کی دبیز تہہ نے غلبہ پانا شروع کیا تو ان لوگوں نے اپنا سفر پھر شروع کر لیا تھا، از میر شاہ نے اسے مخاطب کیا اور نہ ہی اس نے اس سے پھر کوئی بات کی، وہ اس سے مکمل طور پر بدگمان ہو چکی تھی۔

طویل تھکا دینے والے سفر کا اختتام ہونے والا تھا، گاڑی گاؤں کے جانے پہچانے رستوں پر رواں دواں تھی، دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے، شفق شاہ کے ذہن کے کسی گوشے میں دہلی یادیں تازہ ہونے لگی تھیں، ان پگھلندہ یوں اور ان کھیتوں میں بھاگتے دوڑتے اس نے سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھولنے اور گڑبوں کی شادیاں کرتے یہاں زندگی کے کچھ ابتدائی سال گزارے تھے۔

”آپ مجھے کب لینے آئیں گے؟“ اس نے ناچاہتے ہوئے بھی ڈرتے، ڈرتے یہ سوال کر ڈالا تھا۔

”شاید کبھی بھی نہیں۔“ گاڑی شفق شاہ کی حویلی کی طرف مڑ رہی تھی، اس کے الفاظ اس کی سماعتوں پر سیسہ بن کر لگے تھے۔

”آگے کیا کرنا ہے تمہیں، اس کا فیصلہ تم خود کرو گی، میں تم پر دھونس جمانے اور اپنی بات منوانے کے ہر حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔“ وہ

گہری سنجیدگی لہجے میں سوتے ہوئے بولا۔

”آج تک میری زندگی کا ہر فیصلہ آپ نے کیا ہے اور مجھے کبھی یہ شک نہیں گزرا کہ آپ نے غلط کیا ہے، آپ کے ساتھ اتنا وقت گزرا، مجھے کبھی آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہوا، مگر جو کچھ اب ہوا میں جانتی ہوں آپ میری کسی بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔۔۔۔۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”مگر مجھے اب بھی آپ پر اسی طرح اعتبار ہے، اتنا ہی یقین ہے جتنا یہاں سے آپ کی انگلی پکڑ کر نکلتے وقت تھا۔“ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ پھنس گیا تھا، از میر شاہ نے قصداً گاڑی کی اسپید کم کر دی تھی۔

”اس لئے میں اپنے متعلق ہر فیصلے کا اختیار آپ کو واپس لوٹاتی ہوں، کیونکہ میرے دل کو ابھی بھی یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ کبھی بھی کچھ غلط نہیں ہونے دیں گے، آپ میرے خیر خواہ ہیں۔“ اس کی جانب دیکھے بغیر وہ گاڑی سے نیچے اتر گئی تھی، شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ گیٹ تک آئی تھی، گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا تھا، از میر شاہ گاڑی بیک کر رہا تھا، اس کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

گاڑی تیزی سے دوڑاتا ہوا وہ حویلی کی طرف جا رہا تھا، گاڑی نے گیٹ کھول دیا تھا، وہ گاڑی اندر لے آیا، پورچ میں بابا جان کی جیب کھڑی تھی، وہ گاڑی وہیں چھوڑ کر باہر نکلا، ایک نظر اٹھا کر اس نے بلند وبالا اور شان سے کھڑی اس حویلی کو دیکھا تھا۔

”پر کاٹ کبچرے کا دروازہ کھول دینے سے قیدی پرندے کو اپنی بے بسی کا احساس اور زیادہ ہونے لگتا ہے۔“ ایک اداس سی سرگوشی اس کے کانوں کے قریب ابھری تھی۔



”زورہ!“ اس کے دل پر ایک گھونسا پڑا تھا۔

”بی بی جان!“ وہ قدموں کو گھسیٹتا ہوا اندر کی جانب بڑھا، اسے کوئی ذی روح نظر نہ آیا ہر طرف گہرا سناٹا تھا، یہ سہ پہر کا وقت تھا، حویلی کے باغ میں لگے درختوں پر بیٹھا ہوا کوئی کوا کائیں کائیں کرتا تو اس خاموشی میں لمحہ بھر کو ارتعاش پیدا ہوتا۔

اچانک اس کی سامنے نظر پڑی، اس کا پالتو کتا لوسی جانے کس بات پر اداس اور خاموش بیٹھا تھا، اچانک لوسی کی نظر اس پر پڑی تھی، چند ٹاپے وہ اسے بخور دیکھتا رہا اور پھر اچانک بھاگتا ہوا اس کے سامنے آکھڑا ہوا، از میر شاہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ اس کے پیروں پر اپنا سر رگڑنے لگا۔

”تم نے مجھے پہچان لیا لوسی؟“ وہ بچوں کے بل بیچے بیٹھ گیا اور اس کے سر پر پیار کرنے لگا، لوسی کالی دیر اس کے ہاتھ اور پاؤں چاٹ کر اپنی محبت کا اظہار کرتا رہا۔

از میر شاہ اٹھ کر اندر آ گیا، بی بی جان کے کمرے میں گیا، وہ وہاں نہیں تھیں، سامنے بیڈ کے پاس ایک چار پائی پڑی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ واپس مڑ گیا، پوری حویلی میں بی بی جان کہیں نہ تھیں، انہیں تلاش کرتا ہوا وہ ہال کی طرف جا رہا تھا جب وہ کچن سے نکلیں، آنکھیں سکوڑ کر وہ اسے بخور دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”از میر شاہ!“ ان کے لب ہلے، از میر شاہ کا دل رک رک کر جلنے لگا تھا۔

”بی بی جان!“ دونوں کے درمیان تقریباً دس سالوں کی جدائی کا وقت حائل تھا، دونوں ساکت کھڑے تھے، بالآخر از میر شاہ آگے بڑھا

اور انہیں بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔  
”کہاں تھے میرے بچے؟ دیکھ تیری بی بی جان کتنی اکیلی ہو گئیں۔“ وہ سسک اٹھیں۔

”میں آ گیا ہوں بی بی جان۔“ ان کا سر اپنے سینے سے لگائے وہ ان کی پشت سہلارہا تھا۔  
”تو نے بہت دیر کر دی از میر شاہ، زورہ شاہ چلی گئی، وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی، روٹھ گئی وہ ہم سے، ہمارا چین اور سکون بھی ساتھ ہی لے گئی۔“ وہ دھڑپ مار مار کر رو رہی تھیں اور ان کو سنبالنے کی کوشش میں ناکام از میر شاہ خود پر ضبط کھو بیٹھا تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی زورہ شاہ کی موت کی خبر اس حویلی میں آئی ہو۔

”اس خاندان کے رواج میری بیٹی کو کھانا، ریس، جیت گئیں، میری بیٹی زندگی کی بازی ہار گئی، میرا بیٹا مجھ سے چھن گیا۔“ سعید شاہ کی آہ وزاری سن کر ملازم اکٹھے ہو گئے تھے اور از میر شاہ کو سامنے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

”میں آ گیا ہوں بی بی جان۔“ وہ انہیں اسی طرح ساتھ لگائے تخت تک لایا اور انہیں بیٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔

”تم دیکھو حویلی کیسے سنسان ہو گئی ہے، اپنے کینوں کی تباہی و بربادی کی داستان سنائی ہے، جن چھتوں کے نیچے بیٹیوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہوں، جہاں بیٹی سے زیادہ اہمیت زمینوں، جائیدادوں، رسموں اور رواجوں کی ہو وہاں ایسے ہی تباہیاں آتی ہیں وہاں فصلیں جلتی ہیں اور گوداموں میں شعلے بھڑک کر کسی کے غرور کو خاک میں ملانے ہیں۔“ وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

”بس بی بی جان۔“ ملازموں کو سامنے دیکھ کر اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے اور بی بی

ہی نہ ہو رہی تھیں، بی بی جان نے کئی بار اسے بابا جان سے ملنے کے لئے کہا، مگر ہر بار وہ ٹال جاتا، وہ آج بھی ان سے ملنے کا حوصلہ نہ کر پایا تھا۔

☆☆☆

کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے حویلی میں قدم رکھا تھا، بہت کچھ بدل گیا تھا، یکا یک جیسے منظر بدل گیا تھا، ایک چھوٹی سی بچی ہاتھ میں گڑیا پکڑے گیٹ سے بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی، گڑیا کو پٹنگ پر پھینک کر وہ زور زور سے چلانے لگی تھی۔

”اماں مجھے بھوک لگی ہے۔“ منظر بدل گیا تھا اب وہی بچی سرخ جوڑا پہنے روتی ہوئی وہاں سے جا رہی تھی، اگلے منظر میں رات کا وقت تھا جب وہی بچی از میر شاہ کی انگلی تھامے اس حویلی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی۔

کچھ نہیں چاہیے تجھ سے اے میر عمر ارواں میرا بچپن میرے جگنو میری گڑیا لا دے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی، ایسے عجب سا خوف اور انجانی خوشی محسوس ہو رہی تھی، وہ اماں اور بابا کے کمرے میں آگئی تھی، وہ سامنے بیڈ پر یقیناً اماں ہی سو رہی تھیں۔

”اماں!“ وہ ان کے پاس آ کر کھڑی ہوئی تھی اور آہستگی سے ان کو آواز دی۔

”اماں!“ وہ ذرا سا کسم کسمیں اور پھر آنکھیں کھول دیں، ماہ دو سال کی گردش نے اسے ایک معصوم بچی سے ایک جوان لڑکی بنا دیا تھا۔

”گڑیا!“ مگر ان کے لئے وہ آج بھی گڑیا ہی تھی۔

”میری بچی۔“ وہ بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھ رہی تھیں، پھر جیسے ایک دم ہوش میں آئیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”اماں!“ وہ ان کے قدموں کے قریب

جان کو بھی چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے ایک ملازمہ کو اشارہ کیا، وہ پانی کا گلاس لے آئی۔

”لیں پانی پیئیں۔“ اس نے گلاس ان کے منہ کو لگایا اور اشارے سے ملازموں کو وہاں سے جانے کو کہا آہستہ آہستہ سب وہاں سے چلے گئے۔

”میری مجبوری اور آزمائش دیکھو جس نے ساری زندگی رلایا، مجھے لمحہ لمحہ تڑپایا، میرے بچوں کو مجھ سے دور کیا، آج میں اسی کی خدمت کرنے پر مجبور ہوں، جو مجھے بے بس کر کے ساری زندگی تماشہ دیکھتا رہا، آج اس کی بے بسی مجھے رلاتی ہے۔“ وہ لب تلخینچے خاموش بیٹھا تھا۔

”ملو گے اپنے بابا سے؟“ انہوں نے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔

”نہیں!“ اس نے سر جھکا لیا اور لب تلخینچے لئے۔

”انہیں فالج ہو گیا ہے بائیں سائیڈ پر، چلنے پھرنے سے قاصر ہیں، بستر پر ہی پڑے رہتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر رو دی تھیں۔

”تم نہیں جانتے میں نے تمہاری جدائی میں یہ وقت کیسے گزارا، ہر وقت تمہاری زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگتی تھی۔“ ان کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

”مجھے معاف کر دیں بی بی جان، میں بہت مجبور ہو گیا تھا، بابا جان جو ظلم کرنا چاہتے تھے، مزید میں ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، میں جانتا ہوں میں آپ کا مجرم ہوں، جس وقت آپ کو سب سے زیادہ میری ضرورت تھی ایسے وقت میں آپ کو چھوڑ گیا، دراصل میں ایک اور زور و ہر شاہ کو قبر میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا۔“

اتنے سالوں کے بعد ملے تھے تو باتیں ختم

بیٹھ گئی۔

دونوں گلے لگ گئیں اور خوب روئیں، شام ہونے کو آئی تھی، مگر وہ اماں کی گود میں سر رکھے لپٹی ان سے باتیں کر رہی تھی۔

”بابا کہاں ہیں؟“ اس نے اماں سے پوچھا۔

”وہ شہر گئے ہیں کسی کام سے، چار دن بعد واپس آئیں گے۔“ وہ اس کے بالوں میں اٹھکیاں پھیرنے لگیں۔

”کتنی خوبصورت ہو گئی ہے میری گڑیا۔“ انہوں نے اس کا گال چومنا تو وہ ہنس دی۔

”از میر شاہ کیسا ہے؟ تیرے ساتھ تو اچھا ہے نا؟“ انہوں نے فکر مندی سے سوال کیا۔

”اماں وہ بہت اچھے ہیں۔“ دل میں ایک نیس سی اٹھی تھی، جسے دبا کر وہ بولی، تو اماں کو ڈھیروں طمانیت کا احساس ہوا۔

”میں اس کی احسان مند ہوں، اس نے خاندانی روایات سے نکلے کر تمہیں بچایا، اگر وہ تمہیں یہاں سے نہ لے جاتا تو بہت نقصان ہوتا میرا اور تمہارا، وہ اس خاندان میں رحمت کا کوئی فرشتہ بنا کر آیا ہے۔“ وہ خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”انہوں نے مجھے سکول میں داخلہ دلوا دیا تھا بہت اچھے سکول میں، وہاں سے فارغ ہوئی تو پھر کالج میں داخل کر دیا، اب میرا زلٹ آئے گا تو مجھے یونیورسٹی بھیج دیں گے، اماں وہ کہتے ہیں مجھے بہت سارا پڑھائیں گے، میں اس خاندان کی بانی لڑکیوں سے مختلف زندگی گزاروں گی، میں بھی کسی کی محتاج نہیں ہوں گی، نہ ہی کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں گی۔“ اس نے انہیں تفصیل بتائی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔

”اللہ پاک از میر شاہ کو لمبی زندگی دے،

اس نے میرا مان سلامت رکھا، بہت احسان ہے اس کا آگ میں گود گیا تمہاری خاطر، ایسا فرشتہ صفت انسان بھلا اور کوئی ہے ہمارے رشتہ داروں میں۔“ اماں کی باتیں سن کر اسے رونا آنے لگا تھا، وہ کیا جائیں از میر شاہ اسے کیا حکم سنا گیا تھا۔

”گڑیا ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی جب اماں نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

”جی اماں پوچھیں۔“

”تمہارا کوئی بچہ نہیں ہوا؟“ اماں کے سوال پر اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”چلو ابھی تمہاری اتنی عمر بھی نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر بچن میں چلی گئیں جبکہ اس کے ذہن کے دریتجے میں سوچوں کے نے دروا کر گئیں، اس نے تو اس بچ پر کبھی نہیں سوچا تھا، کبھی ذہن میں ایسا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

از میر شاہ اپنے بیڑوم میں آ گیا تھا، اس کا کمرہ اسی طرح سلپتے سے موجود تھا جیسے اس کی موجودگی میں ہوا کرتا تھا، اس کے احساسات عجیب سے ہورہے تھے، وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔

”آہ!“ اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی تھی۔

اس نے اپنا سامان گاڑی میں سے نکالا اور اس میں سے کریم کلر کا کرتا شلوار نکال کر شاور لینے چلا گیا، بہت دیر شاور لینے سے سفر کی تھکان تو کچھ کم محسوس ہونے لگی مگر اعصاب پر بوجھ بڑھ گیا۔

”مجھے اماں کے پاس جانا ہے۔“ سامنے

بیڈ پر گڑیا بیٹھی تھی، وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔  
 ”مجھے اماں کے ہاتھ سے ناشتہ کرنا ہے۔“  
 وہ معصومیت لہجے میں سوئے ہوئے کچھ خفا خفا تھی۔

”میں آپ کو ناشتہ کرواؤں۔“ بھولی پسری  
 یادیں ذہن کی پردہ اسکرین پر ابھرا رہی تھیں،  
 اعصاب کی ٹھکن اور بڑھنے لگی تھی۔

”اتنا بڑا نوالہ نہیں، میں ابھی چھوٹی ہوں  
 نا۔“ اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر کر  
 فوراً معدوم ہو گئی تھی، وہ سر جھٹک کر ڈریسنگ ٹیبل  
 کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”مجھے بالوں کی پونی بنانی ہے۔“ آنکھیں  
 آنسوؤں سے بھر کر وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی،  
 از میر شاہ نے ڈریسنگ ٹیبل پر برش اٹھا لیا اور  
 بالوں میں پھیرنے لگا، اس کی گنپٹیوں کے سفید  
 بال اسے بہت گریس فل بنارہے تھے۔

”میری فکر مت کریں، میں مطمئن ہوں،  
 مگر آپ گڑیا کا بہت خیال رکھنا، اسے کبھی کوئی  
 تکلیف نہ ہونے دینا، اس کا بچپن اور اس کی  
 معصومیت کبھی ختم نہ ہونے دینا۔“ زوہرہ شاہ اس  
 کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا اس لئے میرا  
 ضمیر مطمئن ہے۔“ گڑیا کی جگہ اب کی بار شفقت  
 شاہ اس کے سامنے آئی تھی۔

یادوں کا ایک اژدیام تھا جو اسے گھیرے  
 ہوئے تھا، وہ گھبرا کر بیڈ روم سے باہر نکلا تھا۔

”چائے تیار ہے، آ جاؤ۔“ وہ باہر نکلا تو  
 سامنے ہی بی بی جان کو اپنا منتظر پایا، حویلی کا سناٹا  
 اسے اداس کر رہا تھا۔

چائے کے ساتھ بھی انہوں نے اتنا زیادہ  
 اہتمام کیا ہوا تھا، وہ ان کے پاس بیٹھ گیا اور  
 چائے پینے لگا۔

”ہماری بہو کہاں ہے؟“ بالآخر وہ سوال  
 ان کی نوک زبان پر آ ہی گیا جو کب سے دل میں  
 چل رہا تھا۔

”اس کو اس کے باپ کے گھر چھوڑ آیا  
 ہوں۔“ اس کے باپ کا نام لیتے ہوئے شدید  
 نفرت کی ہوا اس کے دل میں ابھی تھی جسے بمشکل  
 دباتے ہوئے وہ بولا اور کپ اٹھا کر لبوں سے لگا  
 لیا۔

”تمہارے باپ اور شفقت کے باپ کی دشمنی  
 روز بروز بڑھتی جاتی تھی، دونوں ایک دوسرے کو  
 نیچا دکھانے کے لئے ہر وقت کوشاں رہے، اس  
 نے ہمارے گودام میں آگ لگوا دی، کروڑوں کی  
 جنس جل گئی، ادھر تمہارے باپ نے اس کی تمام  
 فضلوں کو جلا ڈالا۔“ وہ تفصیل بتاتی جاتی تھیں اور  
 از میر شاہ حیرت سے ان کے منہ کو دیکھ رہا تھا۔

”حد ہوتی ہے جہالت کی۔“ وہ سر جھٹک کر  
 رہ گیا، چائے پی کی وہ وہیں تخت پر بی بی جان کی  
 گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا، وہ اس کے بالوں میں  
 اٹکیاں پھیر رہی تھیں، از میر شاہ کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

اتنے نام کے بعد وہ اماں کے ہاتھ کا کھانا  
 کھا رہی تھی، ایک تو بھوک بہت لگی تھی، پھر اماں  
 کے ہاتھ کی لذت، وہ ایک ایک چیز محبت سے  
 اسے پیش کر رہی تھی۔

”میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی اماں۔“  
 انہوں نے دیکھا وہ کافی بڑی ہو گئی تھی، ساتھ ہی  
 اس کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا، وہ بڑی  
 ماڈرن سی اور جدید دور کی لڑکی لگ رہی تھی، اس  
 کے بال لمبے تھے، مگر آگے سے کٹے ہوئے تھے،  
 جدید طرز کا لباس پہنے وہ بہت پرکشش دکھائی  
 دے رہی تھی۔

”میں تمہیں کب بھولی تھی میری جان۔“

انہوں نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری تھی۔  
”ہر وقت تمہارے لئے دعا میں، تم سے  
ملنے کی آس رہتی تھی، کچھ پتا نہ تھا تم کہاں ہو۔“  
وہ افسردگی سے بولیں۔

”اب تو میں آگئی ہوں آپ کے پاس۔“  
اس نے اٹھ کر اپنے بازو ان کے گلے میں حاصل  
کر دیئے، اس کی اس ادھر انہیں ٹوٹ کر پیار آیا،  
اسے کھانا کھانے کے بعد اس کے کمرے میں  
اسے لے گئیں۔

”میری گڑیا۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھی،  
اس کے بیڈ پر اس کی گڑیا ابھی تک بڑی ہوئی تھی،  
بہت سی دھندلی دھندلی یادیں اس کے ذہن کے  
تاریک گوشے میں جگمگانے لگی تھیں، دل بہت  
اداس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

ارم آندھی کی کامیابی کی خوشی میں پارٹی کا  
اہتمام کیا گیا تھا، خاندان بھر کے ساتھ ساتھ سب  
فرینڈز بھی انوائٹڈ تھے، ارم آندھی کا لکھنا ہوا قد  
سیاہ ڈزسوٹ میں اور بھی نمایاں ہو رہا تھا، صنف  
نازک کے دل اسے دیکھ کر دھڑک اٹھے تھے، مگر  
وہ اپنی طبیعت کے برعکس آج خاموش اور سنجیدہ  
تھا۔

”بھائی اس سے ملیں یہ زویا ہے۔“ وہ سب  
سے الگ تھلگ، لان کے ایک کونے میں کھڑا تھا  
جب ماریہ اسے لے کر ارم آندھی کے پاس آئی  
تھی۔

”ہیلو!“ زویا نے ہاتھ بلایا، بلاشبہ وہ لڑکی  
بہت خوبصورت تھی، ارم آندھی کو ماننا پڑا۔

مگر محبت کا حلق آنکھ سے نہیں دل سے ہوتا  
ہے اور دل جب ایک بار کسی کے پاس چلا جائے  
تا تو اس پر وہی منظر، وہی کیفیت اور وقت ٹھہر جاتا  
ہے، پھر آنکھ کے سامنے جتنا بھی اچھا نظارہ ہو دل

کو وہ نہیں بھاتا، ایسا ہی معاملہ ارم آندھی کے  
ساتھ بھی تھا۔  
”السلام علیکم!“ اس نے شائستگی سے سلام  
کیا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ ماریہ نے زویا کی  
آنکھوں میں ارم کے لئے پسندیدگی کے رنگ  
دیکھ لئے تھے۔

”زویا آپ، بھائی..... آپ لوگ باتیں  
کریں میں آتی ہوں ابھی۔“ ارم آندھی نے کچھ  
ابھسن آہستہ نظروں سے ماریہ کو جاتے دیکھا۔

”فائن۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔  
”کیا کرتی ہیں آپ؟“ اس نے مردوتا  
پوچھ لیا، زویا کھل اٹھی۔

”میں ایم بی اے کر رہی ہوں، سیکنڈ سسٹر  
چل رہا ہے۔“ اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

”ایلیکٹرو ز!“ ارم آندھی نے موبائل  
کان کو لگایا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

”ڈیڈ نے تو کہا تھا ارم بہت فرینڈلی اور  
جولی ہے مگر یہ تو.....“ وہ اس کی پشت کو کھور کر رہ  
گئی۔

صرف دل داؤ پر لگایا تھا  
آپ نے جان ساتھ لے لی ہے  
وہ اپنے بیڈروم میں آگیا تھا، اس پارٹی  
کے حوالے سے کیا کچھ نہ سوچا تھا، اسے لگا تھا  
سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا جائے گا، مگر یہ غلط  
فہمی جلد دور ہوگئی کہ محبت کی راہوں میں ہر قدم پر  
ایک نئی آزمائش خطر ہوتی ہے۔

☆☆☆

از میر شاہ کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے نظر  
اپنے پہلو میں لگی، اپنی اس بے اختیار کیفیت پر وہ  
خفیف سا مسکرایا تھا۔  
”کتنی عادت ہوگئی ہے مجھے تمہاری اور اگر

کھل کر قبر پر گرنے لگے تھے، وہ ایک دم خوفزدہ ہو کر اٹھا تھا، درختوں پر بیٹھے اُلو بولنے لگے تھے، وہ بے لے ڈگ بھرتا ہوا قبرستان سے باہر نکل گیا اور پھر حویلی میں آ کر بی دم لیا۔

☆☆☆

وہ اماں کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی جب سامنے سے ارباز شاہ کی گاڑی گیٹ میں سے اندر داخل ہوئی، زرینہ شاہ، کا دل خوف سے کانپنے لگا تھا، انہوں نے خوفزدہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”اس..... لام علیکم!“ وہ قریب آئے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، شوق بھی ماں کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور آنے والے کو دیکھنے لگی، جبکہ ارباز شاہ لمحہ بھر کو اسے نا بھیجی کے عالم میں دیکھتے رہے۔

”بابا جان۔“ وہ بہت محبت سے ان کی طرف بڑھی تھی، قریب تھا کہ وہ ان کے سینے سے جا لگتی وہ دھاڑے۔

”رک جاؤ لڑکی۔“ اور اس کے ان کی طرف بڑھتے قدم وہیں رک گئے، اس نے مڑ کر اماں کی طرف دیکھا، جن کا دل خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔

”تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے پھنکارے۔

”بابا جان میں آپ کی بیٹی.....“

”مر گئی تھی میری بیٹی نو سال پہلے۔“ اسے لگا تھا چیت اس کے سر پر آگری ہو۔

”جس دن وہ کم بخت زدہ رہہ شاہ مری، اسی دن تمہاری لاش بھی اس گھر سے نکل گئی، تمام نحوست ایک ساتھ ختم۔“ ان کے لہجے کی حقارت، انہی انداز سے اندر سے مار رہا تھا۔

”جس کے ساتھ رات کی تاریکی میں

تمہارا بغیر.....“ اس سے آگے وہ سوچ ہی نہ سکا۔  
”مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے ساتھ کی عادت اتنی جان لیوا ہو گئی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، چند ٹاپے یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر ڈرینگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہو۔

”وقت کے ہاتھوں کون بچ سکا ہے بھلا۔“ اس نے ہاتھ کنپٹیوں کے سفید بالوں پر ہولے سے پھیرے۔

”کیا مجھے بابا جان سے ملنا چاہیے؟“ وہ کمرے کی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا جو کہ حویلی کے پچھلی جانب کھلتی تھی، چند ٹاپے وہ وہیں کھڑا رہا اور پھر فریش ہو کر حویلی سے باہر نکل کھڑا، اس کا رخ قبرستان کی طرف تھا، شام کا وقت تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، کسان گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

کسی کے ساتھ بیلوں کی جوڑی تھی تو کسی کے ہاتھوں میں کچھ سامان، وہ پیدل چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہوا تھا، دل کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

”زدہرہ شاہ۔“ قبر پر سختی دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا تھا، چاروں جانب سناٹا تھا، چپ کی گہری چادر پورے ماحول پر تنی تھی، ایسا ہی سناٹا اس کے اندر بھی تھا، کیونکہ ایک قبرستان اس کے سینے میں بھی تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا زدہرہ!“ وہ ڈمگماتے قدموں سے قبر کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور قبر کی مٹی کو دونوں ہاتھوں میں بھر لیا۔

”مجھ پر اعتبار تو کر کے دیکھتی میری جان آ کر دیکھو بی بی جان کتنی تنہا ہو گئی ہیں تمہارے جانے سے اور وہ..... وہ جنہوں نے تم پر ظلم کیے آج خود بھی نامراد ہیں، بے بسی کی عبرت کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے

اندر سے کوئی جواب نہ آرہا تھا۔  
تھک ہار کر وہ گیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گئی  
اور سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

”میرا قصور کیا ہے یہ تو بتا دیں بابا جان؟“  
وہ مسلسل رو رہی تھی مگر وہاں اسے چپ کر دینے  
والا کوئی نہ تھا، اسے کسی کھٹنے مڑ کر گئے تھے وہاں  
بیٹھے، شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے،  
اسے سر چھپانے کی فکر ہوئی، وہ اٹھ کھڑی ہوئی،  
دور سڑک پر گاڑی جا رہی تھی ”از میر شاہ!“ وہ  
گاڑی یقیناً اسی کی تھی، مگر وہ بہت تیزی سے اس  
سے دور جا رہی تھی، وہ بے بسی سے اسے خود سے  
دور جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

از میر شاہ اتنے لمبے سفر سے گھر پہنچا تو بہت  
تھکا ہوا تھا، دل بھی بہت بوجھل تھا۔  
وہ سیدھا بیڈ روم میں آیا تھا اور بیگ رکھ کر  
بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گیا، بہت دیر وہ  
اسی طرح لیٹا رہا، بہت کچھ ذہن میں چل رہا تھا۔  
”تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ شفق  
شاہ!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بغیر گھر اسے  
کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا، تم میری قانونی  
اور جائز بیوی ہو، تم سے محبت کر بیٹھا یہی میرا جرم  
تھا، تم کیوں مجھ سے اتنی دور چلی گئی۔“ اس نے  
اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔  
”کاش تم میری محبت کو کبھی سمجھ پاتی، کتنی  
پاکیزہ اور گہری محبت کی ہے میں نے تم سے۔“  
اس نے جیب میں سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے  
اسے شعلہ دکھایا۔

”میں نے تو تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا، میں  
تو صرف تمہیں دیتے رہنا چاہتا تھا کہ محبت کی  
سرشت میں یہ بات شامل ہے کہ یہ بناء کسی غرض

بھاگی تھی اسی کے پاس جاؤ، یہاں تمہارے لئے  
کوئی جگہ نہیں ہے۔“ وہ سنگدل سے بولے تو شفق  
شاہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔

”آپ نے میری شادی کی تھی ان کے  
ساتھ، میں بھاگی نہیں تھی۔“ وہ ضبط کے کڑے  
مراحل سے گزر رہی تھی۔

”از میر شاہ مجھے یہاں سے لے کر گئے  
تھے، کیونکہ ان کے بابا جان مجھے مارتا۔“

”مجھے تمہاری کہانیوں سے کوئی دلچسپی  
نہیں۔“ وہ آگے بڑھے اور اس کا بازو پکڑا ”نکل  
جاؤ میرے گھر سے“ وہ نفرت سے پھنکارے۔  
”اماں!“ اس نے مڑ کر ماں کی طرف  
دیکھا۔

”رک جاؤ ار باز شاہ۔“ ان کی ناگوں نے  
ان کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم چپ رہو، بے وقوف عورت۔“ وہ شفق  
شاہ کو بازو سے پکڑ کر زور سے گھسیٹتے ہوئے باہر کی  
طرف جارہے تھے۔

”ار باز شاہ میری بیٹی اتنے سالوں کے بعد  
آئی ہے، ابھی تو میری پیاسی متا سیراب بھی نہیں  
ہوئی، یہ ظلم مت کرو۔“ وہ روئی ہوئی پیچھے  
بھاگیں، مگر وہ اسے گیٹ تک لے آئے تھے۔

”بابا جان مجھے یوں گھر سے مت نکالیں،  
میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ سے بہت پیار کرتی  
ہوں۔“ وہ رو رہی تھی، مگر ار باز شاہ کے پتھر دل پر  
ذرا اثر نہ ہوا۔

”دوبارہ یہاں آئی تو جان سے مار دوں  
گا۔“ انہوں نے گیٹ کھول کر اسے باہر دھکا دیا۔  
”جان سے مار دیں مگر مجھے اپنے پاس

رہنے دیں بابا جان، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، میرا  
آخری سہارا ہیں آپ، یہ چمت مجھ سے مت  
چھینیں۔“ وہ گیٹ پر ہاتھ مار مار کر رو رہی تھی، مگر

تو اس کے پاؤں سے چلنے سے انکار کر دیا، یہ وہی حویلی تھی جہاں وہ صرف ایک رات گزار پائی تھی اور اگلے روز اسے وہاں سے بھی دھکا کر دیا تھا۔  
”مجھے نہیں جانا اندر۔“ اس کا دل زور سے چلایا۔

”تو پھر کہاں جاؤ گی؟“ دماغ نے فوراً سمجھانا چاہا۔  
”مجھے کہیں بھی نہیں جانا، نا بابا جان کی حویلی میں نہ شہر و شاہ کی حویلی میں روزانہ از میر شاہ کے گھر.....“ وہ وہاں سے مڑی اور قبرستان کی طرف چل دی۔

”آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ تلاش کرتی ہوئی زدہرہ شاہ کی قبر پر پہنچ گئی اور گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

”اگر آپ کا ایسا ارادہ تھا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں، اس دنیا میں رہنا بہت مشکل ہے، اس خاندان کے مردوں کا مقابلہ میں نہیں کر سکتی، میں بہت اکیلی ہوئی ہوں، از میر شاہ جو میرے سب سے بڑے خیر خواہ تھے وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔“ ہر طرف گہرا سناٹا تھا، رات کا وقت اور وہ تنہا قبرستان میں بیٹھی تھی۔

”شفق شاہ!“ وہ روتے روتے نڈھال ہو چکی تھی، جب اپنا نام سن کر جلدی سے اٹھی۔

”میں بی بی جان، از میر شاہ کی ماں۔“ وہ استغناء سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی جب وہ بولیں۔

”بی بی جان!“ وہ آگے بڑھی اور ان کے گلے لگ گئی۔

”میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں، میرے بابا جان نے مجھے دھکے دے کر حویلی سے نکال دیا، از میر شاہ مجھے یہاں چھوڑ کر شہر چلے گئے۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

اور مطلب کے صرف نوازنا جانتی ہے، مگر تم نے کیا کیا؟“ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا کش لگایا۔  
”اتنے سال بی بی جان میری جدائی میں، زدہرہ شاہ کے دکھ میں تنہا روٹی رہیں، اس وقت بھی وہ کتنی بڑی آزمائش سے گزر رہی ہیں، مگر میں ان کو تنہا چھوڑ آیا، ایک مرتبہ پھر۔“ وہ ایک کے بعد دوسری سگریٹ جلا رہا تھا۔  
”واپس آ جاؤ شفق شاہ! دیکھو تنہا رہے شاہ جی سوکنگ کر رہے ہیں، آ کر روک لو، ورنہ میں آج مر جاؤں گا، اسی سگریٹ کی طرح جل جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔“ کمرے میں ہر طرف سگریٹ کی پوری بوس گئی تھی، مگر اسے مطلق پرواہ نہ تھی، وہ آج خود کو مکمل تباہ کرنے پر تیار ہوا تھا۔  
اس کے موبائل پر کال آ رہی تھی، وہ لائق سا بیٹھا رہا، مگر جب دوسری بار کال آنے لگی تو اس نے دیکھا، انجان نمبر تھا، اس نے موبائل واپس رکھ دیا۔  
”مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔“ اس نے موبائل آف کر کے بیڈ پر اچھال دیا، ایک مرتبہ پھر وہ سگریٹ جلا رہا تھا۔  
”ہتا نہیں اس کے پیرش اس سے کس طرح ملے ہوں گے، اتنے سالوں بعد اسے سامنے دیکھ کر ان کی جانے کیا حالت ہوئی ہو گی۔“ ایک نئی سوچ اس کے ذہن میں ابھری۔  
”نہیں ایسا نہ ہو کر شفق شاہ کچھ ایسا دیا کہہ دے اور اس گے بابا اسے میرے ساتھ بھیجے سے انکار کر دیں، پھر بابا جان سے بھی تو ان کی بڑائی ہے۔“ اس بارے تو اس نے سوچا ہی نہ تھا اور اب جو دھیان اس طرف گیا تو دل کو فکر کے ساتھ بے چینی بھی لاحق ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے شہر زدہرہ شاہ کی حویلی میں قدم رکھا



”کاش میں بھی مر جاؤں۔“  
 ”خدا بخواتی۔“ انہوں نے اسے خود سے  
 الگ کیا اور انگلی اس کے منہ پر رکھ دی۔

”تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں نا تمہارے  
 ساتھ، از میر شاہ آفس کے کام کے لئے گیا ہے،  
 جلدی آئے گا، کہہ رہا تھا تم امتحان دے کر فارغ  
 ہو کچھ دن اپنی اماں کے پاس رہ لو۔“ اسے ساتھ  
 لے کر وہ باہر آئیں، مجاور کا شکر یہ ادا کیا جس نے  
 انہیں بتایا تھا کہ زوہرہ شاہ کی قبر پر کوئی لڑکی بیٹھی  
 زار و قطار رہی تھی۔

قبرستان کے باہر گاڑی میں ڈرائیور ان کا  
 منتظر تھا، وہ اسے سینے سے لگا کر حویلی لائی تھیں،  
 وہ اب کسی اور زوہرہ شاہ کو قبر میں اتارتا نہیں دیکھ  
 سکتی تھیں۔

☆☆☆

”میں نے تمہیں منع کیا تھا نا کہ وہ لڑکی  
 یہاں قدم بھی نہ رکھے، پھر تم نے اسے کیسے اندر  
 آنے دیا، میری اجازت کے بغیر۔“ زرمینہ شاہ  
 مسلسل آنسو بہا رہی تھیں اور وہ غصے میں ادھر  
 سے ادھر ٹہل رہے تھے۔

”آپ نے اچھا نہیں کیا؟“ وہ پہلی مرتبہ  
 بولیں۔

”اچھا! وہ اس کے سامنے آ کرے۔“

”اب یہ تم مجھے بتاؤ گی کہ میں کیا اچھا کرتا  
 ہوں اور کیا برا۔“ زرمینہ شاہ کو اس وقت ان کے  
 غصے کی کوئی پرواہ نہ تھی، ذہن میں تھا تو صرف یہ  
 کہ اتنے سالوں بعد بیٹی گھر آئی اور دھکے دے کر  
 نکال دی گئی۔

”بیٹیوں کی آہ بہت بری ہوتی ہے، سب  
 کچھ تباہ کر دیتی ہے، ڈرو اس وقت سے ار باز شاہ  
 جب تمہیں بنی کو آہ لگے۔“ ان کی زخمی مامتا آج  
 بے خوف ہو کر بول رہی تھی، ار باز شاہ لمحہ بھر کو

حیران رہ گئے، جو عورت آج تک ان کے سامنے  
 ”چلوں“ بھی نہ کر سکی، آج کیسے بول رہی تھی۔  
 ”کیوں بھاگی تھی یہ اس کے بھائی کے  
 ساتھ جس نے میرے نکاح میں آ کر خودکشی کر  
 لی، اتنی نفرت اسے مجھ سے تھی تو میری بیٹی بھی  
 اس کے بھائی کے ساتھ کیوں رہتی۔“ ان کے  
 دل کی بات زبان پر آئی گئی تھی۔

”وہ بھاگی نہیں تھی، اسے تو اس وقت نکاح  
 کے معنی بھی پتا نہ تھے، اسے جو میں نے اور از میر  
 شاہ نے کہا، اس نے مان لیا، وہ تو سوری تھی جب  
 از میر شاہ اسے لینے آیا تھا۔“

”بہر حال! تم دوبارہ اس سے ملنے اور  
 بات کرنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ تمہیں بھی نکال  
 دوں گا گھر سے۔“ انہوں نے دھمکی دی۔

”نکال دیں، جس گھر میں میری بیٹی کے  
 لئے جگہ نہیں ہے، وہاں رہ کر میں کیا کروں گی۔“  
 دوبارہ رونے لگی تھیں، ار باز شاہ لب بھینچے باہر نکل  
 گئے۔

☆☆☆

”مے آئی کم ان سر؟“ وہ فائل پر جھکا ہوا  
 تھا جب ارم آفندی کو سامنے دیکھ کر ایک جھلکے  
 سے سیدھا ہوا۔

”لیں!“ اپنے جذبات کو قابو کرتے  
 ہوئے، تاثرات کو حتی الامکان نارمل رکھ کر اس  
 نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اسے آنے کی اجازت  
 دی تھی، وہ اعتماد سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے  
 سامنے آ کھڑا ہوا۔

”بیٹھو۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا،  
 ارم آفندی عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تھنک یو۔“ دونوں کے درمیان خاموشی  
 حائل ہو گئی تھی اور اس خاموشی کو توڑنے کی دونوں  
 میں ہمت نہ ہو رہی تھی۔

”یار میں کوئی عورت تو ہوں نہیں جو تم مجھے Young کہہ کر خوش کر رہے ہو، دلیل تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں، ویسے شفق کا تو میں باپ ہی لگتا ہوں۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ ارسم آفندی کو سمجھ نہ آ رہی تھی کیسے اس سے انکسکیزو ذکرے۔

”آپ شفق سے خفایت ہوئے گا، میرے جذبے یکطرفہ ہیں بخدا وہ قطعی لاعلم تھی اور جب میں نے اس سے بات کی تو.....“

”ڈونٹ دری۔“ از میر شاہ نے بغور اس کے خفت آمیز چہرے کو دیکھا۔

”میں اسے تم سے بہت زیادہ جانتا ہوں، اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔“ ارسم آفندی جو یہاں آتے ہوئے دل میں ہزاروں سو سے ساتھ لایا تھا وہ سب از میر شاہ سے بات کر کے ختم ہو گئے تھے، وہ اس کی فراخ دلی پر دل ہی دل میں متاثر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”شفق کھانا کھا لو۔“ وہ پلیٹ میں چیچ گھما رہی تھی بی بی جان نے اسے پیار سے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے بی بی جان۔“ اس کا دل اماں کے لئے بہت پریشان تھا، اسے فکر تھی کہ اس کے آنے کے بعد بابا جان نے پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔

”کھانے سے منہ ہیں موڑتے تھے۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا اور وہ بھی ان کی محبت کے سامنے ہار گئی۔

”تم بالکل میری بیٹی کی طرح ہو، خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا۔“ انہوں نے اسے کھانا کھلایا اور اس کے اور از میر شاہ کے بیڈ روم میں اسے چھوڑ گئیں۔

وہ اندر داخل ہوئی تو دل میں ایک ٹیس سی

”بعض غلطیاں اتنی سنگین اور بڑی ہوتی ہیں کہ ان کے سامنے سوری کا لفظ بہت چھوٹا لگتا ہے، مگر.....“ از میر شاہ پیپر ویٹ کو ہاتھ سے گھماتے ہوئے اس کے چہرے کو فوکس کیے ہوئے تھا۔

”یہ پھر بھی بہت ضروری ہوتا ہے کہ اپنی غلطی کی معافی مانگ لی جائے۔“ نہ اس کی زبان لڑکھرائی اور نہ آواز کپکپائی، اس نے سلیقے سے اپنی بات مکمل کی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں، Belive me، مجھے یا میری بہن ماریہ کو قطعاً یہ پتا نہیں تھا کہ شفق میرڈ ہے، اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ آپ کی بیوی۔“

”بیوی نہیں۔“ از میر شاہ نے اس کی بات ٹوک کر کہا۔

”منکو۔“ ارسم آفندی نے کچھ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”It was just a forced”

”marriage۔“ وہ ابھی حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، جب از میر شاہ نے یہ انکشاف کیا۔

”ہمارا نکاح اس وقت ہوا جب اسے نکاح کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔“ از میر شاہ نے اس کا حیران شکل پر ایک نظر ڈالی اور انٹرکام اٹھالیا۔

”چائے یا کافی؟“ وہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں سر! تم مجھے انکل کہہ سکتے ہو، نو پرائلم۔“ زیر لب مسکراتے ہوئے وہ بولا تو ارسم آفندی کو شرمندگی نے آن گھیرا۔

”نہیں، آپ بالکل Young لگتے ہیں اور مجھ سے تو زیادہ ہیڈنم ہیں۔“ وہ شرمندگی چھپاتے ہوئے بولا۔

”ہا۔“ از میر شاہ نے ہلکا سا تہہ لگایا۔

انہی تھی۔  
”از میر شاہ اگر آپ نے بھی مجھے چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟“ وہ سب سبچ چلتی ہوئی بیڈ پر آ بیٹھی۔

”میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔“ اس کا دل بھرانے لگا تھا، وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔  
”اپنی محبتوں اور توجہ کا عادی بنا کر یوں انکسور مت کریں، آپ اتنے ظالم تو نہ تھے، آپ تو میری آنکھ میں ایک آنسو برداشت نہ کرتے تھے، پھر اب ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

اس نے اپنے پہلو میں خالی جگہ پر ہاتھ بھیرا تھا۔  
”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ سے کیا رشتہ ہے، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں میں آپ کے بغیر کچھ نہیں ہوں۔“ وہ سسک رہی تھی، آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے، مگر وہاں کوئی نہ تھا جو اسے چپ کر داتا۔

”اماں!“ جب دل کا درد حد سے بڑھ گیا تو وہ پھر سے اپنی ماں کو پکارنے لگی۔  
”اماں میں بہت اکیلی ہوئی ہوں، میرے پاس آ جائیں، مجھے اپنی آغوش میں چھپالیں، دنیا میں کوئی بھی آپ جیسا نہیں ہے، آپ کے جیسی سچی اور خالص محبت مجھ سے کوئی نہیں کرتا۔“ اسے خبر ہی نہ ہوئی روتے روتے اس کی کب آنکھ لگی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پھر تھا اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی، وہ کروٹ بدلتے ہوئے نظر اپنے سے کچھ فاصلے پر لیٹے از میر شاہ پر جا ٹھہری۔  
”یہ کب آئے؟“ اسے چرت ہوئی، رات جب وہ کمرے میں آ کر سوئی تھی تب تو وہ نہیں تھا۔

”السلام علیکم!“ از میر شاہ پہلے سے جاگ رہا تھا، اسے اچھے دیکھ کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ اس نے سر دھری سے جواب دیا اور اٹھ کر ایسی چیز پر جا بیٹھی از میر شاہ نے خاموشی سے اس کی اس حرکت کو دیکھا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

”کیا شکایتیں لگاتی ہیں بی بی جان کو میری؟“ وہ آنکھیں موندے بیٹھی رہی کوئی جواب نہ دیا۔

”تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ اٹھ کر اس کے سامنے چیئر پر آ بیٹھا اور بخور اس کی سوچی آنکھیں دیکھنے لگا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی سے آپ کی شکایت کروں۔“ اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”شفق میری ماں بہت دکھی عورت ہے، انہوں نے زندگی میں دکھ ہی دکھ اٹھائے ہیں، جوان بیٹی کی موت نے ان کی کمر توڑ دی ہے، مزید صدمے برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے ان میں، تمہارے اور میرے درمیان جو بھی معاملات ہوں، ان کی خبر کبھی بھی بی بی جان کو نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ آنکھیں پھاڑے غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”دکھوں کا حساب مت کریں از میر شاہ!“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں چھپا طنز از میر شاہ کو صاف محسوس ہوا۔

”آپ کی بہن اس دنیا سے چلی گئی، بہت بڑا غم ہے، آپ کی ماں اس کی قبر پر جاتی ہیں، فاتحہ خوانی کرتی ہیں، پھول ڈالتی صفائی کر داتی ہیں، اتنی اتنی دیر وہاں بیٹھی رہتی ہیں، ایک سہارا تو ہے نا، ایک آسرا تو ہے نا ان کے پاس، کہ یہاں میری بیٹی دفن ہے۔“ اس کا لہجہ پھینکنے لگا

تھا۔ ”کبھی میری ماں کی بد نصیبی پر غور کریں جنہوں نے اگلی اولاد کو کھودیا، ان کے پاس تو دل کی تسلی اور آخری آسے کے طور پر میری قبر بھی نہیں ہے۔“  
”خاموش شفق! پلیز چپ ہو جاؤ۔“ وہ زور سے چلا یا۔

”آپ کیوں لے کر گئے مجھے یہاں سے، مر جانے دیتے، زورہ شاہ کے ساتھ ایک اور قبر بن جاتی تو کون سی قیامت آتی تھی، میری ماں کو رونے کے لئے، دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے سہارا تو ملتا۔“ اس کی بات کے جواب میں وہ کچھ دیر بالکل خاموش رہا۔  
”تم فکر مت کرو، میں تمہیں تمہارے بابا کی حویلی لے کر جاؤں گا، ان سے بات کروں گا کہ کسی بھی بات میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔“  
شفق کا ٹوٹا ہوا انداز از میر شاہ کو بہت پریشان کر رہا تھا بالآخر وہ بولا۔

”مجھے نہیں جانا اب وہاں کبھی بھی۔“ وہ وہاں سے انھی اور بیڈ کی پائنتی جائیسی از میر شاہ اسے دیکھے گیا۔

”او کے ریلیکس!“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

”بی بی جان نے مجھے کال کی میں پہلی فلاحیت سے آ گیا۔“ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، جبکہ از میر شاہ مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا، وہ اب بھی خاموش تھی۔

”آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا، ڈونٹ وری۔“ وہ آگے بڑھا اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر نرم لہجے میں بولا۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔“ اس نے ایک

جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔  
”آپ مجھے یہ چھوٹی تسلیاں دینا بند کریں، مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے، دیکھ چکی ہوں میں آپ کو کبھی۔“ اس نے ایک غصیلی کاٹ دار نظر اس کی سمت اچھالی تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

”تم ریڈی ہو جاؤ ہم ساڑھے چار کی فلاحیت سے واپس جا رہے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔  
”مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ ہٹ دھری سے بولی۔

”آپ اگر واقعی میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو یہ کریں کہ زورہ شاہ کی قبر کے ساتھ ایک قبر اور کھدوا دیں اور۔۔۔۔۔“

”شفق!“ از میر شاہ یکدم کانپ اٹھا تھا۔  
”خاموش ہو جاؤ پلیز۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”ادھہ جانتی ہوں کتنی فکر ہے آپ کو میری۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے سر کر جھٹکا۔

”میری اگر کسی کو پرواہ ہے تو صرف میری ماں کو ہے اور کسی کو نہیں ہے۔“ وہ انھی اور بیڈ پر جا لیٹ گئی۔

”یہ غصہ تم اپنے بابا پر کر دو ٹھیک ہے، مجھے اگر تمہاری پرواہ نہ ہوتی تو بہت سال پہلے تمہیں چھوڑ دیتا۔“ از میر شاہ نے نمیسیر لہجے میں کہا۔

”احسان ہے آپ کا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا، لیکن تم مجھ سے بد گمان ہو چکی ہو تو اس لئے میری کسی بات پر یقین نہیں کرو گی، میں جانتا ہوں۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولا مگر شفق شاہ پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

”آپ مرد ہیں اور مرد کب ہار مانتے ہیں،

ہر صورت میں الزام عورت پر ہی دھرتے ہیں،  
اونہہ بدگمان۔“

”کہاں سے سیکھ لی ہیں یہ باتیں تم نے،  
میں نے تو یہ سب نہیں سکھایا تھا۔“ اس نے کوئی  
جواب نہ دیا، چار بجے کی فلائٹ سے وہ واپس آ  
گئے تھے، بی بی جان کے اصرار کے باوجود کبھی وہ  
بابا جان سے نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

از میر شاہ کچھ دیر بعد ہی آفس چلا گیا تھا،  
جبکہ وہ سو گئی تھی، دو گھنٹے بعد ہی اس کی واپسی ہو  
گئی تھی، کچھ دیر بیٹھا وہ اس کے جاننے کا انتظار  
کرتا رہا پھر خود بھی سو گیا، دن کچھ ڈھل رہا تھا،  
سائے سینے سینے چھوٹے ہونے لگے تھے جب  
از میر شاہ کی آنکھ کھل گئی۔

”شفق؟“ اس نے اسے جگانے کے لئے  
آواز دی۔

”شفق اٹھ جاؤ، بہت ٹائم سے سو رہی  
ہو۔“ اس نے شفق شاہ کا بازو ہلا کر اسے جگانا  
چاہا، اس نے تھوڑا سا کسمکس کر آنکھیں کھول دیں  
اور تانجی کے عالم میں از میر شاہ کی طرف دیکھنے  
لگی۔

”فریش ہو جاؤ، صبح سے کچھ نہیں کھایا تم  
نے، میں کھانا باہر سے لے آتا ہوں۔“ اس نے  
جواب دینے کی بجائے تکیہ اٹھا کر منہ پر رکھ لیا۔

”بہت سولیا ہے، چلو اب اچھے بچوں کی  
طرح اٹھ جاؤ۔“ از میر شاہ نے آگے بڑھ کر تکیہ  
اس لئے منہ سے ہٹایا، انداز ایسا تھا جیسے کوئی  
ناراضی بھی ہی نہیں۔

”آپ کو بھوک لگی ہے تو کھالیں کھانا، مجھے  
جب بھوک لگی میں کھالوں گی۔“ اس نے دوبارہ  
تکیہ منہ پر رکھنا چاہا۔

”اتنا زیادہ سونے سے طبیعت خراب ہو

جاتی ہے، اب اٹھ جاؤ۔“ وہ بھی اسے بخشنے کے  
موڈ میں نہ تھا۔

”میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے،  
میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی  
مگر موڈ ہنوز خراب تھا، زبردستی جگا دینے سے اس  
کا موڈ کچھ آف ہو گیا تھا، اس کی خفا خفا شکل از  
میر شاہ کو بہت پیاری لگ رہی تھی، وہ فریش  
ہونے چلا گیا۔

واپس آیا تو وہ اسی طرح بیٹھ ہوئی تھی۔  
”ریڈی ہو جاؤ، کھانا آج باہر کھاتے  
ہیں۔“ اس نے منٹوں میں پلان بنایا تھا، ادھر  
سے ابھی بھی کوئی جواب نہ آیا، وہ برش ڈرینگ  
ٹبل پر پھینک کر اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

”شفق میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“ اس  
کی مسلسل خاموشی نے از میر شاہ کو ابھادیا تھا۔

”تو مت کریں بات، کون فورس کر رہا  
ہے؟“ اس کی جانب دیکھے بنا وہ طنزیہ لہجے  
میں بولی تھی۔

”شفق!“ وہ بے یقینی سے اس کی طرف  
دیکھ رہا تھا۔

”میری کیا غلطی ہے، مجھ سے کیوں اس  
طرح۔“

”پلیز۔“ وہ زچ ہوئی۔

”فار گاڈ سیک، اب کوئی حساب کتاب  
مت کھول کر بیٹھ جائیے گا، مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں  
ہے آپ کی ان باتوں میں۔“ از میر شاہ بے یقینی  
کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آپ مجھے مزید بے وقوف نہیں بنا سکتے،  
اچھی طرح جان گئی ہوں آپ کو، آپ میرے بغیر  
کھانا بھی کھا سکتے ہیں اور مجھے نیچا دکھانے کے  
لئے میرے سامنے بیٹھ کر سوکنگ بھی کر سکتے  
ہیں، تو شوق سے کیجئے، میں اب آپ کو منح نہیں

ان کی بات سن کر ارم کو شرمندگی نے آن گھیرا۔  
 ”سوری بابا میں ابھی آ جاتا ہوں، دراصل  
 سر میں کچھ درد تھا۔“ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس  
 ہوا۔

”اٹس اوکے بیٹا، آپ ریٹ کرو، ڈونٹ  
 وری۔“ اس نے موبائل فون آف کر کے سائیڈ پر  
 رکھ دیا، دروازہ ناک ہوا تھا، وہ ڈھیلے ڈھالے  
 انداز میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، آنکھیں بند  
 تھیں۔

”لیس۔“ اس کے انداز نشست میں کوئی  
 فرق نہ آیا تھا، ہولے سے بولا۔

”ارم بیٹا!“ ماما کی آواز اس کی سماعتوں  
 سے ٹکرائی تو وہ ایک دم سیدھا ہوا تھا۔  
 ”جی ماما!“ اس نے خود کو سنبھال کر فریش  
 لہجے میں کہا۔

”آئیے بیٹھے پلیز۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”بیٹا ضویا تم سے ملنے آئی ہے۔“ انہوں  
 نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

”فارگا ڈسک ماما!“ اس نے دبا دبا احتجاج  
 کیا۔

”اس معاملے میں مجھے مجبور مت کیجئے گا،  
 ان فیکٹ میں ابھی ایسے کسی چکر میں نہیں پڑنا  
 چاہتا۔“ اس کی پیشانی پر پھیلتی لکیریں ماما کی  
 زیرک نگاہوں سے مخفی تو نہ تھیں، وہ لمحہ بھر کو  
 خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

”ضویا بہت اچھی لڑکی ہے۔“ ان سے  
 جیسے کوئی بات ہی نہ بن رہی تھی۔

”ہوگی۔“ اس کا موڈ آف ہو رہا تھا، بمشکل  
 ضبط کر کے بولا۔

”مگر فی الحال مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ  
 نہیں ہے، پلیز آپ اس بات کو سمجھیں ماما۔“ وہ  
 بغور اس کو دیکھ رہی تھیں، ایسا تو وہ کبھی نہ تھا،

کردی گی۔“ اسے حیرت میں مبتلا چھوڑ کر وہ اٹھ  
 کر باہر نکل گئی، جبکہ از میر شاہ سردنوں ہاتھوں  
 میں تمام کر دیں بیٹھا رہ گیا۔  
 ”اس قدر بدگمان ہے یہ مجھ سے، مجھے تو  
 اندازہ ہی نہ تھا۔“ وہ سوچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

ارم آندنی نے بابا کے ساتھ آفس جانا  
 شروع کر دیا تھا، وہ جتنا خود کو کام میں بڑی کرنے  
 کی کوشش کرتا وہ اتنی ہی شدت سے یاد آئے لگتی،  
 لاکھ دل کو سمجھاتا کہ وہ شادی شدہ ہے، اس کی بھی  
 نہیں ہو سکتی، مگر دل کب دلیلیں مانتا ہے۔  
 آفس میں بریک ٹائم تھا، وہ گھر آ گیا،  
 لاؤنج میں کافی شور تھا، وہ سیدھا اپنے بیدروم کی  
 جانب بڑھا۔

”ہیلو ارم!“ یہ زویا تھی، بابا کے دوست کی  
 بیٹی، ماما اور ماریہ اس سے باتوں میں مشغول  
 تھیں، اسے سامنے دیکھ کر اس نے خوشدلی سے  
 مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

”السلام علیکم!“ اس نے ماما کی طرف  
 دیکھتے ہوئے سلام کیا اور اپنے روم میں آ گیا،  
 ضویا کے ساتھ ساتھ ماما اور ماریہ نے بھی اس کے  
 غیر معمولی سنجیدہ رویے کو محسوس کیا۔

وہ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے موبائل  
 پر کال آنا شروع ہو گئی، بیدلی سے کوٹ کی  
 اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے موبائل  
 نکالا اور کال اٹینڈ کی۔

”کہاں ہو ارم، میں تمہارا ویٹ کر رہا  
 ہوں۔“ دوسری طرف پایا تھے۔

”میں تو گھر آ گیا ہوں بابا۔“ اسے کچھ  
 شرمندگی ہوئی۔

”سمال کرتے ہو یار، مجھے بتا کر تو جاتے،  
 میں ٹیبل پر چائے رکھ کر تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔“

الجمہا، جھنجھلایا اور خفا خفا سا۔

”او کے، ریلیکس۔“ اس کا شانہ تھپتھا کر وہ باہر نکل گئیں، وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔

☆☆☆

چکن سے برتنوں کے کھڑ پڑ کی آوازیں آ رہی تھیں، از میر شاہ وہیں آ گیا وہ شاید کچھ پکا رہی تھی، از میر شاہ کے لیوں کو مسکراہٹ چھوٹی۔  
”کیا بن رہا ہے؟“ وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، بازو سینے پر لپیٹے وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”واہ، مٹر پلاؤ۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے بولا، ادھر سے ابھی بھی جواب نہیں آیا تھا۔  
”دیے تم کافی سکھڑ نہیں ہوتی جا رہی؟“ اس کی مسلسل خاموشی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ نہایت دوستانہ انداز میں اس سے محو گفتگو تھا۔

”یہ سارا میری محبت کا اثر ہے۔“  
”بس ہر وقت اپنی تعریفیں، ادنہہ خوش فہمیاں۔“ اس نے بوڑھانے کے انداز میں کہتے ہوئے سر جھکا۔

”ہا ہا ہا۔“ از میر شاہ دل کھول کر ہنسا تھا۔  
”بالی دا وے یہ تمہارا بنایا ہوا مٹر پلاؤ کھائے گا کون؟ کسے اپنی صحت عزیز نہیں ہے۔“ اسے بولنے پر مجبور کرنے کے لئے وہ ایسی باتیں کر رہا تھا اور کسی حد تک کامیاب بھی تھا۔

”آپ کو تو کھانے کے لئے نہیں کہوں گی۔“ مصروف سے انداز میں وہ جل کر بولی۔  
”تو پھر کیا ہمسایوں میں باٹنا ہے۔“ وہ بات کو طول دے رہا تھا شفق شاہ خاموش رہی۔

”اچھا یہ تو بتا دو کہ اتنی زیادہ خفا کس بات پر ہو؟“ اس کی بات پر شفق شاہ نے دکھ کے عالم میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

”جہاں اپنی ناراضی کی وجہ خود بتانی پڑے، وہاں سامنے موجود شخص کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ اسے معاف کیا جائے۔“ وہ غصے سے بھرپور لہجے میں بولی۔

”اور میرا نہیں خیال کہ آپ کا حافظہ اتنا کمزور ہے۔“ وہ پلاؤ کو دم پر رکھ کر باہر نکل گئی، وہ بھی اس کے پیچھے آیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم کیوں خفا ہو، صرف ایک بار تصدیق چاہتا تھا۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی، از میر شاہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتی، ہم پہلے کی طرح اچھے دوست نہیں بن سکتے؟“ وہ سنجیدگی سے لمبیر لہجے میں بولا۔

”آپ نے بہت برا کیا ہے میرے ساتھ، مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماریہ کا بھائی.....“ تصدیقات ادھوری چھوڑ کر وہ سر جھکا کائے لب کاٹنے لگی تھی۔  
”شفق میں جانتا ہوں اس معاملے میں تم مکمل بے قصور ہو، اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ میں نے تم پر کوئی شک نہیں کیا، نہ ہی کوئی ایسی بات کہی ہے۔“ وہ سنجیدہ ہوا تھا۔

”آپ نے شک نہیں کیا مجھ پر؟“ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، اس نے رخ موڑ کر از میر شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ نے نہ صرف مجھ پر شک کیا بلکہ الزام بھی لگایا ہے مجھ پر، بھول گئے ابھی چند دن پہلے کی بات ہے، ہوٹل میں کیا کہا تھا آپ نے، میں مر کر بھی وہ سب نہیں بھول سکتی۔“ از میر شاہ خاموش ہو گیا تھا، جیسے اسے یاد آ گیا ہو کہ اس نے کیا کہا تھا۔

”میں اس وقت بہت پریشان تھا شفق، میں شرمندہ ہوں، میں نے جو کہا غلط کہا، تم مجھے

خالی مانگ نہیں لوٹایا جاتا۔“ وہ ابھی بھی خاموش تھے۔

”آپ کی بیوی ہمیشہ آپ کی فرمانبردار رہی، سانس بھی آپ سے پوچھ پوچھ کر لیا، کبھی کسی حکم سے انکار نہیں کیا، مگر اب.....“ ان کا سانس اٹکنے لگا تھا۔

”میرا دل بغاوت کرنے لگا ہے۔“ ارباز شاہ نے اس کو تنکیسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

”بغاوت کی سزا موت ہوتی ہے، جانتی ہو؟“ وہ خاردار لہجے میں بولے تھے۔

”ایک ماں آپ سے التجا کرتی ہے کہ۔“  
”بس.....!“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔

”اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ وہ دھاڑے۔

”میں نے کہا تھا کہ اس گھر میں اس کا نام بھی دوبارہ لیا تو تمہیں بھی نکال دوں گا یہاں سے۔“ وہ سفاکی سے بولے۔

”مجھ میں اوسہنے کی ہمت نہیں ہے، خدا کے لئے بس کر دیں۔“ وہ بے بسی سے بولیں، جبکہ ارباز شاہ بغور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

دل پہ یکطرفہ عذابوں کو اترتے دیکھا ہم نے چپ چاپ اسے خود سے بچھڑتے دیکھا رات کا وقت تھا، چار سو گہرا سناٹا تھا، سب گھر والے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، ارم آفندی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا، دل کی بے چینی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی، بالآخر وہ تیرس پر کھل آیا تاروں بھری رات خوب گہری اور سیاہ تھی۔

معاف کر دو۔“

”آپ کے معافی مانگ لینے سے میری تکلیف کم نہیں ہوتی، نہیں معاف کر سکتی میں آپ کو۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا تھا، وہ ابھی خاموش ہو گیا، جیسے جان گیا تھا کہ اس نے کتنا غلط کیا اس کے ساتھ، اب اس طرح معافی مانگ لینے سے اس کے اس درد کا مداوا تو نہیں ہوتا تھا تا، مگر اس کی ناراضی بھی وہ برداشت نہ کر پاتا تھا۔

”آپ چاہتے ہیں آپ کو معاف کر دوں، تاکہ آپ کے ضمیر پر اگر کوئی بوجھ ہے تو وہ ہلکا ہو جائے، مگر میرا کیا؟ میں جس آگ میں جل رہی ہوں، اور میرے نصیب میں تو دیے بھی جلنا اور در بدر ہونا ہی لکھا ہے۔“

”اگر مجھے معاف نہ کرنے سے تمہاری تکلیف کچھ کم ہوتی ہے تو تم مت کرو مجھے معاف۔“ اس نے کہا تو شفق شاہ نے کوئی جواب نہ دیا، از میر شاہ کا جی چاہا اسے حقیقت بتائے، اپنی محبت کی شدت کا احساس دلائے، مگر اس وقت وہ اس سے سخت ناراض تھی، کوئی بات سنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے کچھ بھی کہنے کا فائدہ نہ تھا، اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

”ارباز شاہ!“ وہ بہت دیر سے خاموش لپٹی چھت کی کڑیوں کو گھور رہی تھیں، ارباز شاہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا، مگر جواب نہیں دیا۔

”میں نے زندگی بھر آپ سے کچھ نہیں مانگا، آج پہلی بار آپ کے سامنے ہاتھ پھیلا رہی ہوں۔“ وہ بے تلے انداز میں بات کر رہی تھیں۔  
”اتنے سال آپ کی خدمت اور اطاعت کی ہے، اتنا تو کوئی ملازم بھی کر لے تو اس کو بھی



”زویا کو روکو، مت چلے ان راستوں پر،  
سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں ملتا۔“ اس کے  
لبھے کا کرب ماریہ سے مخفی نہ تھا۔

”میں روک سکتی تو آپ کو روک لیتی، پتا  
نہیں انسان کی یہ فطرت کیوں ہے، جس اذیت  
میں خود جتنا ہوتا ہے، کسی دوسرے کو بھی انہیں  
عذابوں میں دیکھ کر لمبی رحم نہیں آتا اسے۔“ وہ  
اس کی بات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”ماریہ مجھے سنبھلنے کے لئے کچھ وقت  
چاہیے، پلیز تم ماما اور بابا کو سمجھاؤ ابھی میں زویا یا  
کسی بھی اور لڑکی کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا  
چاہتا، تم کسی بھی طرح بات کو سنبھال لو۔“ اس  
کے انتحاری انداز پر ماریہ نے تاسف سے اسے  
دیکھ اور سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

”شام کو تیار رہنا، آج شاپنگ پر چلتے ہیں  
اور ساتھ ذرا لمبی باہر کریں گے۔“ از میر شاہ آفس  
جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا، وہ بیڈ پر بیٹھی تھی  
جب وہ اس کے پاس آکر بولے۔  
”مجھے نہیں جانا کہیں۔“ وہ روکھائی سے  
بولی۔

”تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے، آج  
دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں جاتی۔“ وہ لیپ ٹاپ  
بیگ میں ڈالتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈال کر  
بولا۔

”اگر آپ نے میرے ساتھ کسی بھی قسم کی  
زبردستی کی تو میں.....“ غصے سے اس کی رگیں تن  
گئی تھیں۔

”تو تم کیا کرو گی؟“ وہ عین اس کے  
سامنے آ بیٹھا۔

”اتنی ننھی سی چڑیا اور ایسی بڑی بڑی  
دھمکیاں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو شفق شاہ

”کاش تم اس دن ہمارے گھر نہ آتی  
شفق۔“ اس کی نظریں آسمان کی دستوں پر جمی  
ہوئی تھیں۔

”محبت بھی کیا چیز ہے، انسان کو کتنا بے بس  
کر دیتی ہے۔“ آسمان پر ستارہ ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں  
میں تقسیم ہوا تو اس کا دل بھی جیسے ٹکڑوں میں بننے  
لگا۔

ہوا کی سرسراہٹ دل کو بری طرح اداں کر  
رہی تھی، لان میں جا بجا لگے درخت ہل رہے  
تھے، ہوا اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی  
تھی۔

”اپنے قدم یہیں پر روکو تو بڑے نقصان  
سے بچ جاؤ گے۔“ کوئی اس کے اندر بولا تھا، اس  
کے منہ سے بے اختیار گہری سانس خارج ہوئی  
تھی۔

”جو انسان آپ کی محبت کی قدر نہیں کرتا،  
وہ اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ اس سے محبت کی  
جائے۔“ ماریہ کی آواز پر وہ لمحہ بھر کو چونکا ضرور مگر  
اس کے وجود میں جنبش تک نہ ہوئی۔

”وہ اس دنیا کی آخری لڑکی نہیں تھی، اس  
نے ہزار گنا اچھی لڑکیاں موجود ہیں مجھے تو زویا  
بہت.....“

”فار گاڈ سیک ماریہ!“ اس نے اسے بات  
بھی مکمل نہ کرنے دی اور چیخ اٹھا اس کے چہرے  
پر پھیلے اذیت کے اثرات وہ صاف دیکھ سکتی تھی۔

”ارسل بھائی خود کو اس مغرور لڑکی کے لئے  
مت توڑیں۔“ اس لمحے اسے شفق شاہ سے شدید  
نفرت محسوس ہوئی تھی۔

”چاہنے سے زیادہ چاہیے جانے کا احساس  
خوشگوار ہے، بھی غور کر کے دیکھیں، زویا کی  
آنکھیں پڑھیں وہاں آپ کی چاہت کے رنگ  
بہت واضح ہیں۔“

نے محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

”مبادا ارسم سن نہ لے۔“

”واقعی!“ انہیں اچنبھا ہوا۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”ماما اس نے بھائی سے شادی سے انکار کر دیا۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”کون ہے وہ لڑکی؟“ وہ متحسّس ہوئیں۔

”میری فریڈ شفق..... شفق شاہ۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”اچھا وہ۔“ انہوں نے وہ کھینچ کر لہا کیا۔

”وہ تو مجھے بھی بہت پیاری لگی تھی، مگر وہ

خاصی کم عمر ہے۔“ انہوں نے ماریہ کو دیکھا۔

”انکار کیوں کیا اس نے؟“ انہیں حیرت ہوئی تھی۔

”پتا نہیں، میں نے اس سے بات کی، اس نے بہت سختی سے منع کر دیا۔“ وہ اپنے بھائی سے بے پناہ محبت کرتی تھی، یہ سب کرنے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔

”ہو سکتا ہے شرمائی ہو۔“ انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

”ہے بی۔“ ماریہ نے بھی کہا۔

”ماما میں چاہتی ہوں آپ لوگ ایک دفعہ اس کے گھر جائیں، اس کے بابا سے بات کر کے دیکھیں، مگر بھائی کو مت بتائیے گا۔“

”اسی لئے ارسل چپ چپ رہنے لگا ہے، تمہارے پاپا بھی کہہ رہے تھے آفس میں بھی بہت سنجیدہ رہتا ہے، پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے میرا بچہ اتنا خوش باش رہتا تھا۔“ وہ پریشان ہو گئیں۔

”ماما آپ چاہیں تو ابھی بھی بھائی کو ان کی ہنسی لوٹا سکتے ہیں، بس ان کو بتائے بغیر شفق

کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”جانتی ہوں میں بھی سیڑیا اور آپ بہت طاقتور باز ہیں، جو بہت غرور ہے اپنے شکار پر جھٹتا ہے۔“ اس نے بے خونی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر طنز سے کہا۔

”اب تک سختی بار شکار کرتے دیکھا مجھے؟“ اس نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھائی تو وہ سنائے میں آگئی اور تیزی سے زاویہ نظر بدلا۔

”مجھے بحث نہیں کرنی آپ سے۔“ جیسے اس نے ہتھیار پھینکے تھے، کیونکہ وہ مقابل کے تیور دیکھ چکی تھی۔

”یہی ایک کام تو بہت لگن سے تم آج کل کر رہی ہو، بیویاں اپنے شوہروں کو دعائیں دے کر گھر سے رخصت کرتی ہیں اور تم طنز کے نشتروں سے سینہ چھلنی کر کے بھیجتی ہو، نا جانے کس جرم کی سزا ہے یہ۔“ اس لہجے میں یکدم اداسی عود کر آئی تھی۔

اللہ حافظ! وہ بیک اٹھا کر اور گاڑی کی چابی لے کر روم سے نکل گیا تھا، شفق شاہ کو اپنے رویے پر افسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

”ماما!“ وہ میگزین دیکھ رہی تھیں جب ماریہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

”جی!“ انہوں نے لمحہ بھر کے لئے میگزین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

”ایک بات کہوں؟“

”ہوں۔“

”بھائی کی شادی کر دیں۔“

”اے کوئی لڑکی پسند آئے تو، ہم تو تیار

ہیں۔“ انہوں نے میگزین بند کر دیا۔

”ماما بھائی کو ایک لڑکی پسند آئی تھی۔“ اس

اس پر اس کے غصے کا کوئی اثر نہ ہوا کھٹنگلی سے گویا ہوا۔

”نہیں چاہیے مجھے ایسی محبت۔“ وہ زچ ہوا۔

”تو پھر کیسی چاہیے! ارسم جیسی؟“ وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔  
”از میر!“ اسے اپنی ساعتوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

”دوبارہ ایسا کہا تو میں.....“  
”آپ کا سر پھاڑ دوں گی، اپنی جان دے دوں گی، دس اینڈ دیٹ۔“ استہزائے انداز میں کہہ کر مڑا اور کمرے کے بچوں بچ جا کر کھڑا ہو گیا اور نائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

”تو آج یہ بات کنفرم اور کلیئر ہو گئی کہ تمہیں میری محبت نہیں چاہیے۔“ وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔  
”آپ سے ایسی امید نہ تھی مجھے۔“ اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی تیرنے لگی تھی۔

”آپ کب ایک اچھے دوست سے روایتی شوہر بنے، مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔“ اس کی آواز کا پٹنے لگی تھی۔

”او کے میری بیوی کو میری ضرورت نہیں ہے، وہ میرے ساتھ چلنے میں شاید کوئی کومپلیکس قیل کرتی ہے، یہ بات میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“ اس کی بھیگی پلکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اجنبیت کی انتہاؤں پر تھا۔

”پھر کہتی ہو میں شک کرتا ہوں۔“  
”مجھے نہیں پتا آپ ایسا کیوں سوچنے لگے ہیں، مگر اس کی وجہ.....“

”وجہ جو بھی ہو، I have no interest۔“ گیٹ سے شاید کوئی گاڑی اندر داخل ہوئی تھی، اس پر ایک سرد نگاہ ڈال کر وہ باہر

کے گھر جا بیٹھا، اس کے بابا بہت اچھے ہیں، خدا کرے مان جائیں، پھر ہم بھائی کو سر پر اندر دیں گے۔“ اس نے پروگرام ترتیب دیا۔

☆☆☆

وہ سارا دن پریشان رہی تھی، شام کو از میر شاہ کی کال آئی جو کہ اس نے قصد ارسینو نہیں کی، مگر دل ہی دل میں وہ ڈر رہی تھی۔

”I am coming, get ready۔“ از میر شاہ کا میٹج آیا تھا، اس نے کچھ دیر سوچا اور موبائل سائیڈ نیبل پر رکھ کر لیٹ گئی اور سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

پورچ میں گاڑی کی آواز آئی تو اس نے بازو اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیا، از میر شاہ بیڈ روم میں داخل ہوا تو نظریں اس کے سوتے ہوئے وجود سے الجھ کر رہ گئیں۔

”شفق!“ وہ سیدھا اس کے پاس آیا اور آواز دینے لگا۔

”پہلے تو تم کبھی اس نام نہیں سوتی، اٹھ جاؤ۔“ اس کی نظر سائیڈ نیبل پر پڑے موبائل پر گئی، اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”حیرت ہے دس منٹ پہلے تم نے میٹج ریڈ کیا، اتنی جلدی اتنی گہری نیند میں کسے چلی گئی۔“ وہ اس کی چالاکی سمجھ گیا تھا، اس کی آنکھوں سے بازو ہٹایا مگر وہ واقعی سوتی ہوئی لگ رہی تھی۔

”تم جانتی ہو میں اب تم کو سونے نہیں دوں گا، شرافت سے اٹھ جاؤ۔“ اس نے شفق کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا۔

”کیا مصیبت ہے، اب میں اپنی مرضی سے سو بھی نہیں سکتی۔“ وہ غصے سے کہہ کر اٹھ بیٹھی۔

”مصیبت نہیں، اسے محبت کہتے ہیں۔“

رہے ہیں۔“ اس کی کیفیت سے یکسر انجان وہ اس کے پاس آکر بہت نارمل انداز سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں نہیں وہ گھٹیا ہے یا آپ میں EGO نام کو نہیں، ایک شخص بار بار آپ کی بیوی کو پر پوز کرتا ہے، بجائے اس کے آپ اس کو سبق سکھائیں سخت جواب دیں آپ خاموش رہتے ہیں، اسے میں کیا سمجھوں؟“ وہ درستی سے بولا۔

”بہت چاہتا ہے وہ تمہیں، بے حساب محبت کرتا ہے تم سے بالکل ویسی جیسی تم چاہتی ہو۔“ وہ طنز کے نشتر چھوڑ رہا تھا۔

”آپ دور ہو جائیں میری نظروں سے، نفرت محسوس ہو رہی ہے مجھے آپ سے، کیا سمجھا تھا آپ کو اور آپ کیا نکلے۔“ وہ نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”حیرت ہے الٹا چور کو توال کو ڈانٹے اور ہاں.....“ وہ دروازے کی جانب بڑھتا ہوا مڑا۔

”میری غیرت کو جگانے کی کوشش مت کرنا، ورنہ سب سے زیادہ نقصان تم دونوں کا ہی ہوگا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکائیں باہر نکلتا چلا گیا، جبکہ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

”ارسم!“ وہ آفس سے آیا تو اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا، جب ماما نے اسے آواز دے ڈالی۔

”جی ماما!“ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار واضح تھے، ماما اسے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ ”یہاں آؤ میرے پاس۔“ انہوں نے اسے پاس بلایا، وہ دیرے دیرے چلتا ہوا ان کے پاس جا بیٹھا۔

”کیا بات ہے، اتنے سنجیدہ کیوں ہو؟“ ان کی بات پر اس نے چونک کر فوراً ان کی طرف

نکل گیا تھا، ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔

”ارسم آفندی کے والدین آئے ہیں۔“ شفق شاہ کو ایسا لگا جیسے چھت اس کے اوپر آ رہی ہو، وہ ہونٹ بنی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے، تم بھی آ جاؤ۔“ اسے بتا کر وہ مڑنے لگا، اس کے لب بولنے کی خواہش میں ملنے لگے، مگر آواز نے ساتھ نہ دیا۔

”مجھے..... کسی سے..... نہیں..... ملنا۔“ اس نے پیشانی کو پونچھتے ہوئے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم ڈرائنگ روم میں آ رہی ہو، میں انکار نہیں سنوں گا۔“ حکم صادر کر کے وہ چلتا بنا، مرنی کیانہ کرنی کے مصداق وہ خود کو سمجھاتی ہوئی باہر نکلی۔

”دراصل شفق ہمیں بہت پسند ہے، ہم اسے بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔“ ارسم آفندی کی ماما بول رہی تھیں، از میر شاہ کی نظر میں دروازے کی سست اٹھی تھیں جہاں وہ کھڑی تھی، اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔

”ابھی شفق پڑھ رہی ہے، عمر بھی کم ہے تو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو شفق شاہ کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا، وہ ایک دم مڑی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے روم میں آ گئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی ارسم۔“ اس کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے، از میر شاہ کی جھپتی نظریں، استہزائیہ انداز، آنے والے وقت میں اس کا سامنا کرنے سے اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”تم اندر کیوں نہیں آئی، وہ لوگ تمہیں بلا

دیکھا تھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ماما۔“ وہ نگاہیں جراتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ انظروری انداز میں پاؤں سے کارپٹ پر ٹھوکر لگا رہا تھا۔

”کہو۔“ وہ ہر تن گوش تھیں۔

”میں پی ایچ ڈی کے لئے انگلینڈ جانے کا سوچ رہا ہوں۔“ اس کی بات سن کر وہ دھک سے رہ گئیں، ایسی تو امید انہیں نہ تھی۔

”فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔“ انہوں نے نچے تے انداز میں کہا تو وہ مارے استعجاب کے ان کو دیکھ کر رہ گیا۔

”کیا مطلب ماما! میں سمجھا نہیں۔“ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”وہ لڑکی تم میں ذرا بھی انٹرسٹڈ نہیں ہے ارسم، اس کے لئے خود کو برباد مت کرو۔“

”کون لڑکی، کس کی بات کر رہی ہیں آپ ماما؟“

”شفق۔“ انہوں نے ہل بھر کا توقف کیا، ارسم آفتدی کو لگا چھت اس پر آگری ہو۔

”ہم لوگ اس کے گھر گئے، اس نے اتنی بھی زحمت نہیں کی کہ سامنے آ کر سلام ہی کر لے۔“

”ماما!“ ارسم آفتدی کو ہزار والٹ کا کرنٹ لگا تھا، وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ کب گئیں اس کے گھر؟“ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”میں اور تمہارے پاپا آج گئے تھے اس کے گھر، بہت بے مروت اور بد لحاظ لڑکی ہے وہ، تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔“

”مامی مگڈ!“ اس نے سر ہٹا لیا۔

”آپ ایک دفعہ مجھ سے پوچھ تو لیتیں ماما۔“ مارے ٹینشن کے اس کا برا حال تھا۔

”بس بہت ہو گیا ارسم، میں دوبارہ اس لڑکی کا نام بھی نہیں سننا چاہتی اس گھر میں نہ ہی تمہیں اس بات کی اجازت دوں گی کہ تم اس کی خاطر پردیس کی خاک چھانو۔“ وہ چند ٹانچے کھڑا خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا، پھر واپس مڑا اور اپنے بیڈروم میں آ گیا، اسے ماریہ پر غصہ آ رہا تھا۔

”یقیناً یہ اسی کا کام تھا اور کون بتائے گا ماما کو۔“

☆☆☆

وہ گاؤں میں تھی، اس کی سب سہیلیاں اس کے ساتھ تھیں، رات کا وقت تھا اور وہ سب پگھٹت پر جمع تھیں۔

”تم کتنی خوبصورت ہو گئی ہو گڑیا۔“ ان میں سے ایک بولی۔

”خوبصورت تو یہ شروع سے ہی تھی اب شہری لگنے لگی ہے۔“ دوسری نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو ٹھیک کہتی ہے۔“ اچانک ہی موسم خراب ہونے لگا تھا۔

”میرا خیال ہے گھر چلنا چاہیے۔“ وہ ان سب کے جھرمٹ میں کچھ کہہ کر اس کی جاری تھی، وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیں، جبکہ وہ اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی، بارش برسنے لگی تھی۔

سامنے سڑک پر از میر شاہ کی گاڑی آرہی تھی، وہ تیز تیز چلنے لگی، اچانک بجلی چمکی اور چمک کر ان کی حویلی پر گری، زور دار دھماکہ ہوا اور آگ بھڑک اٹھی۔

”اماں!“ اس کے منہ سے زور دار چیخ

برآمد ہوئی۔

”اماں!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا شفق؟“ از میر شاہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟“ اس نے جلدی سے لائیٹ آن کی تھی۔

”بہت ڈراؤنا، سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔“ وہ کانپ رہی تھی، رنگت سروسوں کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

”ریلیکس! وہ صرف ایک خواب تھا۔“ از میر شاہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”مجھے اماں کے پاس جانا ہے، از میر میری اماں مجھے بلارہی ہیں، پلیز۔“ وہ رونے لگی تھی۔

”اس وقت ہم کسے جاسکتے ہیں، کل پرسوں چلیں گے، بی بی جان تھی ہمیں یاد کر رہی تھیں، کل فون پر بات ہوئی تھی۔“ اس کے رونے میں روانی آگئی تھی۔

”میں کل پرسوں تک انتظار نہیں کر سکتی، مجھے ابھی جانا ہے۔“ وہ بہت پریشان تھی اور اسی پریشانی میں وہ بھول گئی تھی کہ وہ از میر شاہ سے سخت ناراض تھی۔

”اوکے جج تو ہو جانے دو۔“ اسے روتے ہوئے دیکھ کر وہ ڈسٹرب ہونے لگا تھا۔

”پلیز مجھے لے جائیں اماں کے پاس، میں آپ کا یہ احسان نامریا درکھوں گی۔“ وہ اس کی منت کرنے لگی تھی، از میر شاہ کو اس پر ترس آنے لگا تھا، اسے سمجھ نہ آ رہی تھی اسے کسے چپ کروائے، کتنی دکھی ہو گئی تھی وہ، از میر شاہ کو اپنے رویے پر افسوس ہونے لگا، جی چاہا سب کچھ بھلا کر اسے پہلے کی طرح اپنے سائے میں لے لے، اپنی موجودگی ساتھ اور تحفظ کا مان دے کر

مضبوط کرے۔

”ٹھیک ہے، ہم کل ضرور جائیں گے، تم ابھی سو جاؤ، میں تم پر دم کر دیتا ہوں، تم دوبارہ نہیں ڈرو گی۔“ اس نے اسے زبردستی لٹا دیا تھا،

از میر شاہ کا ہاتھ ابھی بھی شفق شاہ کے ہاتھ میں تھا، سوتے ہوئے جب وہ رات کو ڈر جاتی تو از میر شاہ کا ہاتھ پکڑ کر سوتی تھی۔

”میری اماں بہت اکیلی ہیں، وہ میرے بغیر کیسے رہتی ہوں گی؟ اتنے سال انہوں نے میرے بغیر کیسے گزارے ہوں گے؟“ وہ ہولے ہولے بول رہی تھی۔

”میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے آؤں گی، ٹھیک ہے نا؟“ اس نے تائید طلب نظروں سے از میر شاہ کی جانب دیکھا جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

”شفق کیا سوچے گی میرے بارے میں کتنا برا ہوں میں۔“ تمام رات اسم آفندی نے آنکھوں میں کالی تھی، اسے کسی پل چین نصیب نہ ہو رہا تھا۔

”اور از میر شاہ بھائی کیا سوچیں گے، کتنا جھوٹا اور ڈرامے باز ہوں میں۔“ وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

”کل ہی جا کر معافی مانگوں گا، ساری حقیقت بتاؤں گا۔“ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

”مگر کیا وہ میری بات پر یقین کریں گے؟“ اگلے ہی لمحے ایک نیا سوال اٹھا اور اسے بے چین کر دیتا۔

”ماریہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ اپنے روم سے نکلا اور ماریہ کے روم میں آگیا، وہ سکون سے سو رہی تھی۔

”کبھی میں بھی ایسے سکون اور بے فکری کی  
نہند سوتا تھا۔“ اس نے رشک سے ماریہ کو دیکھا  
اور واپس اپنے روم میں آگیا۔

”کاش شفق تم میری نہ ہوتی، تو میں زمانے  
سے تمہیں چھین لیتا، مگر.....“ اس نے ایک بوجھل  
حسرت زدہ سانس خارج کی۔

وہ طے تو کوئی مرض نہیں  
نہ طے تو کوئی دوا نہیں  
وہ لیٹ گیا، مگر یہ تو وہ جانتا تھا نیند اب اس  
کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ سو کر اٹھی تو پہلا خیال ذہن میں رات  
والے خواب کا آیا۔

”کتنا برا خواب تھا۔“ اس نے جھرجھری لی  
اور اٹھ کر دواش روم چلی گئی، از میر شاہ اسے کہیں  
نظر نہ آیا۔

”اودہ مائی گاؤ! انا لند وانا علیہ راجعون۔“ از  
میر شاہ نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

”بہت برا ہوا لی بی جان۔“ اس کی آواز  
باہر نکلی شفق شاہ کے کانوں سے نگرانی تو وہیں دل  
تھاے کھڑی رہ گئی۔

”میں اسے کیسے بتاؤں؟“ وہ بہت پریشانی  
کے عالم میں مڑا اور اپنے سامنے شفق شاہ کو دیکھ کر  
گھبرا سا گیا۔

”بی بی جان میں بعد میں بات کرتا ہوں۔“  
اس نے موبائل کان سے ہٹایا اور چلتا ہوا اس  
کے قریب آ کر۔

”سب نے ایک دن چلے جانا ہے شفق۔“  
اس نے ہمدرد لہجے میں نرمی سے کہا۔

”نہیں!“ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔  
”ایسا کچھ مت کہیے گا جو میں برداشت نہ کر  
پاؤں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے منع

کیا۔

”انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔“  
اس نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں کے حصار  
میں لے لیا۔

”میری اماں چلی گئیں، از میر وہ مجھے رات  
بلا رہی تھیں۔“ وہ خشک پتے کی مانند کانپ رہی  
تھی، از میر شاہ نے اس کا سر تھپتھپایا۔

”وہ نہیں جاسکتیں، وہ مجھے ایسے اکیلے چھوڑ  
کر کیسے جاسکتی ہیں۔“ وہ اس سے الگ ہو کر  
کھڑی ہو گئی تھی۔

”اماں!“ وہ بھاگ کر اندر چلی گئی تھی، از  
میر شاہ فوراً اس کے پیچھے آیا تھا۔

”مجھے اماں کے پاس جانا ہے شاہ جی۔“ از  
میر شاہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”ابھی اسی وقت جانا ہے، وہ رات مجھے  
بکارتی رہیں، وہ مجھے بلا رہی تھیں، میں اپنی ماں  
کی مجرم ہوں، کیوں لائے تھے مجھے یہاں، ان  
کے پاس رہنے دیتے، کچھ وقت تو گزار لیتی ان  
کے ساتھ۔“ وہ دھڑکیں مار مار کر رو رہی تھی۔

”میں خالی ہاتھ رہ گئی، میرے سر سے سایہ  
ہٹ گیا، میری مہربان ٹھنڈی چھاؤں مجھ سے دور  
چلی گئی، ابھی تو ہم نے جی بھر کر باتیں بھی نہ کی  
تھیں۔“ وہ زور زور سے کھانسنے لگی تھی، از  
میر شاہ جلدی سے پانی لے آیا۔

”میں کیسے زندہ رہوں گی شاہ جی، آج تک  
ان سے ملنے کی امید پر زندہ تھی، میرے جینے کا  
مقصد ختم ہو گیا، مجھے بھی ان کے ساتھ دفن ہونا  
ہے۔“ اس نے اسے رونے دیا تھا، اس طرح  
اس کے دکھ کا کچھ کٹھارس ہو جاتا۔

☆☆☆

ارسل معمول سے کچھ پہلے گھر سے نکلا تھا،  
اس کا ارادہ شفق شاہ کے گھر جا کر ان دونوں کو

حقیقت بتانے کا تھا۔  
نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے سیدھے الفاظ میں کہہ دیا۔

”جی پاپا!“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
”بہت اچھا خیال ہے، میں خود بھی چاہتا ہوں۔“ اسے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی ہوئی تھی، وہ تو سمجھ رہا تھا اسے ڈانٹ پڑے گی مگر پاپا نے ہمیشہ کی طرح اس کا مان رکھا وہ مطمئن سا وہاں سے اٹھا تھا۔

☆☆☆

از میر شاہ کی ہمراہی میں چلتی ہوئی وہ حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی، سارا راستہ وہ روتی رہی تھی اور از میر شاہ نے بھی اسے چپ نہیں کر دیا تھا، وہ چاہتا تھا اس کے حویلی پہنچنے سے پہلے اندر کا غبار اور دکھ کچھ حد تک آنسوؤں کے راستے اندر سے نکل جائے۔

”رک جاؤ یہیں پر۔“ حویلی کے وسیع و عریض صحن میں چارپائی پڑی تھی، گاؤں کی عورتوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، مگر زرینہ شاہ کے لئے آنسو بہاتے کوئی دکھائی نہ دیا۔

”بابا!“ انہیں سامنے دیکھ کر اس کے بے چین آنسو پھر سے نکل کر گالوں پر بہہ نکلے تھے۔  
”منع کیا تھا نا کہ یہاں نہیں آنا، کیوں آئی ہو؟“ از میر شاہ کو اسی استقبال کی امید تھی، اس نے تاسف سے ارباز شاہ کے سفاک روپ کو دیکھا۔

”میری اماں!“ اس کا جی چاہا ان کے سینے پر سر رکھ کر خوب روئے، الفاظ کہیں کم ہو گئے تھے، وہ بس ان کی طرف دیکھے گئی۔

”مرگئی وہ زہر کھالیا اس نے، قصہ ختم، اب نکلو یہاں سے۔“ انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر گیٹ کی طرف دھکیلا۔

”چھوڑو اس کا تھا۔“ از میر شاہ نے آگے

”ارسل ناشتہ تو کرتے جاؤ۔“ اسے باہر کی جانب بڑھتا دیکھ کر مانا نے پکارا۔  
”بھوک نہیں ہے مانا۔“ وہ ان کی طرف دیکھے بنا ہار نکل گیا۔  
”کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو، میں اسے ایسا بے وقوف نہیں سمجھتی تھی۔“ پاپا اور ماریہ میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ارسل کافی تیز ڈرائیونگ کر کے ان کے گھر پہنچا تھا، مگر یہ کیا، گیٹ پر لگا تالہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔  
”مائی گاڈ!“ اس نے سر اسٹیرنگ وینل پر ٹکادیا۔

”کہاں چلے گئے یہ لوگ، کہیں از میر شاہ نے.....“ اس سے آگے وہ سوچ ہی نہ سکا۔  
”نہیں نہیں وہ ایسے نہیں ہیں، پھر کہاں جا سکتے ہیں؟“ وہ کچھ دیر خاموشی سے وہیں بیٹھا رہا۔

”کاش شفق تم ابھی اندر سے نکلو اور مجھ سے ہنستے ہوئے کہو کہ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا، میں تو ہمیشہ سے تمہاری مٹی اور تمہاری رہوں گی۔“ اپنے خیال پر وہ خود ہی ہنس دیا۔  
”واہ رے دل خوش فہم۔“ اس نے گاڑی اشارت کی اور آفس آ گیا۔

”ارسم میرے آفس میں آنا۔“ ابھی وہ آفس میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے پاپا کی کال آ گئی، وہ سیدھا ان کے پاس گیا۔  
”السلام علیکم!“ اس نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام بیٹھو۔“ انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا۔  
”تم پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہو؟“ انہوں



بڑھ کر اس کا ہاتھ ارباز شاہ کی گرفت سے آزار کروایا۔

”چلے جاؤ اسے یہاں سے کر، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”اس کی ماں ہے، آخری دیدار تو کر لینے دو ظالم انسان۔“ از میر شاہ کو طیش آیا، کہے بتا نہ رہ سکا۔

”اگلے ایک منٹ میں باہر نہ نکلے تو گولی مروا دوں گا دونوں کو، ساجد۔“ اس نے اپنے خاص بندے کو آواز دی۔

”جی سرکار!“ وہ لمحوں میں حاضر ہو گیا، ہاتھ میں بندوق تھی، صحن لوگوں سے بھرا ہوا، شور یکا یک مٹ گیا، ہر کوئی حیرت سے انگلیاں دانتوں میں دبائے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ دونوں ایک منٹ میں باہر نہ نکلیں تو گولی مار کے لائیں باہر پھینکوا دیتا۔“ حکم صادر کر کے وہ باہر نکل گیا، حویلی میں اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”خدا کے لئے مجھے آخری بار ان کا منہ دیکھنے دو، میں کب سے پھنسی ہوئی ہوں ان سے، مجھ پر یہ ظلم نہ کرو، وہ ہمیشہ کے لئے جارہی ہیں۔“ وہ ساجد کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

”دیکھو لڑکی میرے لئے ناممکن ہے، تم جاؤ باہر۔“ درستی سے بولا۔

”مجھے اماں کو دیکھنا ہے، مارنا ہے تو بار دو۔“ وہ صحن میں اس طرف بڑھی جدھر چارپائی پڑی تھی، ساجد نے بندوق سیدھی کی۔

”شفق رک جاؤ۔“ از میر شاہ نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا اور تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔

”مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا، مجھے پہلے بھی یہاں سے دھکے دے کر نکالا گیا تھا میں آج

تک پہنچتی رہی ہوں کہ اماں کو چھوڑ کر کیوں گئی، یہیں ان کے پاس مرجاتی، آج مجھے مت لے کر جائیں۔“ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی، مگر کامیاب نہ ہو سکی، از میر شاہ نے حویلی کال کر دی تھی، ڈرائیور بھیج گیا تھا۔

”تمہیں کچھ ہوا تو تمہاری اماں کو قبر میں بھی تکلیف ہوگی، چلو شاباش گاڑی میں بیٹھو۔“ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اسے ہاتھ پکڑ کر اندر بٹھایا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔

”شفق!“ بی بی گیٹ پر ہی ان کی منتظر تھیں، وہ ڈمگاتے قدموں سے از میر شاہ کی بانہوں کے حلقے میں چلتی ہوئی ان کی جانب بڑھی۔

”بی بی جان!“ اس کا تنفس تیز ہونے لگا، بی بی جان نے بازو پھیلا دیئے۔

”اماں!“ وہ ان کے سینے سے جاگلی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی، بی بی جان بھی رو رہی تھیں۔

”ارے از میر شاہ دیکھنا اسے کیا ہو گیا۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا، وہ اس کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گئی۔

☆☆☆

انہیں ایک ہفتہ ہو گیا تھا وہاں آئے ہوئے، شفق شاہ کی طبیعت بہت مشکل سے سنبھل تھی، وہ بار بار رونے لگتی تھی، بی بی جان اس سے بہت پیار کرتیں اس کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھیں، مگر وہ خاموش ہی رہتی، وہ دونوں اسے بلانے کی بہت کوشش کرتے مگر وہ ”ہوں“ ”ہاں“ سے زیادہ جواب نہ دیتی۔

”شفق!“ وہ لوگ سونے کے لئے لیٹے تھے، جب از میر شاہ نے اسے پکارا۔

”جی!“ وہ اس کی طرف سے رخ بدلے

”بی بی جان فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے، اللہ حافظ۔“ شفق شاہ ان سے مل کر از میر شاہ کے ساتھ چلتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی، ڈرائیور نے ان کے بیٹھے ہی گاڑی چلا دی۔

☆☆☆

”آپ مجھ سے ناراض ہیں ارسم بھائی؟“ وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے آئس کا کام کر رہا تھا جب ماریہ اس کے روم میں آئی، اس نے پل بھر کے لئے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میں جانتی ہوں آپ ناراض ہیں مجھ سے، بٹ بلیو می میرا کوئی غلط مقصد تو نہیں تھا، میں نے سوچا تھا کہ شفق سے آپ کا رشتہ طے ہو جائے گا تو آپ خوش ہوں گے، میں تو آپ کو سر پر ایئر دینا چاہتی تھی۔“ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھی، اس کی ناراضی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

”جہیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا ماما کو بتانے سے پہلے۔“  
”مجھ سے غلطی ہو گئی، آئے ایم سوری۔“ وہ لجاجت سے بولی۔

”اٹس اوکے، ڈونٹ وری میں ناراض نہیں ہوں تم سے۔“ اس نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”آپ کہیں نہیں جائیں گے، ماما اتنی پریشان ہیں، میں کیسے رہوں گی آپ کے بغیر۔“  
”ماریہ میری خواہش ہے پی ایچ ڈی کروں، پلیز تم لوگ مجھے سپورٹ کرو، نہ کہ ایسے کہہ کر پریشان۔“ اس نے پیار سے اسے سمجھانا چاہا، مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔  
”یہ سب آپ اس شفق.....“

لیٹی ہوئی تھی، ہولے سے جواب دیا، جانے کس سوچ میں تھی۔  
”کہیے، میں سن رہی ہوں۔“ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

”ایسے نہیں، میری طرف دیکھو۔“ وہ اپنی ضد پر قائم رہا، اس نے بھی بحث کرنی چھوڑ دی تھی، رخ بدل کر منہ اس کی طرف کر لیا، بولی کچھ نہیں۔

”ہم واپس گھر چلیں؟“ وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا، مبادا وہ برامان جائے۔  
”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس کے منہ سے سکسکاری نکلی۔

”اگر تم ابھی نہیں جانا چاہتی تو کچھ دن رہ لو یہاں بی بی جان کے ساتھ تمہارا دل بہل جائے گا، وہاں میں آئس چلا جاؤں گا تو تم گھر پر اکیلی گھبراؤ گی۔“ از میر شاہ نے نرمی سے کہا۔

”میرا دل نہ یہاں پہلے گا، نہ وہاں اور میں پہلے بھی اکیلی تھی، بلکہ میں تو ہمیشہ سے اکیلی ہوں۔“ اس کی بات پر وہ خاموش ہو گیا تھا، بعض دکھ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ الفاظ کا مداوا نہیں کر پاتے، انسان کو سمجھ ہی نہیں آتی کہ کیا بولے۔

شام تک وہ لوگ واپس جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

”از میر!“ جانے سے پہلے وہ بی بی جان سے ملنے لگا تو وہ بھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”بی بی جان جو کام میرے لئے ممکن نہیں ہے وہ کرنے کو مجھے مت کہیں۔“ وہ ان کے کہے بنائے سمجھ گیا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں، اسی لئے ان کو پہلے ہی روک دیا۔

”ان کی حالت تو دیکھو، جانے کب چل دیں۔“ وہ رونے لگی تھیں۔

”ماریہ!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔

”بہتر ہوگا اگر ہم دوبارہ اس کے بارے میں بات نہ کریں۔“ ماریہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

”آئے ایم سوری بھائی۔“ وہ نچل ہوئی۔

”بہت دنوں سے ہم باہر نہیں گئے، کیا خیال ہے کوئی پروگرام بنائیں؟“ ارسل بہت پریشان تھا، مگر یہ پریشانی وہ اب ماریہ سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ ہر روز شفق شاہ کے گھر جاتا اور ہند گیٹ کو دیکھ کر واپس آ جاتا۔

”ہاں بناتے ہیں پروگرام، جب تم کہو لے جاؤں گا۔“ اس نے فوراً کہا۔

”تھینک یو بھائی!“ وہ خوش خوش باہر نکل گئی، ارسل آفندی نے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

وقت جتنا بھی گہرا گھاؤ لگائے، مگر انسان کو مبر کرنا پڑتا ہے، مبر نہ کرے تو خود بخود صبر آ جاتا ہے، وہ بھی کچھ سنبھل گئی تھی، مگر ایک خلیج تھی جو ان دونوں کے درمیان حاصل ہو گئی تھی۔

اس کا رزلٹ آ گیا تھا اور ہر کلاس کی طرح اس نے اب بھی بہت اچھے مارکس لئے تھے، از میر شاہ آفس سے جلدی آ گیا تھا اور ساتھ میں کافی کچھ کھانے کو لایا تھا۔

”آگے کیا کرنے کا پلان ہے شفق؟“ وہ دونوں چائے پی رہے تھے، لان میں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے گلاب کے پودے کو نوکس کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔“

”مجھے مزید نہیں پڑھنا۔“ اس کی بات پر وہ خاموشی سے اسے دیکھتا تھا۔

اسے ایسی امید اس سے ہرگز نہ تھی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ بہت سارا پڑھنا چاہتی تھی، آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

”تمہیں تو بہت سارا پڑھنا تھا شفق! پھر

اب ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟“ وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ مسلسل انکاری تھی، از میر شاہ خاموش ہو گیا۔

گیٹ کھلا تھا اور ارسل آفندی اندر آ گیا، شفق شاہ کی اس پر نظر پڑی تھی۔

”تم!“ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی، از میر شاہ کی گیٹ کی طرف بیک سائیڈ تھی، اس نے مڑ کر دیکھا۔

”اوہ!“ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”شفق ریلیکس۔“ وہ اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھنا چاہتا تھا، مگر اس کے گہڑے تیرور اسے پریشان کرنے لگے۔

”السلام علیکم!“ وہ ان کے قریب پہنچا اور سلام کیا۔

”ذلیل انسان، تمہیں شرم نہیں آتی۔“ اس

نے آگے بڑھ کر ارسل آفندی کا کر بیان پکڑ لیا۔

”شفق ڈونٹ بی سلی۔“ از میر شاہ نے آگے بڑھ کر اسے چمڑوانا چاہا۔

”آپ ہٹ جائیں، مجھے آج بات کرنے

دیں اس سے۔“ ارسل آفندی کا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا، وہ مجرموں کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

”بہت برداشت کر لیا میں نے، اب اگر

میرے گھر کا گیٹ کراس کیا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گی۔“ وہ عیش و غضب کا شکار ہو کر بولی تھی۔

مگر اس راز کو سینے میں چھپا کر رکھا ہوا ہے اس نے۔“ وہ بے یقینی سے از میر شاہ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو، یا پھر وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں بھرتی زندگی کی شمع کو از میر شاہ نے پھر سے جگمگاتے دیکھا تھا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”وہ ایسی نہیں ہے، آپ ان پر شک مت کریں۔“ اس کی بات پر از میر شاہ زیر لب مسکرا دیا۔

”وہ کیسی ہے، یہ تم مجھے مت بتاؤ، میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں، ہر بینڈ کے علاوہ میرا اس سے ہر رشتہ ہے۔“ ارسل آفندی کو کچھ سمجھ نہ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”میں آپ سے کس طرح معافی مانگوں؟“  
 ”اس کی ضرورت نہیں ہے، تم کل میرے آفس آنا، مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔“ ارسل آفندی نے اثبات میں سر ہلایا، کچھ دیر وہ وہیں بیٹھا رہا اور پھر چلا گیا، از میر شاہ اٹھ کر اندر آ گیا، جہاں شفق شاہ بڑے موڈ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

☆☆☆

”س.....عی.....دہ.....“ شہروز احمر شاہ کو پیاس لگی ہوئی تھی، سعیدہ شاہ کافی دیر سے نظر نہ آ رہی تھیں، زبان نے بھی کافی عرصے سے ساتھ چھوڑ دیا تھا، بے بسی کی حالت میں بستر پر لیٹے وہ اپنے ماضی کی فلم کو ذہن کے پردے پر دیکھ رہے تھے۔

”کتنے ظلم کیے میں نے، ساری زندگی کوئی ایک نیکی کا کام نہیں کیا۔“ ان کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔

”کیا مجھے معافی ملے گی؟“ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، اسی وقت سعیدہ شاہ

”آپ جو چاہے کہیں، آپ حق بجانب ہیں، مگر صرف ایک مرتبہ میری بات.....“  
 ”کچھ نہیں سننا مجھے، آپ کو شرم آئی چاہیے مجھے سمجھ نہیں آتی کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں، میں نے کیا غلطی کی ہے۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا تھا۔  
 ”بلیوی مجھے تو.....“

”بس کریں کتنے جھوٹ بولیں گے، میں آج آخری بار کہہ رہی ہوں دوبارہ کچھ ایسا ہوا تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں اور تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

جبکہ وہ حسرت زدہ نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتا رہا، اس لمحے از میر شاہ کو ادراک ہوا کہ وہ اسے کتنا چاہتا ہے، اس کے چہرے کا رنگ ایسا ہو رہا تھا جیسے بستر مرگ پر آخری سانس لیتے مریض کا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ از میر شاہ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ جیسے ہوش کی دنیا میں آیا۔

”میرا یقین کریں ماما مجھے بتائے بغیر یہاں آئیں تھیں، اگر مجھے پتا ہوتا تو.....“  
 ”ڈونٹ وری، میں جانتا ہوں تم ایک اچھے لڑکے ہو۔“ اس کو ہاتھ سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے وہ بولا تھا، وہ نگاہیں جھکا گیا۔

”کتنا چاہتے ہو اسے؟“ وہ اس کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا تو اس نے تیزی سے سر اوڑھ لیا۔

”پلیز مجھے معاف کر دیں، میں جانتا ہوں آپ میرا یقین نہیں کریں گے مگر.....“ وہ ایک مرتبہ پھر نگاہ جھکا گیا۔  
 ”مجھے ایسا لگتا ہے وہ بھی تمہیں چاہتی ہے،

کمرے میں داخل ہوئیں۔

”شاہ صاحب کیا ہوا؟“ وہ تیزی سے ان کے قریب آئی تھیں۔

”آپ رو رہے ہیں؟“ انہیں روتا دیکھ کر ان کا دل شکنے لگا تھا، وہ جان گئی تھیں یہ آنسو ندامت اور پچھتاوے کے ہیں، ان جیسے پتھر کو اس طرح پچھلنا دیکھ کر ان کے دل کی حالت بھی غیر ہونے لگی تھی۔

جب کوئی پودا لوٹتا ہے تو کوئی متوجہ نہیں ہوتا، مگر جب کوئی بہت بڑا درخت گرتا ہے تو بہت زیادہ شور پیدا ہوتا ہے، چھوٹے سے بلبل کی موت اتنا حیران نہیں کرتی جتنا کسی عقاب کو مردہ دیکھ کر انسان لہجہ لہجہ کرک کر دیکھتا ہے۔

شہر و ازہر شاہ، جیسے پتھر دل اور خالم انسان کی اس حالت پر بھی سیدہ شاہ دن رات کڑھتی تھیں، مگر وقت اور تقدیر کے فیصلوں کے سامنے انسان بے بس ہے، ایک وقت انسان کے ظلم کرنے کا ہوتا ہے تو دوسرا اس کا خمیازہ بھگتنے کا۔

☆☆☆

وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی، ازہر شاہ بیڈکراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا، مگر اس کا دھیان مسلسل اسی کی طرف تھا۔

وہ بہت یکسوئی سے بیٹھی تھی، اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ ازہر شاہ کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔

”کاش تم صرف میری ہوتی۔“ اس کے دل میں عجیب سا درد ہونے لگا تھا، اتنا وقت دونوں ساتھ گزار چکے تھے مگر آج سو دویاں کا حساب کرنے بیٹھا تو اس کے نصیب میں صرف خسارہ ہی خسارہ تھا۔

”کاش کچھ ایسا ہو جائے کہ تمہیں خوشیاں بھی ملیں، تم آسودہ بھی رہو، اور مجھ سے دور بھی نہ

جاؤ۔“ نا جانے وہ دعاؤں میں کیا مانگ رہی تھی، وہ بس اسے دیکھے گیا۔

”کیا مانگ رہی تھی؟“ وہ آکر بیٹھی تو ازہر شاہ نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”یہ میرا اور اللہ کا پرسنل معاملہ ہے، آپ کو کیوں بتاؤں؟“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر لیٹ گئی۔

”کانی پیو گی؟ میں بنالاؤں؟“ ازہر شاہ کو اس وقت کمرے میں موجود خاموشی سے وحشت ہو رہی تھی، وہ آج اس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتا تھا، مگر اس کا ایسا کوئی موڈ دکھائی نہ دیتا تھا۔

”مجھے نیند آئی ہے، سونے دیں۔“ وہ اجنبیت لہجے میں سموئے ہوئے بولی، ازہر شاہ اس کی پشت کو گھورا کر رہ گیا۔

”شفق میرا تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“ وہ جیسے اس کی منت کر رہا تھا، پتا نہیں وہ کہنا کیا چاہتا تھا شفق شاہ سمجھ نہ پائی۔

”میرا کسی سے بات کرنے کا موڈ نہیں ہے، میرے پاس بات کرنے کو کچھ نہیں ہے، آپ جا میں اسی سے باتیں کریں جس سے اس دن لان میں بیٹھ کر میٹنگ کرتے رہے ہیں۔“

”گھر آئے مہمان کو دھکا نہیں دے سکتا میں۔“

• ”تو پھر مجھ سے بات مت کریں۔“  
”تم کیا چاہتی ہو، بتا سکتی ہو؟“ اس نے استفسار کیا۔

”صرف سونا چاہتی ہوں۔“ اس کے بد لعلی سے کہنے پر ازہر شاہ چپ ہو کر رہ گیا۔

تم اپنی شرطوں پہ ٹھیل ٹھیل میں جیسے چاہوں لگاؤں بازی

اگر میں جیتا تو تم ہو میری اگر میں ہارا تو میں تمہارا.....

تمہارا عاشق، تمہارا مخلص

تمہارا ساتھی، تمہارا اپنا

رہا نہ ان میں سے کوئی دنیا میں جب تمہارا  
تو میں تمہارا.....

تمہارا ہونے کے فیصلے کو

میں اپنی قسمت پہ چھوڑتا ہوں

اگر مقدر کا کوئی ٹوٹا کبھی ستارہ

تو میں تمہارا.....

یہ کس پہ تعویذ کر رہی ہو

یہ کس کو پانے کے ہیں وظیفے؟

تمام چھوڑ دے ایک کر لو جو ستارہ

تو میں تمہارا.....

تمام رات از میر شاہ نے اذیت میں جلتے  
ہوئے گزاری تھی، مگر وہ سکون سے سوتی رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھو ارسم آفندی میں اپنا سب کچھ داؤ پر  
لگا رہا ہوں، لیکن اگر تم نے کسی قسم کا بھی دھوکہ دیا  
تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ وہ آہستہ آواز  
میں اس سے بات کر رہا تھا۔

”آپ مجھ پر یقین کریں، میں کبھی بھی شفق  
کو دھوکہ نہیں دوں گا، میں اس سے بے پناہ محبت

کرتا ہوں، آپ جانتے ہیں نا؟“ وہ اس سے بھی  
آہستہ آواز میں بول رہا تھا، شفق شاہ کو بخار تھا اور

وہ دو اکھا کر سو رہی تھی، ارسم آفندی اور از میر شاہ  
مل کر اس کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، وہ مکمل

طور پر بے خبر تھی۔

”ہاں جانتا ہوں، اسی لئے یہ اتنا بڑا فیصلہ  
کیا ہے۔“ ان دونوں کو خبر نہ ہوئی کب شفق شاہ

جاگي اور از میر شاہ کو ڈھونڈتی ہوئی ڈرائنگ روم  
کے دروازے میں آکھڑی ہوئی اور اوٹ میں ہو

کر ان کی باتیں سننے لگی۔

”بہت خواہش اور کوشش کے باوجود میں

اسے ہر دکھ سے نہیں بچا سکا، پچھلے کچھ عرصے سے  
اسے بے درپے مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ اس  
وقت بری طرح ٹوٹی ہوئی ہے، اسے کسی اپنے کی  
ضرورت ہے، تم اس کو اپنی محبت کا یقین دلاؤ،  
وکیل سے بات ہوئی تھی آج، طلاق کے کاغذات  
تیار ہیں۔“

”طلاق۔“ اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے  
کر مسل ڈالا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ساتوں  
آسمان اس پر آگرے ہوں۔

”میں نے یہ گھر شفق کے نام کر دیا ہے،  
طلاق کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا، میں  
نے ایک بہت با اعتماد میڈکا انٹظام کر لیا ہے، وہ  
شفق کے پاس رہے گی اور.....“ اسے اپنی  
ساتھ سوتی پر یقین نہ آ رہا تھا، وہ منہ پر ہاتھ رکھے  
اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

”تم اس کا خیال رکھنا آتے جاتے رہنا،  
ایسے وقت میں جب وہ مجھ سے نفرت محسوس کر  
رہی ہوگی، تمہارا ایک ایک لفظ اس کے زخموں پر  
مرہم کا کام دیے گا اور.....“ اس کی برداشت  
جواب دینے لگی تھی، وہ زور سے دروازہ دھکیل کر  
اندر داخل ہو گئی تھی۔

”واہ خوب..... بہت خوب۔“ اس نے طنز  
سے کہتے ہوئے تالی بجائی، ان دونوں کو تو گویا  
سانپ سونگھ گیا تھا، از میر شاہ کے چہرے پر تو گویا  
ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

”طبیعت کیسی ہے تمہاری؟“ بمشکل خود کو  
سنجھاتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور نرمی سے اس کا  
ہاتھ تھاما۔

”بھارت میں جائے میری طبیعت۔“ اس نے  
اس کا ہاتھ نفرت سے جھٹکا تھا، از میر شاہ کو یقین  
ہو چکا تھا کہ وہ ان کی ساری باتیں سن چکی ہے۔

”کب اٹھی تم؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے

پوچھا۔

”اسی وقت جب آپ خدا بنے بیٹھے تھے اور میری قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔“ اس نے طنز سے کہا تو از میر شاہ بھونچکا رہ گیا، اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کہے، اس صورتحال کی تو اسے توقع ہی نہ تھی۔

”دیکھو شفق تم میری بات سنو۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسے کے شانوں پر رکھے۔

”آپ کے پاس مجھے سنانے کو کیا واقعی ابھی بھی کچھ ہے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”کہاں ہیں ڈائورس پیپر زدکھائیں مجھے، مگر یاد رکھنا از میر شاہ یہ آپ کی طرف سے اور اس خاندان کے سفاک مردوں کی طرف سے آخری کڑوا کھونٹ ہو گا، آپ کو کیا لگتا ہے میں اتنی گئی گزری ہوں آپ سے ڈائورس لے کر آپ کے گھر میں رہوں گی، پھر آپ اپنی مرضی سے میرا ہاتھ کسی کے بھی ہاتھ میں تمہا دیں گے اور میں مان لوں گی۔“ اس کی دائیں آنکھ سے ایک بے بس آنسو نکلا تھا۔

”دیکھو شفق بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ از میر شاہ نے اس کا آنسو پونچھنا چاہا تو وہ اس سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب ہی تو اصل بات بھی ہوں میں، غلطی میری ہے، میں کیوں بھول گئی کہ آپ اسی خاندان سے ہیں نا جو اپنی عورتوں پر زبردستی اپنے ظالمانہ فیصلے مسلط کرتے ہیں۔“ دکھ سے اس کا سینہ پھٹ رہا تھا۔

”تم نے خود ہی مجھے یہ حق دیا تھا نا کہ تمہارے لئے ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مجھے، تو مجھے جو ٹھیک لگا میں نے.....“

”آپ بھول گئے میں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ انجی بھی مجھے یقین ہے آپ میرے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دیں گے، از میر شاہ، آپ نے مجھے بہت دکھی کیا، میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ میرے ساتھ ایسا کریں گے، اپنے باپ، سر، اس شخص اور آپ میں سے سب سے زیادہ مجھے آپ نے دکھ دیا، مجھے کسی پر اتنا اعتبار نہ تھا جتنا آپ پر تھا، کسی پر ایسا مان نہ تھا۔“ وہ رو رہی تھی، از میر شاہ اور ارسل آفندی کھڑے تھے، منٹوں میں ساری بازی پلٹ گئی تھی۔

ارسل آفندی منزل کے قریب آتے آتے ایک مرتبہ پھر دھککا دیا گیا، آج اسے پتا چلا کہ وہ تو سراپوں کے پیچھے دوڑتا رہا ہے۔

”شفق یہ بے تصور ہیں۔“ ارسل نے اس لمحے از میر شاہ کی محبت پر غور کیا تو اپنا آپ اسے انتہائی خود غرض لگا، وہ بہت شرمندہ تھا۔

”آپ کا شکریہ، آپ نے ان کے ارادے اور اصلیت کو بے نقاب کیا، ورنہ میں ہمیشہ یوں ہی خوش فہمیوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتی۔“ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گئی، ارسل آفندی اور از میر شاہ اسے جانا دیکھتے رہے۔

”آپ نے بہت برا کیا از میر بھائی!“ ارسل آفندی نے اسے مخاطب کیا، تو وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

”میرا کیا تصور تھا، یہی نا کہ آپ کی بیوی سے محبت کر بیٹھا، آپ نے اچھی سزا دی مجھے۔“

”میری نیت پر شک مت کرو، میں نے ایک ٹوٹی ہوئی لڑکی کو مزید ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کی، میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“

شفق شاہ کی ناراضی اور ساتھ میں ارسل آفندی کی شکوہ کناں نظروں نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔

”آپ کے اس کھیل میں سب سے زیادہ نقصان میرا ہوا ہے۔“

”میں نے کوئی کھیل نہیں کھیلا ارسل، ہر مرد ہیں سب کچھ ہنڈل کر سکتے ہیں، جلد بھلا بھی دیتے ہیں، مگر ایک لڑکی اگر ٹوٹ کر بکھر جائے تو اس کا سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے، میں اسے بچانا چاہتا تھا، پھر بھی تم ہرٹ ہوئے، اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔“

”مرد مضبوط ہوتا ہے، ہر بات سہہ جانے کا فن جانتا ہے، مگر کبھی مرد ٹوٹ جائے تو اس کی کرچیاں اس طرح بکھرتی ہیں کہ کوئی سمیٹ نہیں سکتا، عورت سے کوئی بھی ہمدردی اور محبت جتا کر اسے سمیٹ سکتا ہے، مگر مرد جس عورت کے لئے تڑپتا اور ٹوٹتا ہے اس کے سوا اسے کوئی نہیں سمیٹ سکتا اور میں ٹوٹ کر بکھر گیا ہوں، سینے والا بھی کوئی نہیں۔“ شدت جذبات سے اس کا گلہ رندہ گیا تھا۔

”ارسل!“ از میر شاہ دو قدم آگے آیا تھا۔

”چلتا ہوں، اللہ حافظ۔“ اس کی مزید کوئی بھی بات سننے بغیر وہ باہر نکل گیا تھا، از میر شاہ پتھر کا بت بنا دیا کھڑا رہ گیا۔

وہ بیڈروم میں آیا تو اندھیرا چھایا ہوا تھا، اس نے لائٹس آن کیں، وہ صوفے پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی، از میر شاہ کو پچھتاؤوں نے آن گھیرا، اسے اپنی جلد بازی اور حماقت پر افسوس ہونے لگا تھا، اس کی محبت میں اٹھایا گیا اس کا قدم اس کے لئے سنگین ثابت ہوا۔

”شفق!“ اس نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا تھا، وہ تیر کی سی تیزی سے سیدھی ہوئی تھی، اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، آنکھوں میں ڈھیروں ٹھکے تھے۔

”شاہ جی میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی،

مجھے ڈائینورس مت دیجئے گا، میں آپ سے محبت کرتی ہوں، صرف اور صرف آپ سے مجھے ارسل یا کسی بھی اور شخص میں کوئی دلچسپی نہیں ہے میرا سب کچھ صرف اور صرف آپ ہیں۔“ اس کے شانے پر سر رکھ دے وہ رونے لگی تھی، از میر شاہ کے لئے اس کا یہ رویہ غیر متوقع تھا، اس نے کچھ مطمئن ہو کر اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

”مجھے یہاں سے کہیں مت بھیجئے گا، میں مر جاؤں گی۔“ اس کے آنسو از میر شاہ کی شرٹ بھگو رہے تھے، اس نے اسے چپ نہیں کروایا، کافی دیر رونے سے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تو از میر شاہ نے ایک طویل سانس خارج کی، جیسے اپنی صفائی دینے کے لئے الفاظ تلاش کر رہا ہو۔

”میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں، بے پناہ بے حساب، اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی، تمہیں اپنے ساتھ ہمدردی میں لایا تھا، زورہ شاہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا تھا، مگر مجھے علم ہی نہ ہوا کہ کب اور کیسے مجھے تم سے محبت ہوگئی، میری محبت بے غرض تھی مگر کیا!“ آج اتنے عرصے بعد اس کے منہ سے ”گڑیا“ سن کر اس کے بے چین دل کو گویا قرا ملا تھا۔

”میری محبت میں اپنے لئے کچھ کرنے یا سوچنے کی گنجائش نہ تھی، میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا، مجھے لگتا تھا تمہیں پڑھا لکھا کر میں ایک کامیاب انسان بناؤں گا، میں ہمیشہ تمہاری خوشی اور کامیابی پر تمہارے ساتھ خوش ہوا ہوں، تمہارے دکھوں نے مجھے بہت بے چین کیا ہے، جو کچھ تم نے آج دیکھا درحقیقت یہ میری محبت تھی، مجھے ارسل کو دیکھ کر یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میرا اور تمہارا بیچ ڈفرنس بہت زیادہ ہے، تم میرے ساتھ کبھی بھی اس طرح خوش نہیں رہ پاؤ گی جس طرح کہ.....“ دانستہ اس نے بات



ادھوری چھوڑ دی، وہ ابھی بھی اس کے شانے سے سر نکائے آنسو بہا رہی تھی۔

”میں نے یہ سب تمہاری محبت میں کیا گڑیا۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے آپ کی محبت آپ سمیت چاہیے آپ کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”اگر میں آپ کی باتیں نہ سنتی تو آپ تو مجھے..... اس سے آگے اس سے بولا ہی نہ گیا۔“

”مجھے معاف کر دو گڑیا!“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تھے، شفق شاہ نے جھٹ سے اس کے ہاتھ پکڑ کر کھول دیئے۔

”ایسے معافی نہیں ملے گی۔“ وہ زروٹھے پن سے بولی۔

”تو پھر کیسے ملے گی؟“ وہ پریشان ہوا۔

”آپ وعدہ کریں دوبارہ ایسا کبھی نہیں سوچیں گے، آپ بہت اچھے ہیں، ڈیسنٹ ہیں، اتنے کیرنگ ہیں اور بالفرض ان میں سے کچھ بھی نہ ہوتے، آپ کے ساتھ رہنے کے لئے ایک حوالہ ہی کافی تھا کہ آپ میرے شوہر ہیں۔“ وہ

اپنی باتوں سے اسے حیران کر رہی تھی، از میر شاہ کا خیال تھا کہ وہ اس سے خوب لڑے گی، ناراض ہو گی، مگر اس نے تو اسے فوراً معاف کر دیا، آج

اسے پتا چلا تھا کہ وہ اسے کتنا چاہتی ہے۔

”میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ یہ غلطی نہیں کروں گا۔“ اس نے تشکر آمیز نظروں سے اسے

دیکھا۔

”اور اس..... ارسل آفندی سے کبھی نہیں ملیں گے۔“ اس نے دل کی بات کہہ دی۔

”نہیں ملوں گا، ویسے اس کی کال آئی تھی، پرسوں کی فلائٹ سے انگلینڈ جا رہا ہے اسٹڈی گئے لئے، تم فکر مت کرو، میں اب اس سے بات نہیں کروں گا۔“ شفق شاہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔

”چائے پیو گی؟“ اس نے شفق شاہ کی سوچی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اور آپ بتائیں گے۔“ وہ اس کے ساتھ اٹھ کر کچن میں آگئی تھی۔

”اب تم آگے ایڈیشن لینے کا بھی Decide کر لو، کیونکہ ٹائم کم ہے۔“ وہ کچن میں

اس کے پاس کھڑی تھی، شفق شاہ کو طمانیت کا احساس ہوا تھا، وہ تو ہمیشہ کی طرح تھا بہت نرم

مزاج، دوستانہ اور پیاری فطرت کا مالک، وہ جو یہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ اس پر ارسل آفندی کے حوالے

سے شک کرنے لگا ہے تو آج یہ پھانس بھی نکل گئی تھی، دراصل وہ اسے خود سے بدگمان کرنے

کی کوشش میں تھا، مگر از میر شاہ کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی تھی کہ محبت میں بدگمانیاں آج بھی جائیں تو

محبت ختم نہیں ہوتی۔

دونوں کے دل شکستہ ضرور ہوئے تھے، مگر انہیں یقین تھا کہ آبلہ پائی کا یہ سفر ختم ہو گیا ہے

محبت کرنے والے بھی شکستہ پاہیں ہوتے۔

☆☆☆



عاشقہ فرنگی

عرشہ راجپوت



لاہور ایئرپورٹ پر جم غفیر کا عالم تھا، چاروں جانب شور وغل مچا ہوا تھا، کوئی اپنوں کو چھوڑنے آیا تھا تو آبدیدہ تھا اور کوئی لینے آیا تھا تو بات پہ بات مسکرائے جا رہا تھا، ملے اور پھجنے کے یہ جذباتی مناظر بیک وقت دیکھنے والی آنکھوں میں ہنسی بھی بکھیر دیتے ہیں اور افسردگی بھی، دوسری سے آنے والی فلائٹ لینڈ کر چکی تھی اور باہر ریسو کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا، ایسے میں وہ ایک ہاتھ سے ٹرائی کھینچتی اور دوسرے ہاتھ سے بیج تائب کرتی سیاہ چہرے کے ساتھ ٹک ٹک کرتی آگے بڑھ گئی، دیکھنے والی نگاہوں نے دور تک اس کرلی بالوں والی لڑکی کا پیچھا کیا تھا، جس کے ہتھکڑیا لے بال اس کے آگے قدم بڑھانے پر اوپر نیچے حرکت کر رہے تھے۔

ایئرپورٹ کی بلڈنگ سے باہر پارکنگ ایریا میں کار سے ٹیک لگائے کھڑا سعاد ابے دیکھ کر

مسکرایا، جواباً اس نے بھی اکی نرم سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی، سامان ڈکی میں رکھ کر سعاد ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھا تو وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی فون پر بات کر رہی تھی۔

”دیس ماما میں پاکستان پہنچ چکی ہوں اور اب کار میں بیٹھ کر آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ وہ ایک ہل کورک کر دوسری طرف کی بات سننے لگی اور پھر قدرے جھنجھلا کر بولی۔

”افوہ ماما سعاد بالکل ٹائم پر پہنچ گیا تھا، آپ پلیز ٹینشن مت لیا کریں۔“ اس کی پیشانی پر سلونین نمودار ہوئی اور پھر اختتامی کلمات ادا کر کے اس نے فون بند کر دیا، سعاد مسلسل زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”ماما بھی نا اس طرح ٹریٹ کرتی ہیں جیسے میں کوئی بالکل چھوٹی سی بچی ہوں۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوا بیزیز ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئی، لاہور

## مکمل ناول



سے سیالکوٹ تک کا سفر کافی زیادہ تھا اور اس سے آگے گاؤں تک کا فاصلہ مزید تھا، اس نے بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں کہ ابھی بہت سفر تھا۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا، رات کی کالی چادر ہر چیز کو آہستہ آہستہ تاریک کرتی جا رہی تھی، وہ اس وقت اپنی ریڈیٹیس میں اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں برش کر رہا تھا، بالوں کو مخصوص اسٹائل میں سیٹ کر کے اس نے برش سنگھار میز پر رکھا اور پرفیوم کی بوتل اٹھالی، اس کے بالکل پیچھے بیڈ پر ٹیکے کے بل نیم دراز فرزام کی آنکھوں کی معنی خیزی بڑھتی جا رہی تھی، وہ بھی ابرو اچکا کر اس کی تیاری کو دیکھتا اور بھی ایک آدھ جملہ اس کی طرف اچھال دیتا مگر اس کی طرف سے ہنوز بے نیازی برقرار تھی، سرحان نے دل کھول کر پرفیوم خود پر چھڑکا تو فرزام کی برداشت کی حد ہی ہو گئی۔

”بتادے میرے بارہ بجلیاں کس پر گرنے والی ہیں، کون ہے جسے فتح کرنے کے لئے یوں کیل کانٹوں سے لیس ہو کر جا رہے ہو؟“ فرزام کا تجسس بلند یوں کو چھو رہا تھا، مگر دوسری طرف تو ایسا لگتا تھا جیسے خود کو کمرے میں بالکل تنہا محسوس کیا جا رہا ہو، جی بھر کر پرفیوم کی بوتل خالی کرنے کے بعد اس نے ایک بھر پور نظر سے اپنا جائزہ لیا اور کالی پر گھڑی باندھنے لگا۔

”دیکھ سرحان میرے اب تک کے ایک سو بیس انفیز تیرے پاس ناموں سمیت رجسٹرڈ ہیں، بتا کوئی ایسا انفیز جو میں نے تجھ سے چھپا کر چایا ہو اور اب تو میرے ساتھ ایسا کر رہا ہے، مجھے ہوا تک نہیں لگنے دے رہا۔“ چہرے پر چھوڑے درجہ مصومیت اور ممکن تاثرات سجا کر وہ دل گرفتگی

سے بولا، مگر دوسری طرف کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر اس کی دل گرفتگی میں اضافہ ہوا۔

”دیکھ سرحان ہم بچپن کے دوست ہیں، دکھ سکھ کے ساتھی ہیں اور اب تو میرے ساتھ ایسا کر رہا ہے، اتنا بڑا کام مجھ سے چھپا کر، چل شکل نہ دکھا نام ہی بتا دے، میرا دل تو نہ توڑ۔“ اب بس فرزام کے رونے کی کسر باقی رہ گئی تھی، سرحان نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا۔

”کمینہ غضب کی اداکاری کرتا ہے۔“ دل ہی دل میں اسے سراہتا وہ بوٹوں کے تسمے بند کرنے لگا، پھر شرٹ کے کلف موڑتے ہوئے اس نے آئینے میں خود پر ایک تفصیلی نظر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا، اپنے پیچھے اسے فرزام کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔

”جا بچوں جا مگر واپسی میں جب تو ناکام عاشق بن کر لوٹے گا تو گود میری ہی تلاش کرے گا، آنسو بہانے کے لئے۔“ سرحان نے بمشکل اپنے قہقہے کو دبایا، وہ اس وقت اس کی کسی بوگنی کو خاطر میں نہیں لاسکتا تھا، وہ لاؤنچ عبور کر کے تیز قدموں کے ساتھ چلتا پورچ کی طرف بڑھا، کار کے پاس موجود باوردی ملازم نے اسے سلیوٹ پیش کیا، سرحان نے سر کو خم دے کر جواب دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے بیرونی دروازے سے باہر نکال لے گیا، اس کے سینئرز نے اس وقت ایک پرائیویٹ میٹنگ ایمرجنسی میں کال کی تھی، جہاں وقت پر پہنچنے کے لئے یہ بے نیازی ضروری تھی جو اس وقت وہ فرزام کے ساتھ برت رہا تھا اور کچھ اسے وعدہ خلائی کی سزا دینا بھی مقصود تھا۔

☆☆☆

رات کا پہلا پہرا اختتام کی طرف گامزن تھا، گاؤں میں لوڈ شیڈنگ کے طویل دورانیے کے باعث بجلی کو بند ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے، اکا

دکا گھروں کے بلب یو پی ایس کی وجہ سے روشن تھے، دور سے ہی وہ تین منزلہ لمبی راہدار یوں والی کوٹھی پورے طمطراق کے ساتھ روشن کھڑی تھی، جوں جوں کار کوٹھی سے قریب ہوتی جا رہی تھی جزیئر کی بھدی آواز کانوں کے پردوں تک پہنچ کر بد مزہ کر رہی تھی، کار کوٹھی کے کالے اور سنہری دروازے سے اندر داخل ہوئی مشائم بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، کار رکستے ہی وہ بیلٹ کھول کر ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی، کوٹھی کے دائیں طرف بنے دو منزلہ مکان سے بامشکل نظر ہٹا کر وہ سعادت کی ہمراہی میں لاؤنج کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی، لاؤنج میں دادی سمیت سبھی اس کے استقبال کے لئے موجود تھے اور یہ وہ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ان میں پر جوش کون کون تھا اور مجبور کون کون، وہ سب کو نظر انداز کر کے دادی کو سلام کر کے ان کی استقبال کے لئے وا بازوؤں میں سمٹ سی گئی، بڑے تپا اور چھوٹے پچا اور ان کی بیویوں اور آل اولاد سے باری باری ملنے کے بعد وہ دادی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی، دادی کی باتوں پر وہ مسکرائی بھی اور خوشدلی سے جواب بھی دیئے مگر اس کے چہرے سے واضح ہوتی مسکرت سے اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ وہ کتنی تھک چکی تھی اور نہ ہی اس نے چھپانے کی کوئی ضرورت محسوس کی، کہ مروت کے مارے ہی وہ بیٹھی رہتی، شاید اسی بات کا اندازہ بڑی تائی کو ہو گیا تھا۔

”اماں باقی باتیں اب کل کر لیجئے گا، مشائم تھک گئی ہے اسے اب آرام کرنے دیں، جاؤ حاویہ بیٹا مشائم کو اس کے کمرے تک چھوڑ آؤ۔“ دادی سے مخاطب ہونے کے ساتھ ہی انہوں نے رخ روشن اپنی بیٹی کی طرف کیا، جو سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”نہیں تائی میں خود چلی جاؤں گی، حاویہ پلیز۔“ نرمی سے تائی کو منج کرنے کے بعد وہ بیگ اٹھا کر سیزرھیاں چڑھنے لگی، بغیر دادی کو اور باقی سب کو شب بخیر بولے، شاید اس کی مروت کی حد اتنی تھی یا بے زاری نے ذرا تیزی سے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا کہ وہ دنیا داری کے لئے ہی دو منٹ رکنے پر خود کو مجبور نہیں کر سکی، اس کے وہاں سے جاتے ہی چھوٹے چچا کی بیٹی عاشرہ نے نخوت سے سر جھکا، وہ اس کی بے زاری سے اچھی طرح آگاہ تھی اور اس کی طرح باقی سب بھی، اس کا بس چلتا تو وہ اس کوٹھی میں آتی ہی نہ سیدھی کوٹھی کے ساتھ بنے مکان میں ٹھس جاتی اور پھر وہاں سے نکلتی ہی نہ، مگر کیا کرتی کہ حکم عدولی وہ کتنی بھی کر لیتی اتنی اجازت اسے پھر بھی نہ ملتی، وہ چاہے اپنے باپ کی بہت لاڈلی اولاد سہی مگر اس کا باپ اپنی ماں کی بات سنتا بھی تھا اور مانتا بھی۔

☆☆☆

اس کی واپسی رات بہت دیر سے ہوئی تھی، کمرے میں جانے کے بجائے وہ لاؤنج میں پڑے صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا تھا۔ ”چل یار یہ روشنی محبوباؤں والے تیور دکھانے اب بند بھی کر دے۔“ کمرے سے باہر نکلتے فرزام نے دہائی دینے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ہاتھ بھی جوڑ دیئے، مگر وہ ڈھیٹ بنا آنکھوں پر بازو رکھ لیا رہا۔

”سر جان یار!“ اتنی لجاجت سے نام لیا گیا تھا، کہ سر جان نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بکواس بند کر اور دفع ہو جا یہاں سے۔“ وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور سخت بد مزہ لگ رہا تھا۔

ٹانگیں تڑوانہ کوئی خالہ جی کا گھر تھوڑی ہے۔“  
 ”خالہ جی گھر ہوتا تو تب بھی اتنی بہادری نہ  
 دکھاتا۔“

”ہاں تو ٹانگیں کسے پیاری نہیں ہوتیں۔“  
 وہ چپک کر بولا۔

”ذوب کر مر جا، ایک ڈی ایس پی ہو کر اپنی  
 بزدلی۔“ وہ افسوس سے سر ہلاتا، نیکپن سے دہنچی  
 چوہے سے اتارنے لگا۔

”تو چپ ہی اچھا لگتا ہے۔“ فرزام نے  
 اسے خفگی سے دیکھا۔

”اب زیادہ زبان نہ چلا اور چائے کپوں  
 میں ڈال کر کمرے میں لے آ۔“ اسے حکم دے کر  
 سرحان بچن سے باہر نکل گیا تو فرزام نے بے  
 چارگی سے چائے کی دہنچی کو دیکھا۔

”ایسا بھی کیا جرم کیا تھا جو ایسی سزا دے رہا  
 ہے خبیث۔“ اس نے دانت کچکپائے اور چائے  
 کپوں میں انڈیل کر اس کے کمرے کی طرف  
 بڑھ گیا۔

بے چارے کا جرم واقعی کوئی اتنا بڑا نہیں تھا  
 بس سرحان کے ساتھ شکار کا پلان بنا کر عین وقت  
 پر رائے کے ساتھ اس کی دوست کے نکاح پر چلا  
 گیا تھا، ہاں یہ اور بات ہے کہ یہ جانا بھی مجبوری  
 ہی تھی نہ جانے کے طور پر رائے سرحان سے بھی  
 بڑا ایکشن دے سکتی تھی اور رائے کو منانا سرحان کو  
 منانے سے سو گنا کیا ہزار گنا زیادہ مشکل تھا۔

☆☆☆

اس کے عادات و خصائل نے جیت لیا مجھ کو  
 میرے مریدوں میں تھا وہ اک شخص بیروں جیسا  
 اس کو گنوا کر اب تک خسارے ہیں حسن  
 میرے پاس تھا جو اک شخص ہیروں جیسا  
 کمرے میں آکر وہ بڑے بے تابانہ انداز  
 میں کمرے کی اس واحد کھڑکی کی طرف لپکتی تھی

”تیری بیوی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا کہ  
 کتنی بہادری چاہیے ہوتی ہے بیوی کو انکار کرنے  
 کے لئے۔“ وہ بات اس طرح سے کر رہا تھا کہ پتا  
 نہیں اس نے کتنی ہی بیویاں بھگتائی ہوئی ہیں،  
 اسی بات نے سرحان کے ماتھے پر موجود تیوریوں  
 میں اضافہ کیا تھا، اس کا اندر بہت دیرینک سلگا تھا،  
 فرزام کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا مگر زبان پھسل  
 چکی تھی۔

”ذرا بتانا پسند کریں گے آپ کہ اللہ نے  
 کب سے آپ کو بیوی والا کیا ہے۔“

”کیا نہیں تو کیا ہوا کرنے تو والا ہے نا،  
 جائزہ مگتیرے میری۔“ وہ فخر یہ سینہ ٹھونک کر بولا،  
 سرحان نے ناگواری سے اسے دیکھا اور اٹھ کر  
 بچن کی طرف بڑھ گیا۔

”قسم لے لے سرحان، میرا رائے کے  
 ساتھ جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، وہ تو عین  
 موقع پر اس کی دوست کا نکاح آ گیا تھا جو انکار  
 کرتا تو وہ جائزہ مگتیرے نا جائزہ ہونے میں سکیڈ  
 بھی نہ لگائی، قسم لے لے یار تجھ سے آگے مجھے  
 کوئی نہیں ہے مگر وہ بھی تو تیرے پیچھے ہی ہے  
 نا۔“ جتنی مسکیت وہ اس وقت اپنے چہرے پر سجا  
 سکتا تھا سچا چکا تھا مگر وہ متاثر ہوئے بغیر چائے  
 بنانے میں مصروف رہا، وہ اس کی اداکاریوں  
 سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا سو اب ان کا  
 اثر اس پر کم ہی ہوتا تھا۔

”تو نے اب اگر مجھے معاف نہ کیا تو اسی  
 گھر کی چھت سے کود کر اپنی ٹانگیں تڑوا لوں گا۔“  
 ردنی صورت بنا کر اس نے بڑے سرے ہوئے  
 لہجے میں دھمکی دی۔

”اتنا تو بہادر۔“ سرحان نے استہزاء سے مسکرا  
 کر سر جھٹکا۔

”دیکھ ایسے بول کر مجھے خواہ مخواہ جوش نہ دلا

جس کے پارموجود گھر اس کی خوشیوں کا مسکن تھا، جہاں سکون بارش کی صورت میں برستا تھا، جہاں بیٹنے کے لئے اسے کسی وجہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، بس مسکراہٹ ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی، وہ گھر جو اس کی دعاؤں کا محور تھا اور اس گھر میں رہنے والا اس کی پوری دعا تھا ایسی دعا جو پوری ہو کر بھی ادھوری ہی تھی، نامکمل، اس کی نظریں نیم اندھیرے میں واقع اس کمرے پر جمی ہوئی تھیں جس کی مکمل تاریکی کمرے کے مالک کی غیر حاضری کا ثبوت تھی، مشائخ کی آنکھوں میں نمی پھلنے لگی، کاش اس وقت ممکن ہوتا تو وہ اس گھر کے کیمینوں کے پاس جاسکتی۔

غل ماں کی گود میں سر رکھ کر اپنی ادھوری نیندوں کو پورا کر سکتی، اس کے سلگتے بلبکتے دل کو کچھ تو سہارا ملتا، مگر یہ ایسا کاش تھا جو اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا آیا تھا، ممکن تھا وہ ساری رات وہاں کھڑی رہ کر اس کمرے پر نظریں ٹکائے رکھتی کہ معا موبائل فون کی رنگ ٹون نے اسے وہاں سے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا، بینڈ بیک سے موبائل نکال کر اس نے جھگمگاتے نام کو دیکھا اور لمبی سانس اندر کھینچ کر لیس کا بٹن دبا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”السلام علیکم ماہا؟“

”وعلیکم السلام کیسی ہو مشائخ؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا اور اس نرمی میں بھی چھپی فکر کو مشائخ محسوس کر چکی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں ماہا، آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس کی آواز میں اتنی تھکاوٹ تھی کہ متاشا کا دل بچھ سا گیا تھا، وہ جانتی تھیں جو تھکاوٹ چھ سال سے اس کے اندر بس گئی ہے وہ تھکاوٹ پاکستان جا کر سوا ہوا جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

”مشائخ میری جان پوری کوشش کرنا اپنی

دادی کو کوئی شکایت کا موقع نہ دینا۔“

”ماما پلیز میں دادی کی ہر بات نہیں مان سکتی اور میں ہر بات مانوں گی بھی نہیں، دادی نے اگر مجھے ابو کے گھر جانے سے منع کیا تو میں آپ کو بتا رہی ہوں ماما میں نہیں مانوں گی۔“ بات کرتے کرتے اس کی آواز بھیک مٹی تھی، اتنی زیادہ کہ متاشا کو لگا کہ وہ بس ابھی ہی رودے گی، انہوں نے مزید اسے کوئی بھی نصیحت کرنے سے خود کو روک کر اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے فون بند کر دیا تھا، فون بند ہوتے ہی آنکھوں میں رے کے آنسو گالوں پر بہہ گئے تھے۔

گھٹنوں میں چہرہ چھپائے وہ بچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی، مگر اس کے اندر لگی آگ مزید بڑھتی جا رہی تھی، اتنی کہ اس کا دل کرا کرا کر بے دم ہو گیا تھا، رات کے کسی پہرہ وہ روتے روتے ہی سو گئی تھی۔

☆☆☆

رات کی کالی چادر کو صبح کی سفیدی نے اجالے میں بدل دیا تھا، صبح وہ اس وقت جاگتی تھی جب گھر کے تقریباً چھوٹے بڑے سبھی کان، یونیورسٹیوں اور آؤس میں دو تین گھنٹے تو گزار ہی چکے تھے، رات سے ایک ہی پوز میں سوئی جب صبح وہ ابھی تو اس کا سارا جسم جیسے جچ اٹھا تھا، اک کراہ اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

کافی دیر تک وہ بستر پر چت لیٹی رہی، پھر غسل کرنے کے بعد وہ واش روم سے نکلی تو چہرے پر رات کی تھکن اور درد کی جگہ نرمی اور ملائمت نے لے لی تھی، دل میں درد چھپا کر چہرے پر مسکراہٹ سجانے کے فن سے وہ ابھی چھ سالوں میں متعارف ہوئی تھی، بلیک کلر کے کرتا میں وہ تازہ دم لگ رہی تھی، بالوں کو اونچی پونی میں جکڑ کر اس نے دائیں کندھے پر ہم رنگ

دوپٹر رکھا اور کمرے سے باہر نکل آئی، سارے گھر میں خاموشی کا راج تھا، میز صیباں اتر کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی، شاید اسے نیچے اترتے چچی نے دیکھ لیا تھا بھی وہ اس کے پیچھے ہی کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

”ارے کیا کر رہی ہو، پیچھے ہٹو میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔“ ان کے انداز میں فطری محبت تھی جس پر مشائم کو کوئی شک نہیں تھا اور وہ ایسی تھیں کہ ان کے خلوص اور محبت پر کوئی شک کر بھی نہیں سکتا تھا، مشائم مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”بتاؤ کیا بناؤں تمہارے لئے؟“ وہ فریج سے آٹا نکالتے ہوئے بولیں۔

”کچھ نہیں چچی بس ایک کپ اسٹرونگ سی چائے۔“ ان نے حیرانگی سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی مشائم کو دیکھا۔

”تم چائے نہیں پیتی تھی مشائم۔“ ان کی آواز میں خود بخود حیرانگی کی جگہ اداسی نے لے لی۔

”پیتی نہیں تھی چچی اب پیتی ہوں۔“ وہ تھی پر زور دے کر بولی۔

ام ہانی کے اندر آزدگی پڑھنے لگی، کتنی بدل گئی تھی وہ اور کتنی پھلتی جا رہی تھی وہ، دو لوگوں کی نفرت اس محبت کرنے والی میں سب ختم کرنی جا رہی تھی مگر وہ دونوں ہی بے نیاز اور کھٹور بنے بیٹھے تھے، جیسے محبت اس کا جرم ہو اور سزا اس پر فرض، چائے بناتے وقت وہ خاموش رہی تھیں جیسے بولنے کو دل نہ چاہ رہا ہو اور دل جیسے ہر چیز سے اچاٹ سا ہو گیا ہو۔

اجانک سے چائے کا عادی ہو جانا کوئی ایسی حیرانگی یا صدمے کی بات نہیں تھی، مگر ایک ایسی لڑکی جو چائے کو نہ صرف زہر کہتی ہو بلکہ بھشتی بھی ہو اور اس کا نام تک نہ لے، وہ لڑکی آج اس

زہر کو نہ صرف پیئے بلکہ اس کی عادی بھی ہو جائے تو یہ بات حیرانگی کی تھی، کم از کم مشائم جیسی لڑکی کے لئے تھی کہ وہ نہ بدلنے والی لڑکی اب بدل رہی تھی اور مسلسل بدلتی جا رہی تھی، چائے کپ میں انڈیل کر ان نے کپ اسے تمہا دیا۔

”محبت جب قاتل بن جائے تو اسے چھوڑ دینا چاہیے مشائم، دکھ بڑے نہیں ہوتے مگر جو دکھ توڑ کر پھر جڑنے جو گمانہ چھوڑیں وہ بڑے بن جاتے ہیں۔“ مشائم ان کی بات پر بڑی تکی سے مسکرائی تھی۔

”چچی مجھے ذرا غور سے دیکھیں، کیا آپ کو لگتا ہے مجھ پر اب کسی نصیحت کا اثر ہو گا۔“ وہ مسکراہٹ ابھی تک اس کے ہونٹوں پر پھیلی تھی، وہ کچن سے نکل گئی تھی مگر وہ ساکت سی کھڑی تھیں اور بہت دیر تک کھڑی رہی تھیں۔

”آؤ مشائم میرے پاس بیٹھو۔“ صدمے پر بیٹھیں دادی اسے دیکھ کر مسکرا کر بولیں، مشائم نے گرم گھونٹ اندر اتارا۔

”سوری دادی میں ابھی غل ماں کے پاس جا رہی ہوں۔“ گرم گھونٹ کی ساری آگ ان کے اندر اتار کر وہ لاؤنج سے باہر نکل گئی، اس نے پیچھے مڑ کر دادی کی ان نگاہوں کو نہیں دیکھ تھا جو اس کی پشت میں کھب گئی تھیں، دادی کے تاثرات کیا تھے اس نے اہمیت ہی نہیں دی، اس کے اندر در آنے والی تبدیلیوں کو بڑی فرصت سے جانچا جا رہا تھا اور اس جانچ میں اب یہ بات بھی آئی تھی کہ مشائم باجوہ اب دوسروں کے خیالات اور تاثرات کو جو جوتے کی نوک سے اڑاتی تھی اور بیاگ دہل اڑاتی تھی۔

☆☆☆

خالی کپ اس نے پچھواڑے کی طرف جاتی راہداری پر رکھا، کوئی کی پچھلی طرف دیوار کے



رکھ کر بڑی آسانی سے کر لیتی تھی، ان گزرے چھ سالوں میں ہر دن وہ ان سے کبھی سکا پ اور کبھی والٹس ایپ پر بات کرتی تھی اور گھنٹوں کرتی تھی، مگر آج جو اس نے ان کی گود میں سر رکھ کر بات کی تھی وہ گزرے سالوں میں ایک دن بھی نہیں کی تھی، ایک دن بھی نہیں کہا تھا کہ کل ماں آپ کے بیٹے نے بڑی زیادتی کر دی میرے ساتھ، ایک دن بھی اس کا نام نہیں لیا تھا، گلہ ہانے بھی نہیں اس کا ذکر نہیں چھیڑا، وہ اس کی بھی تو ماں تھیں نا اور بیٹیوں کے زخموں کو ماںیں تھوڑی نا کر دیتی ہیں۔

☆☆☆

”کب پہنچ رہے ہو سر جان؟“ فرزام اپنی ریڈیٹس براس کا انتظار کر رہا تھا، وہ سر جان کے ساتھ اس کے گاؤں شکار کھیلنے کے لئے جا رہا تھا اور اس مرتبہ سر جان اس کی بہت منت سماجت کے بعد راضی ہوا تھا۔

”بس نکل رہا ہوں، جازم کو ہاسپٹل سے ایک کرنے کے بعد تمہارے پاس آتا ہوں۔“ وہ آٹس سے نکل کر کار میں بیٹھنے کے دوران اس سے بات کر رہا تھا، فون بند کرنے کے بعد اس نے گاڑی کا رخ جازم کے ہاسٹل کی طرف موڑا۔

”نکلنے سے پہلے اچھی طرح سے تسلی کر لو، یہ نہ ہو گاؤں پہنچ کر پتا چلے کہ تمہاری جائز مگتیر اور ہونے والی بیوی کی کسی دوست کا نکاح ہونے والا ہے۔“ یہ تو ناممکن تھا سر جان باجہ طنز کرنے کا اور بھگو بھگو کر مارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دے، فرزام نے بڑی بے چارگی سے جازم کو دیکھا تھا مگر وہ ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے کندھے اچکا کر رہ گیا، فرزام گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا مگر اب ہونٹ پیچھے اسے دیکھ رہا تھا، جو اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ جمائے بظاہر وڈ اسکرین

درمیان ایک چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ دونوں گھروں کے درمیان ایک اندرونی راستہ کے طور پر تھا، ایک ایسا راستہ جسے صرف مشائے ہی استعمال کرتی تھی، مگر اس دروازے کو دیکھ کر ایسا لگتا نہیں تھا کہ اسے چھ سال تک کھولا نہیں گیا اور مشائے کو کونسی میں ایسا کوئی نہیں دکھا تھا جو اس کی طرح ابو کے گھر والوں کا عاشق ہو، لکڑی کا کواڑ دھکیل کر وہ اس گھر میں داخل ہوئی جسے بھی ڈرنی لینڈ بیتی تھی، سر جھٹک کر وہ اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی، وہ جانتی تھی اس وقت گلہ ہانے کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہوگا۔

جازم کو اس نے اپنے آنے کا نہیں بتایا تھا مگر یہ جانتی تھی کہ وہ کل پاپرسوں آجائے گا، ایک وہی تو تھا جو اس سے بغیر کسی حوالہ کے بات کرتا تھا جو بات کرتے کرتے رکنا نہیں تھا اور نہ ہی رک کر اس کے زخموں کو بے پردہ کرتا تھا جو بس اپنا ایک ہی رشتہ نبھائے جا رہا تھا جو دوستی کا رشتہ جازم باجہ نے چار سال کی عمر میں جوڑا تھا وہ چھپیس سال کی عمر میں بھی جوں کا توں تھا، اتنا ہی بانیڈ اور اتنا ہی خالص، اس نے ہال میں قدم رکھا اور کچن سے نکلتی گلہ ہانے کی آنکھیں بس اسے دیکھتے ہی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں، بچ کا راستہ مشائے نے بھی بھرے دل کے ساتھ ہی طے کیا تھا ان کی آغوش میں آکر وہ پتی دھوپ سے نکل کر ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں چھپ سی گئی تھی جیسے۔

”آپ کے بیٹے نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے گلہ ماں گن گن کے بدلے لوں گی میں اس سے۔“ ان کی گود سے سر اٹھا کر وہ صوفے پر سیدی ہو کر بیٹھی ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کر کے دوبارہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی، غلم ہما کو اس کی یہ عادت بڑی پیاری لگتی تھی وہ بڑی سے بڑی بات ان کی گود میں سر

سے باہر نظر س جمائے ہوا تھا مگر فرزام کی ساری کیفیت سے اچھی طرح آگاہ بھی تھا۔  
 ”یہ رو بھی بیوی کی طرح طنز پر طنز کے نشتر نہ چلا، سیدھی سیدھی بات کر ساتھ لے کر جانے کا ارادہ ہے بھی یا نہیں؟“ وہ سخت خفا صورت بنائے غصے سے بولا تھا۔

”میرا تو ارادہ ہے اگر تیرا وہاں نکلنے کا ارادہ ہے تو پھر تو چل۔“ سرحان نے اس کی طرف دیکھ کر بے نیازی سے کندھے اچکائے، فرزام اندر تک جل کر رہ گیا، دھپ سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ سرحان نے اسے خشکیں نظروں سے گھورنے کے ساتھ ساتھ بے ساختہ امنڈ آنے والی مسکراہٹ کو بکھل ہونٹوں میں دبایا تھا۔

☆☆☆

وہ حادثہ جو ہوا اس کا رنج کیا کرتا جو ہونے والا تھا وہ بھی میرے قیاس میں تھا دو پہر سے سہ پہر میں بدلی اور ایب سر پہر شام کے دُششین سانچوں میں ڈھلنے لگی تھی، وہ خفا خفا صورت بنائے پچھلے لان میں چہل قدمی کے سے انداز میں چل رہی تھی، سارا دن اس نے غل ماں کے ساتھ باتوں میں گزرا تھا، ان کے ہاتھوں کا بنا پلاؤ بھی بڑی رغبت سے کھایا تھا، مگر اس خوشگوار دن کا خاتمہ اس وقت ہوا جب یعقوب باجوہ شام کو گھر واپس آئے تھے، ان سے ملاقات سے لے کر ان کے سامنے چائے رکھنے تک اس کی سنجیدگی برقرار رہی تھی۔

”ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو مشائے۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے اسے پیارا اور نرمی سے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تھا۔

”ہرگز بھی نہیں، میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی آپ کے پاس بیٹھنے میں۔“ وہ اتنی بے مروتی اور

بد لحاظی سے بولی تھی کہ غل ہما کے ماتھے پر ناگواری کی کئی شکنیں نمودار ہوئی تھیں جو مشائے دیکھ کر بھی انجان بن کر پچھلے لان کی طرف نکل آئی تھی، وہ جانتی تھی ابو کو برا لگا ہو گا اور غل ہماں کو بھی مگر وہ اپنے اس رویے کو حق بجانب بھی سمجھتی تھی اور سمجھتے تو یعقوب باجوہ بھی تھے سو اسی لئے انہوں نے ہرگز اس رویے پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا، وہ جانتے تھے کہ مشائے ان سے اس بات پر خفا ہے کہ وہ پچھلے دنوں میں دوئی ایک سیمینار میں شرکت کے لئے گئے تھے مگر اس سے ملے بغیر واپس آ گئے تھے، جبکہ مشائے کا گھر صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر موجود تھا۔

مگر وہ کیا کرتے کہ جوان کے ساتھ گیا تھا وہ ہرگز بھی ان کا جانا پسند نہ کرتا سو خواہش رکھنے کے باوجود وہ مشائے سے نہیں مل سکے تھے۔

اور پھر لان میں شہلٹی مشائے بھی اس بات سے واقف تھی کہ وہ اکیلے نہیں تھے ان کے ساتھ سرحان بھی تھا اسی لئے تو خفگی اور ناراضگی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ غل ہما کو اپنے واپس جانے کا تانے آئی تھی جب وہ بھی اس کے ساتھ باہر نکل آئے تھے، وہ ناراض تھی اور یہ بات انہیں سخت بے چینی میں مبتلا کر رہی تھی، وہ آٹھ سال تک ان کے ساتھ رہی تھی، غل ہما اور یعقوب باجوہ کے لئے وہ صرف بیٹی جیسی نہیں تھی بلکہ بیٹی ہی تھی۔

”تم جانتی ہو تمہاری ناراضگی مجھے بہت مضطرب رکھتی ہے۔“ اس کے کندھے پر بازو پھیلائے وہ لان کی طرف رخ کیے چل رہے تھے۔

”اور آپ بھی جانتے ہیں ابو، آپ جب مجھ پر اسے فوقیت دیتے ہیں تو میں بھی بہت مضطرب ہوتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں خشک مگر

آواز بیگی ہوئی تھی، وہ بہت کم لوگوں کے سامنے  
رونی تھی اور ان کم لوگوں میں یہ گھرانہ سرفہرست  
تھی۔

”ہوں، میں جانتا ہوں کہ تم اس بات سے  
باخبر ہو کہ وہ میرے ساتھ تھا، تو چلو صرف اسی  
بات کی وجہ سے مار جن دے دو۔“ وہ زنی سے  
اسے منانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ جانتے تھے  
وہ لمبے لمبے شکوے شکایات کرے گی، انہیں کم مگر  
غائبانہ طور پر سر حان کو زیادہ سنائے گی اور پھر آخر  
میں دل کی بھڑاس نکال کر ان کے کندھے پر سر  
رکھ کر بیگی آواز میں بولے گی۔

”مشائے باجوہ، یعقوب باجوہ سے بھلا  
ناراض ہو سکتی ہے؟“ اور یہ تو نامکن تھا جیسے، مگر  
اب حالات جیسے بدل گئے تھے۔

”بات مار جن کی نہیں ہے بات انصاف کی  
ہے ابو، جو کہ آپ میں سے کسی نے بھی میرے  
ساتھ نہیں کیا۔“ وہ بگڑ کر بولی تھی، دکھ تو بس یہی  
تھا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو مشائے۔“ اب کی بار  
وہ بھی تھوڑا خفا ہوئے تھے۔

”میں کہہ سکتی ہوں ابو، مانا کہ آپ کا بیٹا  
چیزوں کو توڑنے کا شوقین ہے مگر میں چیزوں میں  
نہیں انسانوں میں شمار ہوتی ہیں اور انہوں اس  
بات کا ہے کہ یہ فرق آپ میں سے اسے کسی نے  
نہیں سمجھایا۔“ ان کا بازو کندھے سے ہٹا کر وہ  
درمیانی دیوار کی طرف بڑھنے لگی تھی جس کی  
دوسری طرف کوٹھی میں موجود مفلورا بیگم بے چینی  
سے اس کی خطر تھیں۔

☆☆☆

رات کو کھانے پر وہ بھی سب کے ساتھ  
ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی، بظاہر پرسکون مگر اندر  
سے بے چین مفلورا بیگم کی حلقی بھری نظریں بار بار

اس پر جا کر ٹھہر رہی تھیں جو ان کے بیٹے کی وہ  
لاڈلی اولاد تھی جس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کم از کم وہ  
انہیں سکون کا سانس نصیب نہیں ہونے دے گی۔

”تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گی کہ وہ کون سی  
ایسی ملاقاتیں تھیں جو صبح سے شروع اب بالآخر  
رات کو تمام ہوئی ہیں۔“ میز کے کناروں پر  
دونوں کہیاں نکائے، ان کی آنکھوں میں غصے کی  
لہر جیسے ٹھہری گئی تھی اور چہرے پر اپنی کرختی تھی کہ  
میز پر موجود ہر کسی کا ہاتھ جہاں تھا وہاں موجود رہ  
گیا، دن بھر کا اندر دبا ہوا دلاد جب جیسے باہر نکلنے  
کو بے تاب تھا، مشائے نے اطمینان سے کھانے  
کی پلیٹ پر بے کھسائی، پر اعتماد انداز میں کرسی  
کی پشت سے کمر نکا کر وہ ان کی آنکھوں میں  
آنکھیں ڈال کر بولی۔

”پہلی بات یہ کہ ان ملاقاتوں کی کہانی تو  
میں اپنے ماں باپ کو بھی بتانے کی پابند نہیں  
ہوں، دوسری بات کہ میں نے اس روک ٹوک  
اور جواب طلبی کی عادی ہوں اور نہ اسے پسند کرتی  
ہوں اور تیسری اور اہم بات کہ میں کھانے کے  
دوران بات کرنے کو ہرگز بھی پسند نہیں کرتی، سو  
امید کرتی ہوں آئندہ کے بعد آپ ان تمام باتوں  
کو یاد نہیں کی اور مجھے دوبارہ بد میزگی اور گستاخی  
کا موقع نہیں دیں گی۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ  
آرام سے کرسی دھکیل کر اٹھ کر ڈائننگ روم سے  
باہر نکل گئی، وہاں پر موجود ہر فرد نے وہاں تک  
اس کی پشت کو کھورا تھا جہاں تک وہ انہیں نظر آتی  
تھی، تاپا اور چچا کی سلوٹوں میں اتنا اضافہ ہو چکا  
تھا کہ مائٹوں پر حال سے بنی گئے تھے، مشائے کی  
یہ حرکت ہر کسی کو ناگوار گزری تھی، سوائے چھوٹے  
چچا کی چھوٹی صاحبزادی کیٹی باجوہ کے اس نے  
خیالوں ہی خیالوں میں اس کی پیٹھ بھی ٹھوک دی  
تھی، اسے اس کی یہ بہادری بڑی ہی اچھی لگی

تھی۔

”مشائم باجوه، کئی باجوه تمہارے نقش قدم پر چلنے کے لئے جی جان سے تیار ہے۔“ اپنے ہی خیال پر اس نے سر دھنا تھا اور پھر بڑی رغبت سے اپنے سامنے پڑی بریانی کی پلٹ کو ختم کرنے لگی تھی، یہ محسوس کئے بغیر کہ وہاں پر موجود ہر فرد صرف اپنی پلیٹوں کو گھورنے میں مصروف ہے۔

☆☆☆

مشائم کے دادا ابراہیم باجوه کا بحالت مجبوری عقد ثانی صفورا بیگم کے ساتھ ہوا تھا اور اس نکاح کی سب سے بڑی مجبوری ان کا وہ دو سال کا بیٹا یعقوب باجوه تھا جو دو سال کی عمر میں ماں کے سائے سے محروم ہو گیا تھا، ابراہیم باجوه کا مجبوری کی حالت میں کیا جانے والا یہ فیصلہ ان کے لئے بہت بڑی غلطی ثابت ہوا تھا، مگر اور اک ہونے پر وہ بجائے صبر کرنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے، صفورا بیگم ماں کا سا پیار دینا تو دور ماں کا سا احساس دینے سے قاصر نہیں، شروع دن سے جو بے زار بیت یعقوب کے لئے ان کے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ بعد میں اتنی شدید نفرت میں سامنے آئی تھی کہ یعقوب تو یعقوب ابراہیم باجوه بھی ششدر رہ گئے تھے، مگر قدرت نے ذوالفقار باجوه کو ان کی گود میں ڈال کر جیسے اس رشتے کو ناپنے کے لئے باندھ دیا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے مراد باجوه اور ہاشم باجوه کی پیدائش کے بعد انہوں نے یعقوب کو بورڈنگ بھجوا دیا تھا چونکہ ان کا کاروبار شہر میں تھا سو یعقوب سے ان کی ملاقات ایک دو دن کے بعد لازمی ہوتی تھی، وقت گزرتا رہا اور سالوں کے ہند سے اپنی جگہ تبدیل کرتے رہے، یعقوب نے تقریباً بچپن سے جوانی تک کا عرصہ شہر میں ہوشل میں ہی رہ

کر گزارا تھا، ایم بی بی ایس کے بعد سرکاری نوکری کا کچھ عرصہ شہر میں گزارنے کے بعد وہ مستقل طور پر گاؤں آ گئے تھے، ابراہیم باجوه نے اپنے دوست کی بیٹی گل ہما سے یعقوب کی شادی کرنے کے بعد انہیں کوٹھی سے ملحقہ گھر میں منتقل کر دیا تھا، جو کہ انہوں نے خاص طور پر یعقوب کے لئے ہی تعمیر کروایا تھا، وہ جانتے تھے صفورا بیگم کبھی بھی کوٹھی میں انہیں خوش نہیں رہنے دیں گی، صفورا بیگم کی نفرت جوں کی توں تھی ان نے بہت کوشش کی تھی یہ نفرت اپنے بیٹوں کے اندر منتقل کرنے کی مگر وہ جیسے اس نفرت سے بے زار سے تھے مگر صرف ماں کے احترام میں خاموش رہتے تھے، ذوالفقار نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد باپ کا کاروبار خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا، مگر مراد اور ہاشم کو کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، سی اے مکمل کرنے کے بعد مراد نے دوپٹی کی ایک کمپنی میں جاب کرنے کے بعد پاکستان نژاد لڑکی سے شادی کر کے دوپٹی میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، ہاشم نے انجینئرنگ کی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسلام آباد میں جاب کر لی تھی، ہاشم نے بھی شادی اپنی پسند سے کی اور ام ہانی کوٹھی میں دلہن بن کر آ گئی تھیں، ذوالفقار کی شادی صفورا بیگم نے اپنی پسند سے گاؤں میں ہی کروائی تھی، ابراہیم باجوه کے انتقال کے بعد یعقوب باجوه کا کوٹھی سے جو ایک تعلق تھا وہ ختم سا ہو گیا تھا، ان کے تینوں بھائی ماں کے سامنے تو نہیں مگر ان سے رابطہ میں تھے مگر کوٹھی والوں سے وہ جیسے کٹ سے گئے تھے۔

مگر مشائم باجوه جیسے اس تعلق کو دوبارہ سے جوڑنے آئی تھی، مضبوطی سے باندھنے، مراد باجوه اور ماہ نور کو اللہ نے جڑواں بچوں سے نوازا تھا، مشائم اور آفاق، مشائم جتنی صحت مند اور

تندرست تھی آفاں اتنا ہی کمزور پیداؤں کے بعد آفاں کا کچھ عرصہ ہسپتال میں گزرا تھا اور پھر گھر آ کر بھی وہ مراد اور ماہ نور کی توجہ کا واحد مرکز تھا، ایسے میں مشائم بہت بری طرح سے نظر انداز ہو رہی تھی، یہ ان دونوں کے لئے تکلیف کا باعث تھا، آفاں کی صحت اتنی خراب رہتی تھی کہ وہ مشائم کو توجہ ہی نہیں دے پاتے تھے، بہت مجبور ہو کر مراد نے مشائم کو پاکستان صفورا بیگم کے پاس بھجوا دیا تھا، مگر پاکستان آ کر تو اس نے ظل ہما کی زندگی میں بیٹی کی کمی کو جیسے پورا کر دیا تھا، بظاہر اسے صفورا بیگم کے پاس بھیجا گیا تھا مگر وہ ان کے پاس تو تب رہتی جب وہ کوئی میں نکلتی اس کی توجہ اور محبت کا واحد مرکز وہ گھر رہا تھا جسے وہ اپنا گھر کہتی تھی، یعقوب باجوہ بہت بچپن میں ہی اس کے ابو بن گئے تھے اور ظل ہما ایسی ظل ہاں جس کو کوئی بھی بات بتاتے ہوئے وہ ہچکچاتی نہیں تھی اور ہچکچاتی تو وہ تب بھی نہیں تھی جب ایک دن ان کی گود میں سر رکھ کر اس نے بڑے آرام اور سکون سے پوچھ لیا تھا۔

”ظل ہاں کیا سرخان باجوہ کی شادی مشائم باجوہ سے ہو سکتی ہے؟“ اس نے سوال نہیں پوچھا تھا بلکہ اپنی خواہش ان کے سامنے رکھ دی تھی، وہ پاکستان میں جازم باجوہ اس کا واحد دوست اور ہم راز تھا اور سرخان باجوہ وہ واحد انسان تھا جس کی بے انتہا نفرت کے باوجود مشائم کی محبت شدتوں کو چھوٹی جاتی تھی، مشائم کی محبت کیا تھی ایک خوشبو بھی اور یہ خوشبو صفورا بیگم اور سرخان کے تینوں میں مٹ کر ان کا سانس جیسے روک دیتی تھی، ان کے دل میں ناگواری بھر دیتی تھی، وہاں یہ بچ تھا کہ مشائم جب جب چھینوں میں پاکستان کا رخ کرتی تھی سرخان اتنا بے زار ہو جاتا تھا کہ وہ گاؤں میں پاؤں رکھنا خود پر حرام کر لیتا تھا، اگر

صفورا بیگم کو یعقوب باجوہ اور ان کے گھرانے سے نفرت تھی تو کم سرخان بھی نہیں تھا وہ کوئی والوں سے نفرت میں اتنا شدت پسند نکلا تھا کہ مشائم کی انڈی محبت کو جو تے کی نوک پر رکھتا تھا، مگر وہ بھی کم ڈھیٹ نہیں تھی، مگر سرخان باجوہ کو اس کی موجودگی قبول نہیں تھی تو اس کی محبت کو کیسے قبول کرتا۔

☆☆☆

”یہ ناممکن ہے امی اور یہ میں ہرگز ہرگز بھی نہیں کروں گا، آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔“ وہ ماں کی مشائم سے شادی کی بات پر حیران ہوا اور یہ حیرانگی پھر پریشانی میں اس طرح بدلی کہ وہ باقاعدہ اپنے بال نوپنے لگا تھا۔

”کیوں نہیں ہو سکتا سرخان، ساری دنیا کے نکاح ہوتے ہیں، تم کر لو گے تو کون سی انہونی ہو جائے گی۔“ ظل ہما بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی ہوئی بولیں، چہرے کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی اتنا بے تاثر تھا کہ وہ حیرانگی سے ان کی طرف مڑا۔

”بے شک یہ نکاح انہونی نہ ہوتی مگر اس وقت جب یہ مشائم باجوہ کے سوا کسی اور سے ہوتا، مجھے وہ لڑکی قبول نہیں ہے امی، نفرت ہے مجھے اس سے۔“ وہ سخت زچ ہوا، غصے کی زیادتی سے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو چکی تھیں۔

”تمیز سے بات کرو سرخان۔“ ظل ہما بری طرح بگڑیں۔

”خبردار اس کے لئے کوئی فضول لفظ استعمال کیا تو۔“

”آپ کو وہ اتنی عزیز کیوں ہے امی؟ وہ ان لوگوں کی بیٹی ہے جنہوں نے ساری زندگی آپ سے نفرت کے سوا کوئی دوسرا رشتہ نہیں رکھا۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”اس لئے تو کہہ رہی ہوں اب ختم کر دیجئے  
ہیں ان نفرتوں کے رشتوں کو، نفرتیں کچھ نہیں  
دیتیں محبتیں ثبت کرنے سے ہی خوشیاں ملتی ہیں،  
تم دونوں کا یہ نیا رشتہ بہت مثبت ثابت ہو گا  
دونوں گھرانوں کے درمیان۔“ وہ نرمی سے اسے  
سمجھا رہی تھیں، قائل کر رہی تھیں، جبکہ اس کے  
اندر کڑواہٹ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہ ناممکن ہے امی، آپ جازم کے لئے  
ایسا سوچ گئیں۔“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد وہ  
قطعیت سے بولا۔

”کیسے سوچ لوں جازم کے بارے میں،  
محبت وہ تم سے کرتی ہے، خواہش وہ تمہارے لئے  
رکھتی ہے، تو کیسے جازم کو سوچ دوں اسے۔“ وہ  
سخت عاجز آ کر وہ بول گئی تھیں جس نے اسے  
جلتے انگاروں پر بیچ دیا تھا، یعنی اس کی ماں کے  
لئے مشائے کی محبت، اس کی خواہش اتنی ضروری  
ہے کہ وہ اس کی نفرت اس کے انکار کو کسی کھاتے  
میں ہی نہیں لا رہیں، اس کا دل بڑی بڑی طرح  
سے چٹھا تھا۔

”آپ یہ ایک سمجھنے سے مجھے صرف اس  
لئے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کیونکہ یہ  
مشائے یہ خواہش..... اود خدا۔“ وہ سر ہاتھوں میں  
پکڑ کر کرسی پر گر سا گیا تھا، الفاظ جیسے بالکل  
غائب ہو گئے تھے، تکلیف بہت زیادہ ہوئی تھی،  
اندر بہت بری طرح دکھا تھا۔

”ہاں یہ اس کی خواہش ہے، مگر اس سے  
بہت افضل یہ ایک ماں کی ان کہی التجاء ہے  
سر جان، وہ ماں جو آٹھ سال تک اپنی بیٹی کو اپنی  
امتا کی گرمائش نہ دے سکی، وہ ماں جس کی بیٹی  
آٹھ سال تک دوسروں کی آغوش میں سر رکھ کر  
ماں کی مامتا ڈھونڈتی رہی، آج وہ ماں اگر اپنی بیٹی  
کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سب

سے بڑی خواہش دینا چاہتی ہے تو بتاؤ کہ میں اس  
کی مدد کیوں نہ کروں، اس نے میرے سامنے  
التجاء کی سر جان اور میں اس التجاء کو پورا کرنے کا  
وعدہ کر چکی ہوں۔“ وہ اس سے نظریں چرا کر مگر  
مضبوط اور دو ٹوک لہجے میں بولیں تھیں۔

”سو واٹ امی، اس ساری درد بھری کہانی  
کے اینڈ پر آپ اس دکھاری بظاہر معصوم، ماں کی  
امتا سے محروم لڑکی (جو کہ آٹھ سال تک میری  
ماں کو مجھ سے چھین کر بیٹھی رہی اور ابھی تک  
جو تک کی طرح چپٹی ہے) کو اس کی خواہش دے  
کر خوش کرنا چاہتی ہیں، اس کی محرومیوں کا ازالہ،  
مگر میں میرے ساتھ یہ نا انصافی کیوں؟“

”کوئی نا انصافی نہیں ہو رہی ہے تمہارے  
ساتھ سر جان اور نہ کوئی کر رہا ہے، میری جان بتاؤ  
اس میں ایسی کیا کمی ہے جو تم اس مسلسل انکار پر  
ڈٹے بیٹھے ہو، بظاہر سوائے تمہاری خود ساختہ  
نفرت کے جو کہ تم نے بلا وجہ اس بے چاری سے  
پال رکھی ہے۔“

”اوکے تو یہ طے ہے کہ آپ آج مثبت  
جواب نے بغیر یہاں سے جانیں گی نہیں؟“ اس  
کا چہرہ غصے اور ضبط سے سرخ ہو چکا تھا، دماغ کی  
نفس مسلسل ڈوب ابھر رہی تھیں۔

”ہاں بالکل تم ایسا ہی سمجھ لو۔“ وہ بھی  
مضبوطی سے اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

”تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی نہیں ہو گا امی  
قطعاً نہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر بولا،  
غل ہما کا دل ڈوب کر ابھرا۔

”تو ٹھیک ہے۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر اس  
کے سامنے مضبوطی سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”یہ جس حق سے تم نے مجھے ابھی امی بولا  
ہے، انکار کی صورت میں تم یہ حق بھی کھو دو گے  
سر جان، یہ استحقاق تمہارے پاس نہیں رہے گا، جو

یہی خبر دنیا سے بے خبر ہونے کے لئے کافی تھی۔

☆☆☆

آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا  
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں  
دوبئی سے پاکستان اور پاکستان سے نکاح  
والے دن تک وہ جیسے بادلوں کے ساتھ محور قضاں  
تھی اور کیوں نہ ہوتی، کوئی درگاہ کوئی مزار، کوئی  
دعا کوئی وظیفہ کوئی سجدہ ایسا نہیں تھا جس میں وہ  
سرحان باجوہ کے لئے گز گزائی نہ ہو، اس نے اللہ  
کو اس کی صفات کے واسطے نہ دیے ہوں اس  
کے جہاں محبوب آقائے دو جہاں حضرت محمد  
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ نہ دیا ہو، ہر  
طلب سے اوپر اس کی ایک ہی طلب تھی، جو عشق  
اس کے اندر بس گیا تھا وہ اس عشق کی تکمیل چاہتی  
تھی۔

اور آج جب تکمیل عشق کا روز تھا تو وہ جیسے  
پاگل ہو گئی تھی، آنکھیں اتنی روشن اتنی چمکدار کے  
دھنک کے ساتوں رنگ ان میں آمو جو ہوئے  
تھے آج وہ اس کے نام ہونے جا رہی تھی اور خوش  
ایسے تھی جیسے ساری زندگی بے نام رہی ہو، سرخ  
اور سنہری لہنگے میں ملبوس پوری آستھیوں کی  
شارٹ مینس اور ہلکی پھلکی جیوہری کے ساتھ وہ  
جب لڑکیوں کے جھرمٹ میں چلتی لان میں بیٹے  
اسج پر آئی تو ہر نظر جیسے رک کر پلٹنا بھولی گئی تھی  
اور دھڑکنیں تو سرحان باجوہ کی بھی مترج ہو گئی  
تھیں مگر بس ایک لمحے کو اور یہ ایک لمحہ بھی کوئی کم  
حیثیت نہیں رکھتا تھا، وہ حیران ہوا تھا ابھی تو  
صرف اس نے سرحان کا نام پایا تھا تو یہ عالم تھا  
اور اگر جو اسے پا ہی لیتی تو؟ سانس جیسے رک رک  
کر چلی تھی، محبت کا عالم ہی نرالا تھا، وہ جو ساتھ  
بیٹھا تھا وہ مشائم باجوہ کو مشائم سرحان باجوہ کا  
مقام دے چکا تھا وہ تو بس اسی بات پر سوزندگیوں

میرا نافرمان ہو گا وہ میں اس کی ماں نہیں ہوں  
گی۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ مضبوطی سے چلتیں  
دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں تھیں، بغیر اس کی  
آنکھوں میں زخمی تاثیر پھیلنے دیکھے، اس کا سر پھٹنے  
کے نزدیک ہو گیا تھا، آنکھوں کی سرخی میں آخری  
حد تک اضافہ ہوا تھا، مگر وہ پتھر بنا کھڑا رہا، دیر  
تک اسی حالت میں۔

☆☆☆

غل ہما جانتی تھیں جو وہ اندر اسے کہہ کر آئی  
تھیں وہ بہت تکلیف دہ تھا بہت برا، وہ ان کے  
لئے بہت اہم تھا بہت زیادہ مگر مشائم، اسے بھی  
وہ اپنی اولاد سے کم کا درجہ نہیں دیتی تھیں، جبکہ  
اب جب مشائم کی والدہ ماہ نور نے خود جھولی  
پھیلائی تھی وہ جانتی تھیں ان کی بیٹی مریض عشق  
ہے، ایسی مریض جو ساری زندگی سرحان کے بغیر  
گزار تو سکتی ہے مگر جی نہیں سکتی، وہ ایسی ماں تھی  
جنہوں نے آٹھ سال تک اپنی بیٹی کو اپنی آغوش  
سے اپنی زماہٹ سے دور رکھا تھا اور اب جب  
ازالہ ممکن تھا تو وہ تو پاؤں پڑنے تک کو تیار  
تھیں یہاں تو صرف جھولی پھیلائی پڑی تھی اور  
غل ہما ہر گز بھی اتنی کم ظرف نہیں تھیں کہ اپنے  
بیٹے کو مجبور نہ کر سکتیں اور مجبور تو وہ ہو گیا تھا اپنا حق  
کیسے چھوڑتا اور اس استحقاق سے محرومی تو وہ کبھی  
کووارا ہی نہیں کر سکتا تھا، ہاں مگر وہ جو اندراک  
نفرت تھی وہ جوں کی توں تھی، لیکن مشائم کو کیا  
لگے اس نفرت سے وہ تو اپنی محبت میں ہی مدھوش  
تھی، وہ تو ایسے تھی جیسے اسے کوئی سمندر کے  
درمیان میں سے پکڑ کر دوبارہ ساحل پہ لے آیا  
ہو، وہ خوش تھی اور اتنی خوش کہ اس نے نہ اس  
بات پر غور کیا تھا کہ سرحان کیسے راضی ہوا اور نہ یہ  
جاننے کی کوشش کی تھی کہ صفورا بیگم کو کیسے منایا گیا  
بس اسے سرحان باجوہ مل رہا تھا اس کے لئے بس

رہبان کر دینے کو تیار بیٹھی تھی، کجا فکر کرتی اس کے چہرے پر پھیلی بے زاری کی وہ جانتی تھی یہ نکاح ہو تو گیا ہے مگر صرف ایک نام کی جد تک اور اسے یہ نام ہی تو بیارا تھا، وہ اتنی خوش تھی کہ روشناس بس چہار سو پھوٹیں پڑ رہی تھیں، بھلے سے لوگ کہتے رہیں۔

”عجیب دلہن ہے نہ شرم نہ حیا بس مسکرائے ہی جا رہی ہے۔“ مشائم کی بلا سے اسے بھلا کب خبر تھی کہ اس کے ہونٹوں پر اک دلنشین مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی ہے، آنکھوں میں ایسا خمار ہے جیسے شراب کی پوری بوتل آنکھوں میں انڈیل رکھی ہو، اسج کے ارد گرد پھیلے لوگوں کو اشتیاق اور محبت سے دیکھ رہی تھی یہ لوگ اس کی دعاؤں کی مقبولیت میں شرکت کے لئے آئے تھے وہ محبت سے کیسے نہ دیمکتی اور ان لوگوں کے ہجوم میں ایک چہرے پر پھیلی خشونت اور نفرت دیکھ کر اس کا دل ایک بل کولرز اور پھر یہ لرزاہٹ سارے میں پھیل گئی وہ قدم قدم چلتیں اسج کی طرف آرہی تھیں مراد باجوہ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اسج پر لائے تھے مشائم کا ہاتھ چومتے وقت ان کے چہرے پر کچھ لمحوں کے لئے محبت کی روشنی پھیلی تھی مگر سرحان کو دیکھتے ہی ان کے دل میں ایسے ابال اٹھے تھے کہ وہ کھارا اور ابلا پانی سارے ماحول کھلسا گیا تھا۔

”اپنی اوقات دیکھ کر پاؤں پھیلا جانے چاہیے برخوردار اپنی پرواز قوت سے زیادہ اونچی اڑا میں بھرنے والے بالآخر منہ کے بل نیچے گرتے ہیں، جس کے تم اہل ہی نہیں اس کی طلب بنتی تو نہیں۔“ کتنے دنوں سے دل میں دہلی خاموشی کا آج نفل ٹوٹا تو بھرے مجمع میں سرحان باجوہ کے منہ پر طمانچہ لگ رہے تھے، وہ جڑے بھیجے ان کے مقابل سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا تھا، سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا، ظل ہما

کا رواں رواں اس کی خاموشی کا ملجائی تھا، مگر لاوا اگر صفورا بیگم کے منہ سے نکلا تھا تو پک کر پھٹنے کو تیار سرحان باجوہ کے اندر بھی تھا۔

”سہلے تو آپ اپنی غلطی نہیں بلکہ خوش فہمی دور کر لیں کہ یہ طلب میری تھی، سرحان باجوہ کا معیار اتنا، اتنا گرا تو ہرگز بھی نہیں ہے، ہاں مجبوری میں کیے گئے فیصلے اکثر گلے پڑ جاتے ہیں، سنا تھا آج دیکھ بھی لیا اور رہی پرواز قوت کی بات تو میری اڑان تک پہنچنے کے لئے آپ کی پونی کے پاس وہ قوت پرواز ہی نہیں جو اسے مجھ تک پہنچا سکے، بس یہ سمجھ لیں کہ بھیک میں اپنا نام دان کیا ہے۔“ اس کی ایک ایک بات سے ٹپکتا زہر مشائم کے سارے جسم میں پھیل رہا تھا، وہ پتھرائی نظروں سے سرحان کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی، صفورا بیگم کا چہرہ ضبط سے لال انگارہ ہو گیا تھا، وہ اسے ذلیل کرنے کے لئے آئی تھیں، مگر وہ تو مشائم کی ذات کے پر نچے اڑا رہا تھا۔

”اگر اتنے ہی بے زار ہو تم، تو ابھی کے ابھی چھوڑ دو اسے نکاح کے تین بول ہی تھے نا طلاق کے بھی تین ہی بول ہوتے ہیں، تم جیسا کم ظرف اور دو ٹکے کا انسان اتنی اوقات ہی نہیں رکھتا کہ مشائم باجوہ کا اہل ہو سکے۔“ وہ رعونت سے ایک ایک لفظ کو چبا کر بولیں۔

”امی!“ مراد باجوہ نے عاجز آ کر جیسے التجا کی تھی۔

”جب کرو تم، یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے، جتنا تم کر چکے ہو اتنا ہی کافی ہے۔“ وہ اونچی آواز میں غرائی تھیں، مراد باجوہ لب بھیج کر رہ گئے۔

”سرحان باجوہ میں نے ابھی کچھ کہا ہے تم سے۔“

”سوری میں آپ کی کسی بھی کبی بات کا پابند نہیں ہوں، صفورا بیگم اور رہی بات طلاق کی تو



ہوئے تھے، وہ مسلسل نیچے دیکھتی جا رہی تھی۔  
 ”چائے۔“ دونوں ہاتھوں میں چائے کا  
 گ پکڑے کینی اس کے بالکل پیچھے کھڑی تھی،  
 مشائے نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر سیدھے ہو کر  
 مسکرا کر اس سے گ پکڑ لیا۔  
 ”اچھی چائے بنائی ہو تم۔“ اس نے گرم  
 چائے کا ایک گھونٹ لے کر بے معنی خاموشی کو  
 توڑا۔

”میں سب اچھا اچھا ہی کرتی ہوں۔“  
 کندھے اچکا کر وہ بے نیازی سے بولی۔  
 ”اتنا اعتماد ہے خود پر؟“ مشائے محظوظ ہوئی  
 تھی۔

”کیا آپ کو نہیں ہے خود پر؟“  
 ”ہے اور کیوں نہیں ہو گا؟“

”ہونا بھی چاہیے، آپ کے اعتماد پر تو مجھے  
 اعتماد ہے۔“ مشائے نے چونک کر اسے دیکھا، مگر  
 اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی، اس نے اس  
 کی اس ذمہ جملے کا مطلب پوچھنے کے لئے  
 ہونٹ کھولے ہی تھے کہ یعقوب باجوه کے گھر کے  
 گیٹ کے باہر کار آ کر رکنے پر وہ اندر سے پوری  
 کی پوری ہل گئی تھی، کھلے ہونٹوں کو بند کرنا تک  
 بھول گئی تھی، آنکھیں جھپکنا تک، کار سے نکل کر  
 جازم نے گیٹ کھولا تھا اور کار سے چلتی  
 سرخ روش پر آ کر رکنے لگی تھی، کار سے بیگ نکال  
 کر جازم سیدھا ہوا تو غیر ارادی نظر سامنے موجود  
 ٹیرس پر پڑی تھی اور پھر ٹھہر گئی تھی۔

”اوبائے۔“ اس نے ہاتھ ہلا کر بھر پور خوشی  
 کا اظہار کیا تھا، جواباً مشائے نے بھی ہاتھ ہلا کر  
 اسے ہیلو کہا تھا، کار سے نکلتا سر جان ایک لمحے کو  
 بس ایک لمحے کو منجھسا ہو گیا تھا مگر دوسرے ہی  
 بل وہ سر جھٹکتا اندر دنی جے کی طرف بڑھ گیا تھا،  
 فرزام بھی اس کے پیچھے تھا اور جازم اسے گھر

ایک دفعہ جو چیز میرے پاس آ جائے اسے تو میں  
 توڑنے کے بعد بھی نہیں پھینکتا۔“ اس کے الفاظ  
 کی کرچیاں بن کر مشائے کے دل میں کھب رہے  
 تھے، اپنی بات ختم کر کے وہ اٹھے سر اور مطمئن  
 انداز میں چلتا لان سے نکل گیا تھا بغیر اس پر ایک  
 نظر ڈالے، ایک نفرت بھری نظر کا حقدار بھی اس  
 نے اسے نہیں سمجھا تھا، اس سارے تماشے کو  
 مٹھیاں جھینچے دیکھتا آفان ایک ملامت بھری نظر  
 دادی پر ڈال کر مشائے کو وہاں سے لے گیا تھا، اس  
 کا چہرہ ضبط کے مارے تن گیا تھا اور وہ اٹھارہ سالہ  
 لڑکا کمرے میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا  
 تھا وہ اتنا کمزور ہرگز بھی نہیں تھا مگر محبتیں کمزور کر  
 دیتی ہیں اور اپنی بہن سے اسے بہت محبت تھی، مگر  
 مشائے کی آنکھوں میں تو خشک صحرا اتر آیا تھا، اس  
 رات کے اگلے دن مشائے اور آفان باجوه دونی  
 واپس چلے گئے تھے، دادی نے کیا کہا، گل ہما اور  
 یعقوب نے کیسے معذرت کی ان سب باتوں کی  
 اب جیسے اسے کوئی ضرورت نہیں تھی، کوئی پرواہ  
 نہیں تھی، مگر ایک بات طے تھی سر جان باجوه اور  
 صفورا بیگم کی نفرت کے باوجود اس کی محبت جو  
 کی توں تھی، وہ ڈھیت ابن ڈھیت ثابت ہوئی  
 تھی، اب ایسے تو ایسے ہی سہی۔

☆☆☆

رفاتوں میں وقار کھونا کوئی نے گا تو کیا کہے گا  
 یہ دن کو سونا یہ شب کو رونا کوئی نے گا تو کیا کہے گا  
 سچ بھنور میں پھوڑ آتے تو بات تم یہ یوں نہ آئی  
 یہ ساحلوں یہ ہمیں ڈبو نا کوئی نے گا تو کیا کہے گا  
 جوجی میں آیا تو خوب کھیلا جوجی میں آیا تو توڑ ڈالا  
 میرا دل بھی تھا اک کھلونا کوئی نے گا تو کیا کہے گا  
 وہ ریلنگ پر جھک کر کھڑی سر نیچے گرائے  
 ڈوبتے سورج کا ہی کوئی منظر دیکھ رہی تھی، اونچی  
 پونی میں بندھے بال کندھے سے آگے گرے

محبت پہ۔

☆☆☆

ہے نمایاں تیرے جذبات کی صداقت محسن  
ایک شخص کا برسوں تجھے پاگل رکھنا  
”وہیے کون سے الفاظ میں خراج تحسین  
پیش کروں میں تمہیں؟“ تکیے پر سینہ نکائے وہ بیڈ  
برالٹا لٹا تھا، سامنے پڑی کرسی کے بازو پر کہنی ٹکا  
غور سے تکیے پر چہرہ نکائے مشام کم صم بیٹھی تھی، بالکل  
اداس، کچھ کچھ افسردہ سی، سر حان اور فرزام شکار  
پر بکلتے تھے، یعقوب باجوہ ہاسپٹل اور غل ہما  
لاؤنچ میں تھیں۔

”بتاؤ نا کون سے الفاظ تخلیق کروں  
تمہارے لئے؟“  
”کچھ اس بند کر دو تم۔“ وہ بے زار ہو کر کھڑکی  
سے باہر دیکھنے لگی۔

”وہیے کتنا سر پرانزنگ تھا نا بندہ تمہارے  
سامنے بیٹھا تھا اور تمہیں پہچانتا نہیں تھا۔“ وہ اٹھ  
کر گود میں تکیہ رکھ کر آتی پائنتی مار کر بیٹھ گیا۔  
”میرے سامنے نہیں بیٹھا تھا۔“ وہ ہنوز  
باہر دیکھ رہی تھی۔

”ایک قسم کا سامنے ہی بیٹھا تھا بی بی، دیے  
جتنا وہ تمہیں اپنے پیچھے خوار کر چکا ہے نا اب تک  
تمہیں چاہے گا خرا کا کل میں ڈبکیاں کھا کر مر  
چکی ہوئی، لیکن نہیں کون سی لپچر قسم کی ہڈی  
تمہارے اندر فٹ ہے؟“ وہ اسے تپا رہا تھا اور وہ  
تپ رہی تھی۔

”تم سر پھڑ والو گے مجھ سے اور پھر تمہیں بتا  
لگ جائے گا کہ وہ کون سی لپچر ہڈی ہے۔“ مشام  
نے دانت کچکچائے۔

”وہیے مشام زیادتی نہیں کر دی تم نے  
میرے ساتھ، آخر ہے کیا اس میں جو اس کے  
سامنے تمہیں میں نظر نہیں آیا۔“ وہ گہری افسردگی

آنے کا کہہ رہا تھا، مشام نے آنے کا اشارہ  
کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بس پھر دیکھتی ہی رہ  
گئی، کبھی ٹیک ٹک، دنیا و ماغیبا سے بے نیاز جازم  
کو دیکھ رہی تھی جو اب اندرونی حصے کی طرف جا  
رہا تھا، مگر کبھی کی نظریں تو واپس پلٹنے سے انکاری  
ہوئی تھیں جیسے، وہ اندر چلا گیا تو وہ بھی جیسے دنیا  
میں واپس آ گئی تھی، مشام پر نظر پڑتے ہی اسے  
خفیف سا جھکا لگا تھا، وہ اسے کچھ کچھ معنی خیز اور  
کچھ ابھی نظروں سے دیکھ رہی تھی، کبھی نظریں چرا  
کر ریٹنگ کے نزدیک ہو گئی۔

”میرے انجام اور حال سے واقف ہونا  
تم؟“ وہ عام سے انداز میں بولتی اس کے ساتھ جا  
کر کھڑی ہو گئی تھی، شام کے سائے گہرے ہو  
رہے تھے، پرندے اپنے آشیانوں کی طرف  
واپسی کا سفر طے کرنے لگے تھے، کبھی کے سینے  
سے ایک بوجھل سی سانس برآمد ہوئی تھی۔

”واقف تو آپ دادی کی نفرت سے بھی  
تھیں مشام لیکن پھر بھی ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں  
تھیں بالکل اسی طرح واقف میں بھی ہوں مگر  
ڈٹ کر کھڑے ہونے سے خود کو روک میں بھی  
نہیں سکتی۔“ اس کی نظریں بہت دور کہیں گہرائی  
میں اترنے لگی تھیں۔

”دراصل انسان جب بے اختیار ہو جاتا  
ہے تو بے بسی کی بلند چوٹیوں پر پہنچ جاتا ہے اور بد  
قسمتی سے محبت ایک ایسا جاذبہ ہے جو انسان کو بے  
بسی کی بلند ترین چوٹی پر لے جاتا ہے، دل جب  
ضد پراڑ جائے تو آپ جانتی ہوں گی مشام کہ  
پھر سائیس بھی بے اختیاری ہو جاتی ہیں۔“ وہ  
بہت آہستہ بڑے ہی مدھم انداز میں ٹھہر ٹھہر کر  
بول رہی تھی، مشام نے تو حیران ہوئی اور نہ چونکی  
اس کے ہونٹوں پر رخ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی،  
محبت ہو اور بندہ گمشدہ نہ بنے، پھر ترف ہے ایسی

سے بولا۔

”انتاہنڈم اور گنڈلنگ ہوں میں بس ایک آنکھ کا اشارہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

مبالغہ آمیزی کی حد کرتا وہ ہر لگا تھا۔  
”بدگیز ذلیل انسان شرم نہیں آتی تمہیں ایک نمبر کے کہنے ہوتم، بھائی کی بیوی سے فلرٹ کرنے سے پہلے ڈوب کر مر جانا چاہیے تھا تمہیں۔“ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ارے واہ ایسے ہی ڈوب کر مر جاؤں اور بھائی کون سامنے لگا تمہیں۔“ مشائم نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا، بات بے شک وہ مذاق میں کر رہا تھا مگر تھی تو وہ حقیقت ہی نا، حقیقت بھی ایسی جودل کو جلا کر رکھ کر دے۔

جازم کو دیر سے ہی سہی مگر اپنے کہے الفاظ کی معنی کا احساس ہو گیا تھا، حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ اس سے ایسی باتیں کرتا رہتا تھا مگر آج مشائم کچھ زیادہ ہی زور دینا ہو رہی تھی۔

”ویسے بتاؤ نا جب بھائی تمہیں دیکھ کر بھی ان جان بن گیا تھا تو کیا تاثرات تھے تمہارے؟“ اب وہ کسی پورٹی طرح بیٹھا ہوی سنجیدگی سے اس کے جواب کا منتظر تھا، مشائم نے ٹھنڈی سانس اندر کھینچی۔

”کیا تاثرات ہونے تھے جازم، توقع نہیں تھی یوں، اس طرح اسے اپنے سامنے دیکھوں گی، وہ اپنے فرینڈ کی شادی پر آیا تھا اور میں دوست کے گزن کی شادی پر، کئی دفعہ ہم دونوں آنے سامنے ہوئے مگر ہر بار اس کی آنکھوں میں اتنی اجنبیت اور سرد مہری ہوتی تھی کہ میں چاہ کر بھی اسے مخاطب نہیں کر سکتی۔“ آخر تک آتے آتے وہ بڑی دل گرفتہ سی ہو گئی تھی اور جازم کے دل میں اس دل گرفتگی نے بڑا درد پیدا کیا تھا،

اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ سرحان کیا واقعی انتاسنگ دل تھا یا صرف مشائم کے لئے وہ آخری حد بھی عبور کرنا ثواب سمجھتا تھا۔

☆☆☆

جب سے اترا ہے آسیب کی مانند مجھ میں جوگی بن کر ہیں کئی خواہشیں محو رقصاں وہ رات کو جازم کے ساتھ لان میں چہل قدمی کر رہی تھی، جازم کو اس کا سایہ کہا جاتا تھا اور بالکل ٹھیک کہا جاتا تھا، آج وہ کچھ اداس تھی اور کیوں نہ ہوئی سرحان باجہ نے ایک نظر بھی اسے دیکھنے کا گناہ نہیں کیا تھا، آتے جاتے اڑتی پڑتی کوئی ایک نظر بھی مشائم کا مقدر نہیں بنی تھی اور ایسے میں جازم ایک پل کو بھی اس کا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، اسے ہنسانے کے لئے اس نے یونیورسٹی کے کئی قصوں میں مبالغہ آمیزی کی حد کر دی تھی اور جب تک مشائم کی ہنسی قہقہوں میں نہیں بدلی تھی تب تک اس نے مسلسل پائیں کندھے والے فرشتے کو زحمت دی ہوئی تھی۔

بچپن میں کھڑا اپنے تازہ لائے شکار کو بھونٹتا سرحان کتنی ہی دفعہ ان قہقہوں پر جڑ بڑ ہوا تھا اور ایک دو بار تو اس نے ناگوار سی نظر سے بھی لان والوں کو نوازا تھا، مگر وہ تھوڑی دیکھ رہے تھے جو اس شرف پر باغ باغ ہوتے، بچپن کی کھڑکی اس رخ پر تھی کہ لان سارا کا سارا بچپن میں سے نظر آتا تھا مگر باہر کھڑا کوئی بندہ اندر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”مشائم اب آجائیں واپس کچھ دادی پر رحم کھائیں۔“ رینگ پر آگے کو لگی کیفی آہستہ آواز میں چلائی۔

”دادی نے مجھ پر رحم کیا تھا جو میں دادی پر کروں۔“ وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی، کیفی نے بے چارگی سے اسے دیکھا، وہ چاہتی تھی کہ

”اگر تم پکڑنے کا ارادہ رکھتی ہو تو ہرگز انکار نہیں کروں گی۔“ اس نے آنکھیں پٹپٹا کر دیکھا عاشبہ اندر تک سلگ گئی۔

”تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ دادی اب جھوٹے تایا کو فون کریں۔“ اس نے دھمکی دینے کی کوشش کی، جس کا کم از کم مشائم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”ہاں تو کریں تاہم ہمارے جھوٹے تایا ان کے بیٹے ہوتے ہیں انہیں فون نہیں کریں گے تو کسے کریں گے۔“

”تم اتنی ضدی اور ڈھیٹ کیوں ہو مشائم؟“ وہ زچ ہو کر بولی، دادی نے غصے میں کھانا نہیں کھایا تھا، کھانا نہیں کھایا تھا تو دو ابھی نہیں لی تھی جس کی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر مسلسل ہائی جا رہا تھا اور کچھ مشائم کی لگائی آگ، وہ دوپہر سے یہاں تھی اور وہاں صفورا بیگم کی توپوں کا رخ بانی گھر والوں کی طرف تھا جن میں سر فہرست حاویہ، عاشبہ اور کیفی تھیں، ڈھیٹ مشائم تھی مگر اس کے حصے کی بھی عزت افزائی ان تینوں کا مقدر بنتی تھی، دادی کو لگتا تھا کہ یہ تینوں بھی اتنی ہی خود سر، اتنی ہی ڈھیٹ اور اتنی ہی کوٹھی والوں کی عشق میں پاگل ہیں، اگر نہیں ہیں تو ہو جائیں گی سو ضروری ہے کہ انہیں اوقات سر رکھا جائے، جو کہ وہ بڑی اچھی طرح رکھتی تھیں۔

”اچھا ہو گا کہ تم اب واپس آ جاؤ مشائم باجوہ، اگر تھوڑی سی غیرت رکھتی ہو تو کیونکہ جس کے لئے تم وہاں کھڑی ہو وہ تمہیں نظر بھر تو کیا ایک نظر بھی نہیں دیکھے گا، تم اس پر اپنے جذبات لٹا چکی ہو اور اپنی اتنا تک لٹا چکی ہو اور وہ بھرے ہاتھوں کھڑا تمہارا تماشا دیکھ رہا ہے، سو واپس آ جاؤ مشائم اس لئے نہیں کہ دادی انگاروں پر لوٹ رہی ہیں بلکہ اس لئے کہ تم نفرت میں جھلس رہی ہو اور یہ نفرت تمہیں اندر سے خالی کرتی جا رہی

مشائم اب واپس آ جائے اس سے پہلے کہ دادی کا پارہ مزید ہائی ہوتا، مشائم کو آ جانا چاہیے تھا۔

”پلیز مشائم دادی کا غصہ ہم سب پر نکل رہا ہے، کچھ تو ہمارے بارے میں سوچ لیں۔“ وہ منت کرتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے نا انجوائے کرو، مزہ لو۔“ وہ خود بھی بڑے مزے میں چہل قدمی کر رہی تھی، جازم نے نچلا ہونٹ دانٹوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکی، کیفی نے بے چارگی سے جازم کو دیکھا، دل تو چاہا کہ ایک دفعہ اسے مخاطب کر کے بولے کہ مشائم کو بھیج دو، مگر پھر خود ہی رک گئی دل میں چور ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر نظر ہم پر ہی فوس ہے ہر کان بس ہمیں ہی سن رہا ہے اور جو بات چھپی تھی اسے وہ خود سے کھولنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی، وہ مشائم باجوہ نہیں تھی جو ڈٹ جاتی وہ کیفی باجوہ تھی وہ مشائم کو سپورٹ تو کر سکتی تھی مگر اس کی طرح ہمت نہیں کر سکتی تھی، مگر ایک بات وہ جانتی تھی اور یہ طے تھا کہ محبت میں پہل کرنے کی حماقت ہمیشہ سے کوٹھی کی لڑکیوں سے ہی سرزد ہوتی تھی، جسے وہ اعزاز سمجھ کر کرتی تھیں۔

”تم اسے بلانے آئی تھی یا خود، یہاں بت بن کر کھڑے ہونے کے لئے؟“ عاشبہ کی تیز آواز پر ان دونوں نے مڑ کر اوپر دیکھا، جازم کو ٹھنکی باندھ کر دیکھتی کیفی بری طرح گڑبڑائی، مگر دیر ہو چکی تھی، ہمیشہ کی طرح وہ عاشبہ کے ہاتھوں پکڑی گئی تھی، ناگوار نظروں سے اسے دیکھ کر عاشبہ نے رخ روشن مشائم کی طرف موڑا۔

”تم اب گھر واپس آ جاؤ گی کہ پاؤں پکڑوانے کا ارادہ رکھتی ہو؟“ اس کا سرخ چہرہ اور کاٹ دار لہجہ اس بات کی نشانی تھا کہ بے چاری سخت قسم کی عزت افزائی کا اعزاز حاصل کر کے آئی ہے۔

ہے، رحم کھاؤ مشائم دادی پر نہیں بلکہ خود پر۔“ بات مکمل کر کے اس نے انہی نظروں سے کبھی کو دیکھا تھا جو وہ مشائم پر گاڑے ہوئی تھی، کیفی آنکھوں میں نمی لئے اس کے پیچھے ہی وہاں سے چلی گئی تھی، مشائم نے اس سارے زہر کو بڑی مشکل سے اپنے اندر اتارا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی لکڑی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی اور کچن میں کھڑا سرحان دیر تک لان میں اس جگہ پر نظریں جمائے رہا جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑی تھی۔

☆☆☆

ہر چند کے حالات موافق نہیں پھر بھی دل تیری طرف داری میں سفاک بہت ہے ”السلام علیکم!“ لان میں رکھی چیز پر بیٹھتے ہوئے اس نے ان تینوں کو سلام کیا جو گول میز کے ارد گرد رکھی کرسیوں پر بیٹھیں خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔

”وعلیکم السلام، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی، میں آنے لگی تھی آپ کے پاس لیکن پھر دادی نے منع کر دیا کہ آپ کو آرام کرنے دوں۔“ اس کا حال پوچھ کر کیفی نے آخر میں منہ بسورا، مشائم ہلکا سا مسکرائی۔

”اب بہتر ہوں، دراصل زکام کی وجہ سے طبیعت زیادہ خراب محسوس ہو رہی ہے۔“ بدلتے موسم کی وجہ سے مشائم کورات سے بخار اور زکام تھا، جس کی وجہ سے وہ سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی، شام کو طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ فریش ہو کر لان میں نکل آئی تھی۔

”ایم سوری مشائم کل میں کچھ زیادہ ہی تلخی سے بول گئی، لیکن مجھے اپنی کبھی باتوں پر اتنا انوس نہیں ہے، کڑوی ہی سہی لیکن وہ حقیقت تھی، جسے اب تمہیں مان لینا چاہیے۔“ عاشبہ کی

بات پر مشائم کا چہرہ ایک دم سے تن گیا تھا۔ ”شکریہ اس نصیحت کے لئے، لیکن کیا ہے نا عاشبہ مجھے نصیحتیں پسند نہیں ہیں، تو نہ میں کرنے میں انٹرسٹ رکھتی ہوں اور نہ سننے میں، سو پلیز بی کیئر فل فاریکسٹ ٹائم۔“ بات مکمل کر کے وہ کرسی سے اٹھی اور مناسب قدم اٹھاتی مین گیٹ عبور کر گئی، کچل میں نکل کر اس نے قدرے لمبا سانس اندر کھینچا ایسے جیسے اپنے تنے اعصاب کو ڈھیلا کر رہی ہو، حالانکہ اس وقت خواہش ایک ہی تھی کوئی پرسکون سنانا کونا ہو جہاں گھنٹوں میں سردیے کر وہ بے تحاشا روئے اتار دے کہ ہر جذبہ آنکھوں کے رستے آنسوؤں میں بہہ جائے پھر کوئی محبت، کوئی عشق اس کے اندر باقی نہ بچے جو اسے خوار کر سکے جو اسے اس طرح سے تماشائے بنا سکے کہ وہ ہر کسی کے لئے ایک ٹریجڈی ڈرامہ بن کر رہ جائے۔

اس نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے جیسے تکلیف دہ تاثرات مٹانا چاہتی ہو، ایک ہاتھ سے بالوں کو صحیح کیا اور یعقوب باجہ کے گھر کے اندر داخل ہو گئی، مگر آگے بڑھتے قدم کشش ثقل میں جیسے الجھنے لگے تھے، لان میں بیٹھے یعقوب باجہ، ظل ہما اور سرحان کو دیکھ کر وہ رک گئی تھی، یعقوب باجہ اور ظل ہما دونوں کی پشت اس کی طرف تھی مگر سامنے بیٹھا سرحان ایک سرسری نظر اٹھا کر ٹھہر گیا تھا مشائم کی آنکھوں میں پھیلا درد اس کے اندر قطرہ بہ قطرہ اترنے لگا تھا، مشائم نے آنسوؤں کا گولا بہ مشکل حلق سے نیچے اتارا، چند لمحوں پر ٹھہر جانے والی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پھر واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

”آپ کو اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا

تجاوز کریں گے تو سراسر زلت و رسوائی ہی مقدر بنے گی دادی کا خوف بھی کے دل میں ہو گا میرا نہیں خیال کے دادی کی عزت کسی کے دل میں ہو اور مشائلم.....“ اس نے گہری سانس کھینچی۔

”مشائلم کے حال سے تو واقف ہی ہو اور یقیناً مستقبل کی پیش گوئی بھی ناممکن نہیں۔“ عاشبہ نے اسے کچھ جتنی نظروں سے دیکھا۔

”اور اگر تم نے اپنے قدموں کو یہی پر نہ روکا کہینی تو تمہارا مستقبل بھی کچھ ایسا ہی ہو گا۔“ کہینی کا دل ڈوب سا گیا تھا، کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ مشائلم کتنی اذیت میں ہے؟ اذیت میں تو وہ خود بھی تھی، یک طرفہ محبت اذیت ہی تو ہوتی ہے۔

محبت کا حصول شاید ناممکن تھا اور اس رات سے واپس پلٹ آنا ناممکن تر، عاشبہ اس کے اندر آگ بھڑکا کر خود وہاں سے جا چکی تھی، مگر وہ جو آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بار بار ہتھیلیوں سے رگڑتی تھی وہ چھوٹی سی لڑکی محبت میں جل رہی تھی۔

☆☆☆

”آپ بھائی سے بات کریں امی، اگر انہیں مشائلم قبول نہیں تو آزاد کر دیں اسے، جب مرنا ہی ہے تو ایک ہی دفعہ مر جائے وہ، یوں وہ روز روز مرنے کیوں اذیت میں رہے۔“

اس کے سخت الفاظ مگر دل برداشتہ انداز غل ہما کو بھی دل گرفتہ کر گئے، جازم نے آنکھوں میں ابھرتی نمی کو ہتھیلیوں سے رگڑا، وہ آج ایسے دیکھ کر آیا تھا، وہ لمبی سڑک پر دور تک جاتی تھی اور اس کے گال جھکتے جاتے تھے، ڈھلتی شام میں وہ پاگل دکھتی تھی، محبت میں بکھری لگتی تھی، عشق میں مرنے لگتی تھی اور جازم کو اس ٹوٹی بکھرتی لڑکی پر ٹوٹ کر ترس آیا، وہ غل ہما کو نہ بھی بتاتا تو کیا وہ

مشائلم سے۔“ کہینی سے عاشبہ کا لہجہ و انداز برداشت نہیں ہوا تھا، بلکہ ہمیشہ ہی وہ جب بھی مشائلم سے تلخ انداز میں بات کرتی تھی کہینی بہت برا محسوس کرتی تھی، اس لئے اب بھی حادیہ کے اندر جاتے ہی وہ عاشبہ سے الجھنے لگتی تھی۔

”کس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی؟“ عاشبہ نے ابرو اچکائے۔

”یوں اتنی مخی اور سختی سے، سر جان بھائی کا معاملہ مشائلم کا انتہائی پرسٹل میٹر ہے، آپ کو تو کیا کسی کو بھی اس میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”حق ہے مجھے، تمہیں اور اس فیملی کے ہر ایک بندے کو حق ہے، کوئی بھی معاملہ پرسٹل بس اس وقت تک ہوتا ہے جب وہ صرف آپ کی ذات سے منسلک ہو، لیکن یہ معاملہ صرف مشائلم کی ذات تک محدود نہیں ہے، دادی انوالو ہیں اس معاملے میں اور وہ کھسٹ کر ہمیں بھی اس میں انوالو کرتی ہیں۔“ اس نے گہری سانس کھینچی اور کرسی کی پشت سے شک لگائی۔

”دادی کی شدید نفرت اور مشائلم کی شدید محبت دونوں ہی حد سے بڑھے ہوئے جذبے ہیں اور جب اتنی شدت سے دو مخالف جذبات ٹکرائیں گے تو تباہی تو ہوگی ہی اور اس تباہی میں مشائلم کے ساتھ ساتھ ہم سب کا کہیں نہ کہیں نقصان تو ضرور ہوگا۔“ وہ آسمان کو دیکھتے بولتی جا رہی تھی، رواں اور آہستہ آواز میں، جیسے خود سے ہی ہم کلام ہو۔

”جذبے اعتدال میں ہی اچھے لگتے ہیں کم از کم اب میرا ایمان تو اسی بات پر ہے، دادی کے اندر اتنی ہمت نہیں کہ وہ مشائلم کو سر جان کے ساتھ دیکھ سکیں اور مشائلم کے اندر اتنی ہمت نہیں کہ وہ سر جان کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ ہی سکے، اتنے شدید جذبے جب اپنی حدود سے

آواز نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا، آنسو منجمد ہو گئے۔

”تمہارے اندر تو اس راہ پر چلنے کے لئے ہمت اور حوصلہ ہی نہیں۔“ سردی سے زیادہ بے رخی کا تاثر تھا اس کے انداز میں، کیفی کو برا لگا، اتنی بے اعتباری۔

”تم نے مجھے کون سا دلاسہ دیا ہے جازم باجوہ جو ہمت اور حوصلے کی بات کرتے ہو، پہلے عہدہ دو اور پھر حوصلے کی بات کرنا۔“

”میں عہدہ دیتا ہوں کیفی باجوہ، میں جازم یعقوب محبت کے ہر موڑ پر تمہیں سراپا محبت ملوں گا۔“ کیفی نے بے یقینی سے اس کے روشن چہرے کی طرف دیکھا جہاں محبت نور بن کر چمک رہی تھی اور اندھیرے میں ڈوبی اندھیرے ہی کا حصہ بنی مشائیم سوچ رہی تھی، کیا عہدہ دینے والوں کے چہرے پر ایسا ہی نور چمکتا ہے؟ اور ان دونوں سے اوپر ٹیرس پر کھڑا سر جان سوچ رہا تھا کہ اس نے مشائیم کو کون سا عہدہ دیا تھا جو وہ اتنا سفر بڑے حوصلے اور ہمت سے طے کر آئی تھی؟ اس نے تو نفرت کا سمندر بہایا تھا اس کے پاس ایسا کون سا عصا تھا جو محبت کے راستے بناتا آیا تھا۔

☆☆☆

ہم سے نفرت واجب تھی انہیں یہ نہ کرتے تو پیار ہو جاتا صبح سحر کا وقت ہوا تو مغرب کی طرف سے آئیں کالی گھنائیں ٹوٹ کر برسیں، زمین جل تھل ہو گئی اور سوندھی خوشبو ہر سو پھیل گئی، غل ہانے نماز اور تلاوت ختم کی اور چمن میں چائے بنانے چلی گئیں ان کے ہونٹوں پر مسلسل درد جاری تھا ایک اضطراب تھا جو ان کے چہرے سے جھلک رہا تھا جسے یعقوب باجوہ نے با آسانی پڑھ لیا تھا ان کے سامنے پڑے میز پر چائے رکھ کر وہ خود

خود نہیں جانتی تھیں کہ انتظار طویل ہو جائے تو نظریں پھرا جاتی ہیں، دل معمول سے ہٹ کر چلنے لگتا ہے، بے اعتبار جو ہو جاتا ہے، جازم انہیں سوچوں میں الجھتا چھوڑ کر باہر لان میں نکل آیا، اس نے لمبی سانس خارج کی مگر دل کا بوجھل پن جوں کا توں رہا۔

بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ پیچھے مڑا تو چونک گیا، لکڑی کے دروازے کو زور سے ٹھک کی آواز کے ساتھ اپنے پیچھے بند کرتی بھیگی بھیگی آنکھوں میں آنسو لائے وہ گئی تھی ایسے مکمل نظر انداز کرتی اندرونی حصے کی طرف آرہی تھی جازم دس قدموں کا فاصلہ پلک جھپکتے طے کرتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”پیچھے ہٹو مجھے غل ماں سے بات کرنی ہے۔“ اس کی آنکھوں کی طرح اس کی آواز بھی پرخم تھی۔

”کیوں خیریت ہے؟ کیا بات کرنی ہے؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا، البتہ گہری نظریں کیفی پر جمی تھیں۔

”غل ماں سے کہو وہ مشائیم کو پولیس وہ واپس چلی جائے یہاں سے۔“ آنکھوں میں ر کے آنسو گالوں پر گر پڑے۔

”اور اگر غل ماں نے کہا کہ تم بھی اب واپس پلٹ جاؤ کیفی تو پھر؟“ سینے پر دونوں بازو باندھے اس کی طرف دیکھتا، وہ اسے حد سے زیادہ بے حس لگا اور کیفی کو ٹھک ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کو بے حس وراثت میں ملی ہو جیسے، آخر دل بھی کہیں اتنا بے رحم ہوتا ہے۔

جازم استغاثہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، کئی پل تک، خاموش نگاہوں سے یہاں تک کہ کیفی ایک قدم واپس ہوئی اور اس سے پہلے کہ وہ مڑتی اور پلٹ جاتی، وہ جازم کی سرد

بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں، یعقوب باجوہ بغور ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے؟“ ان سے رہانہ گیا تو پریشانی کی وجہ پوچھنے لگے۔

”ہاں آج سرحان واپس ڈیوٹی پر جا رہا ہے۔“ انہوں نے تنے تنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟“ انہوں نے حیرانگی سے پوچھا، جواباً غل ہما نے انہیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کیا آپ کو نہیں پتا، مگر وہ ان کی نظروں کا مفہوم سمجھنے بغیر سابقہ انداز میں ان کی طرف دیکھتے رہے۔

”یعقوب میں چاہتی ہوں کہ سرحان اب کوئی فیصلہ کر لے چھ سال ہو چکے ہیں نکاح کو، اس سے پہلے کہ مراد اور نتاشا مجھ سے سوال کریں، مجھے سرحان سے اب بات کر لینی چاہیے۔“

”ہوں تو اصل پریشانی یہ ہے۔“ انہوں نے گہری سانس کھینچ کر چائے کا کپ اٹھالیا، غل ہما نے اثبات میں گردن ہلائی اور کرسی کی پشت سے کمر نکا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کیا جواب ہو گا سرحان کا؟“ یعقوب نے سوالیہ نظروں سے ان کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔

”ان گزرے دنوں میں جو سرحان کا رویہ مشائم کے ساتھ رہا ہے وہ کوئی اتنا حوصلہ افزا نہیں ہے بلکہ بالکل بھی حوصلہ افزا نہیں ہے، ان گزرے چھ سالوں میں اس نے ایک دن بھی کبھی خود سے مشائم کے بارے میں بات نہیں کی، اس کا رویہ پہلے دن کی طرح سرد سا ہے۔“

”ہوں، چلو تم ایسا کرو پہلے اس سے بات

کر کے دیکھ لو، ہو سکتا ہے کوئی حوصلہ افزا جواب مل جائے۔“ وہ پرسوج انداز میں بولے، غل ہما نے اثبات میں گردن ہلا کر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

☆☆☆

بارش کچھ کم ہوئی تو یعقوب ناشتہ کرنے کے بعد ہسپتال چلے گئے، جازم ابھی تک سو رہا تھا، وہ اپنے اندر ہمت جمع کر کے سرحان کے کمرے کی طرف چلی آئیں، جواب ضروری بھی تھا اور جواب تکلیف دہ بھی، وہ ایک ایسی ماں تھیں جو اپنے بچوں کی رگ رگ سے واقف تھیں اور وہ بھی سرحان کو جانتی تھیں، اس لئے قدم لڑکھڑا رہے تھے، دل کہتا تھا جو اک پردہ ہے اسے رہنے دیا جائے، یہ پردہ درمیان سے ہٹا تو بہت تکلیف ہوگی مگر پھر مشائم کا چہرہ ان کے قدموں کی مضبوطی بن جاتا، آخر اب جواب تو ضروری تھا۔

کالی شرٹ جس کے کف اس نے کبھیوں تک موڑے تھے، نیلی جینز اور بلیک شوز وہ مکمل تیار تھا جانے کے لئے، اپنا مختصر سامان وہ بیگ میں رکھ رہا تھا، شرٹس بیگ میں رکھ کر اس نے جھکا سر اٹھایا تو دہلیز میں کھڑی غل ہما کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، جواباً غل ہما کے ہونٹ بھی دائیں بائیں پھیلے مگر ان کی مسکراہٹ میں وہ شائستگی نہیں تھی، جو کہ ہوتی ہے اور جو کہ ہونی چاہیے۔

”اندر آئیں نا آپ وہاں کیوں کھڑی ہیں؟“

”تم جا رہے ہو؟“ ست قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے غیر ارادتا پوچھا۔

”جی آج شام تک ڈیوٹی جو اس گرنی ہے اس لئے جلدی نکلوں گا۔“ تفصیل سے بتا کر اس



نے بیگ کی زپ بند کی۔

☆☆☆

کوئی ملتا ہے تو اب اپنا ہاتھ پوچھتا ہوں  
میں تیری کھوج میں تجھ سے بھی پرے جا نکلا  
توڑ کر دیکھ لیا آئینہ دل تو نے  
تیری صورت کے سوا اور بتا کیا نکلا  
آنسو آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گالوں پر گر  
رہے تھے وہ گھر کے پچھلے حصے میں رکھی کرسیوں  
میں سے ایک پر ایسے کھلے بالوں میں دونوں  
ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے آگے کو جھک کر بیٹھی  
تھی جسے سب ہار کر آئی ہو، اب تک کا سفر ایک  
سراب کا سفر ہو اور حقیقت اب آشکار ہوئی ہو، زخم  
سارے کھلے پڑے ہو اور کوئی دست مسیحا نہ ہو۔

اب کہیں جا کر مشام کو احساس ہوا تھا اس  
محبت کے کھیل میں، سارا خسار تو اسی کا تھا، اتنے  
سال جو وہ کھیلی تو صرف خود کے ساتھ، اپنے  
جذبات کے ساتھ، اپنی محبت کے ساتھ، اپنی  
ذات کے ساتھ غل ہانے جو ٹوٹی بھری مشام  
کو دیکھا تو خود بھی ٹوٹ گئیں، ایسا بھلا کب سوچا  
تھا انہوں نے، ان نے تو بس یہی چاہا تھا کہ  
مشام ہمیشہ ان کے پاس رہے، ذرا سی خود غرضی  
دکھائی تھی انہوں نے اور سزا اتنی تکلیف دہ۔

وہ خاموشی سے سر جھکا کر اس کی سامنے والی  
کرسی پر بیٹھ گئیں، مشام نے بھی اتنی ہی خاموشی  
کے ساتھ اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا، اس کی مدھم  
مدھم سسکیاں غل ہا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا  
طوفان لا رہی تھیں، مگر وہ بے بس تھیں، جتنا وہ  
اسے مجبور کر سکتی تھیں وہ کر چکی تھیں۔

☆☆☆

اور وہ نہ مجبور ہونے والا بندہ بیگ کندھے  
پر رکھے یوں جا رہا تھا جیسے پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو  
پتھر ہو جائے گا، مدھم ہونٹیں پتھریوں کی آوازیں  
اس کے اندر جمع ہوتی جا رہی تھیں، بارش رک چکی

”سرحان مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“  
سو کھے لبوں پر زبان پھیرتیں وہ چہرے سے  
پریشان دکھتی تھیں، سرحان نے ان کے چہرے  
سے چھلکتے اضطراب کو بغور دیکھا تھا بھنوں میں سکیڑ  
کے اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف  
دیکھا۔

”مجھے تم سے مشام سے متعلق بات کرنی  
ہے سرحان، آخر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے اس کے  
بارے میں؟ آخر کون سی منزل دو گئے تم اپنے  
رشتے کو؟“

”میرا تو رشتہ تو نہیں ہے یہ آپ کا زبردستی  
کا بنایا گیا رشتہ ہے۔“ وہ طنز یہ مسکرایا۔  
”اور منزل میں کیا اسے منزل دوں جس  
کے راستے پر میں کبھی چلا ہی نہیں۔“ اس نے  
کندھے اچکائے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا،  
غل ہا کو اس کی بے حسی اور سرد مہری پر تاسف ہوا  
اور بے یقینی بھی، اتنی شدت سے کی جانے والی  
محبت کا جواب اتنی سرد مہری سے کیسے دیا جاسکتا  
ہے؟ وہ جس خاموشی کے ساتھ آئی تھیں، اسی  
خاموشی کے ساتھ واپس پلٹ گئی تھیں وہ جواب  
لینے آئی تھیں اور جواب انہیں دے دیا گیا تھا مگر  
یہ تو سرحان ہی جانتا تھا کہ جواب کسے دے رہا  
تھا، وہ بیڑھیوں کے وسط میں کھڑی مشام کو دیکھ  
چکا تھا جو غل ہا کو بیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر ان کے  
پچھے ہی وہاں آئی تھی، بارش بوندا باندی کی  
صورت تھی اور اب وہ بھی ختم ہو گئی تھی، غل ہا کو  
ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھ وہ رخ موڑ کر بیڑھیاں  
اترنے لگی، انہوں نے گہری سانس چھینتی ایک  
طرح سے یہ بھی ٹھیک تھا اس نے خود ہی سن لیا تھا  
ورنہ اسے کیسے یہ سب بتاتی یہ بھی ایک مشکل ترین  
مرحلہ تھا۔

تھی اور درختوں کے پتوں پر بارش کے قطرے یوں اٹکے تھے جیسے پلکوں کی باڑ پر رکے آنسو۔

☆☆☆

واپسی کا سفر بہت بوجھل دل کے ساتھ طے ہوا تھا، حالانکہ نفرت تو بس اسے صفورا بیگم کے رویے سے تھی ان کے حقیرانہ انداز سے تھی، مشائخ تو بس اس کے اندر کا غبار نکلنے کا روزن بن گئی تھی، جس پر اپنی بے رخی اس نے دل کھول کر ظاہر کی تھی اور اب دل بالکل خالی تھا، جس میں ان سسکیوں کی آوازیں صحرا کی دھول کی طرح چکراتی تھیں، جن کو وہ سن کر آیا تھا اور جن سے وہ بچ کر آیا تھا۔

آفس میں وہ رات تک رہا تھا اور بالکل ایسے تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو، گل ہما کو وہ ایک قسم کا جواب دے کر آیا تھا، مگر کچ تو یہ تھا کہ وہ خود کو بھی اس طرح کا کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا، ہاں یہ سچ تھا کہ ان چھ سالوں میں اس نے مشائخ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی مگر اس سب کے باوجود وہ اس رشتہ کو ختم کرنے کو تیار نہیں تھا، وہ مشائخ کے ذریعے سے صفورا بیگم کو تکلیف دینا چاہتا تھا، ان سے اس رویے کا بدلہ لینا چاہتا تھا جو وہ اس کے ساتھ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ روا رکھتی تھیں، اس نے مشائخ سے بھی نکاح کے بارے میں نہیں سوچا اس کی اپنے لئے بے تحاشا محبت کے باوجود، وہ ہمیشہ اس کو انور کرتا آیا تھا، آج تک انور کر رہا تھا، وہ فطرتاً خود کو اپنے احساسات کو چھپا کر رکھنے والا تھا، اگر چاہتا بھی تو کسی پر بھی اپنی محبت ظاہر نہیں کر سکتا تھا، لفاظی اسے آتی نہیں تھی اور اس کے ماتھے سے تیوریاں ہٹتی نہیں تھیں، جو کسی کو اس کے قریب نہیں آنے دیتی تھیں، یہ بات اسے

معلوم تھی مگر وہ خود بھی مجبور تھا، انسان عادت بدل سکتا ہے فطرت نہیں۔

شدید ابھمن میں گھرا کرے میں چکر کاٹ رہا تھا، وہ اب تک چار اسٹراٹگ چائے کے کپ پی چکا تھا اور اب بھی آرڈر دے کر پلٹا تھا جب دروازے میں کھڑے فرزام کو دکھ کر چونکا، اس کی نظر بے ساختہ کھڑی کی طرف اٹھی تھی، جہاں رات کے ایک بج کر اکیس منٹ ہوئے تھے۔

”خیریت تم اس وقت یہاں؟“

”تم ریڈیٹس پر نہیں ملے سو سوچا یہاں چیک کر لوں۔“ فرزام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگا۔

”ویسے سب ٹھیک ہے نا، ٹائٹ ڈیوٹی ہے آج کیا؟ یا اوپر سے کوئی خاص آرڈر آئے ہیں؟“ یونیفارم کے کف لکس فولڈ کرتا وہ ریلیکس انداز میں بیٹھا، نفی میں سر ہلاتا سر حان میز کے کونے سے کمر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

”بس یونگی۔“

”واہ اسنے ذمہ دار آفیسر ہمیں کہاں ملیں گے۔“ فرزام کی گفتگو پر وہ پھیکا سا سکریا، فرزام نے اس کا یہ انداز خاص نوٹ کیا۔

”خیریت سر حان کوئی پریشانی ہے کیا؟“ وہ کرسی پر سیدھا ہوا، سر حان نے گہری سانس لی بھینچی اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”پتا نہیں یار مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی، سب کچھ میں اپنی مرضی سے کرتا رہا، نکاح کے بعد امی یا ابو میں سے بھی کسی نے مجھے ٹوکا نہیں، شاید وہ اپنی جگہ شرمندہ تھے زبردستی نکاح کی وجہ سے یا نکاح پر ہونے والی بد مزگی سے ناراض، مگر مشائخ کا تذکرہ ان میں سے بھی کسی نے کبھی میرے سامنے نہیں کیا، مشائخ نے خود سے بھی کبھی مجھ

وہ بہت کم عرصے کے لئے سکون دے سکتا تھا۔  
 ”ویسے سرحان مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب  
 مشائے بہت جلدی واپس چلی جائے گی اور اگر ایسا  
 ہو گیا تو تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔“ وہ  
 بات ادھوری چھوڑ کر سرحان کے چہرے پر پھیلنے  
 والے سوالیہ تاثرات دیکھنے لگا، اب اس سے پہلے  
 کہ سرحان ”اب آگے بڑھو“ بولتا اس نے خود سے  
 ہی جلدی سے بولنا شروع کر دیا۔

”دیکھو نا ملک کے حالات، ڈیوٹی کے  
 بارے میں سخت احکام، تمہارے سامنے ہی ہیں،  
 مشائے دوبئی واپس جائے اس سے پہلے ہی تم  
 اسے پاکستان میں ہی روک لو، کیونکہ یہ تمہاری  
 مکمل فیلنس تمہیں مجبور کر دے گی کہ تم مشائے سے  
 بات کرنے اس کے پیچھے جاؤ اور وہاں جانے کا  
 پھر نقصان۔“ بات کو دوبارہ اسی موڑ پر لا کر اس  
 نے پھر سے ڈرامائی وقفہ دیا۔

”اب آگے کی بکواس جلدی کرو گے؟“  
 سرحان نے گھڑی دیکھتے ہوئے غلٹ ظاہر کی تو  
 فرزام جی بھر کر بد مزہ ہوا۔

”بکواس تو یہی ہے وہاں جانے کی تمہیں  
 چھٹی نہیں ملے گی اور اگر مل بھی گئی تو ٹکٹ ہی  
 ضائع کر دو گے، انہی پیسوں سے اپنے ویسے پر  
 آئے لوگوں کو کھانا کھلا دیتا۔“ اس نے معصوم شکل  
 بنا کر مفت مشورہ دیا، مگر سننے والے نے انتہائی  
 برے موڈ کے ساتھ اسے گھورا تو اسے اپنی ساری  
 محنت اکارت جانی ہوئی نظر آئی۔

”یاد تیرا بھائی تھر ہے۔“ فرزام نے تھک  
 ہار کر جازم کو کونج سینڈ کیا، وہ جازم کے کہنے پر ہی  
 سرحان سے اس ٹاپک پر بات کرنے کے لئے  
 تیار ہوا تھا، ورنہ وہ اچھی طرح سے سرحان کی بے  
 زاری اور ناراضگی سے واقف تھا، وہ اپنی سنا تو  
 سکتا تھا مگر سننے والوں میں سے نہیں تھا۔

سے کوئی رابطہ نہیں رکھا، کبھی کوئی شکوہ نہیں کوئی  
 شکایت نہیں، وہ ٹوٹ کر محبت کرتی رہی اور نفرت  
 وصولی رہی، مگر اب گزشتہ کچھ دنوں سے اس کی  
 آنکھوں میں ایک شکوہ سا مچلتا مجھے محسوس ہوتا  
 ہے، اک حزن کرب جو مجھ تک پہنچ کر مجھے بے  
 بس کر رہا ہے، میں عجیب گھٹی فیل کر رہا ہوں۔“ وہ  
 الجھا الجھا بے ربط بولتا جا رہا تھا، جبکہ فرزام کے  
 ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”مطلب محبت کا تیر تمہارے دل پر چل  
 گیا، اور تو بھی عاشقوں میں شمار ہونے والا  
 ہے۔“ وہ ایک دم سے تالی مار کر چپکا، سرحان کا  
 موڈ بری طرح سے بڑھا۔

”شٹ اپ ڈفر، گھٹی فیل کرنے کا مطلب  
 یہ نہیں ہے کہ مجھے اس سے کوئی محبت و جت ہو گئی  
 ہے بے وقوف انسان۔“ سرحان اسے خونخوار  
 نظروں سے گھور رہا تھا، فرزام جل سا ہو کر بیٹھ  
 گیا۔

”کوئی محبت و جت نہیں تو پھر چھوڑ دو  
 اسے۔“ خجالت کا اثر زائل ہوتے ہی وہ تیز لہجے  
 میں بولا، سرحان کی خونخواریت میں اضافہ ہوا۔  
 ”کیوں چھوڑ دوں میں اسے بیوی ہے وہ  
 میری۔“  
 ”بڑا خوش رکھا ہوا ہے نا تم نے اپنی بیوی  
 کو۔“

”تجھ سے مطلب، تو بکواس بند رکھ۔“  
 ”تو پھر مجھے کیوں اپنی یہ رام لیلیا سنا سا کر  
 جذباتی کر رہا ہے، جا دیا رائے راوی کے کنارے  
 بیٹھ کر اپنا غم ہلکا کر۔“ فرزام بے مروتی سے بولا  
 اور بے قاعدہ منہ موڑ کر بیٹھ گیا، سرحان کو اس کی  
 اداکاری ایک آنکھ نہ بھائی، وہ چپ چاپ دوسری  
 کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، فرزام نے اسے کن اکھیوں  
 سے دیکھا اور اس کی طرف رخ موڑ لیا، زبان کو

تم میرے ہو کر نہیں دیتے!!

سب سے مل کر مشائیم کار میں بیٹھی اور جازم نے کار آگے بڑھا دی، پیچھے رہ جانے والوں کی آنکھوں میں نمی موتیوں کی طرح چمک رہی تھی، سوائے عاشبہ اور صفورا بیگم کے۔

عاشبہ کی آنکھوں میں اس کی ناکام محبت پر افسوس تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ ٹھیک ہی ہوا مشائیم چلی گئی یہاں رہ کر سرحان کی بے رخی اور سرد مہری برداشت کرنے کا کیا فائدہ اس کی نظر میں مشائیم کی محبت محض ایک حماقت کے سوا کچھ نہیں اور اسے لگتا تھا آہستہ آہستہ مشائیم بھی یہ بات تسلیم ہی لے گی۔

کمرے کی گلاس وال کے سامنے کرسی پر بیٹھیں صفورا بیگم کی نظریں بھی دھول اڑاتی کار کے تعاقب میں تھیں، مشائیم ان سے ملے بغیر چلی گئی تھی، انہیں دکھ تو ہوا مگر غصہ نہیں آیا۔

”ٹھیک ہے وہ حق بجانب ہے۔“ ان کا دل دلائل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

”دل پر چوٹ لگے تو نفرت اپنی ذات سے ہوتی ہے اور پوری کائنات سے۔“ ان کے دل سے ہوک اٹھی۔

دل پر چوٹ تو وہ بھی کھائے ہوئے تھیں، انہیں سرحان میں ابراہیم باجوہ کا عکس نظر آتا تھا، ہاں سرحان کسی کے عشق میں یا گل نہیں تھا جبکہ ابراہیم باجوہ نے یعقوب باجوہ کی ماں کی خاطر صفورا بیگم اور ان کی محبت کو دو کوڑی کا کر دیا تھا، حالانکہ صفورا بیگم سے نکاح کے بعد بھی وہ اس محبت کے حصار سے کبھی باہر نکلے ہی نہیں تھے، جس میں ساری زندگی کے لئے وہ قید ہو گئے تھے، مگر نکاح کے بعد صفورا بیگم نے ان کی محبت کی چاہ بھی نہیں کی تھی، وہ تو اپنی محبت، اپنی عزت

فرزام کا منہج پڑھ کر جازم نے سر ہاتھوں میں گرالیا، سرحان کے واپسی کے تاثرات دیکھ کر اسے کچھ امید بندھی تھی مگر اب وہ بھی ختم ہو گئی تھی، مشائیم کل رات دس بجے کی فلائٹ سے واپس دوپٹی جا رہی تھی اور جازم چاہتا تھا کہ سرحان اسے جانے سے روک لے، مگر سرحان کی بے نیازی عروج پر تھی، گل ہانے اب اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی، وہ بس اس لمحے سے ڈر رہی تھیں جب انہیں نتاشا اور مراد کو سرحان کا رخصتی کرانے سے انکار پہنچنا تھا۔

لمحہ بہ لمحہ بھیکتی رات کے پچھلے چاند کا عکس اس کے چہرے پر پڑتا تھا، ٹیرس پر وہ سینے پر دونوں بازو باندھے خاموش کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھی اور بس دیکھتی جاتی تھی، جیسے اپنے درد کو اس تک پہنچا رہی ہو اور وہ اس کا درد بانٹ رہا ہو، اس خاموش کھڑی لڑکی کے اندر کو پڑھ رہا ہو، جانتا ہو جو آنسو بہتے نہیں وہ اندر گرتے ہیں اور کیا تابہی مچاتے ہیں، رات بھیکتی ہوئی، سحر سے جاگتی اور مشائیم نے اپنی گلابی پڑتی آنکھوں سے آخری تارے کو سفیدی میں چھپتے دیکھا، سورج کی شعاعوں کے ٹکھرنے سے پہلے وہ پلیٹ کر کمرے میں چلی آئی، بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں موند لیں، سر ایسے تھا جیسے پل بھر میں پھٹ جائے گا۔

جتنی دعائیں آتی تھیں

سب مانگ لیں ہم نے

جتنے وظیفے یاد تھے سارے

کر بیٹھے ہیں

کسی طرح سے جی کر دیکھا ہے

کسی طرح سے مر بیٹھے ہیں

لیکن جانا!

اور حیران ہوا تھا، سر جان یہ سب جانتا تھا مگر وہ بے بس رہا اور اسے اب پتا چلا کہ بے بسی کا مزہ کیا ہوتا ہے، اس نے اب جانا اس کرب کی لذت کیا ہے۔

سہ پہر ڈھلنے کے قریب ہوئی اور سر جان باجہ اپنے لامحدود اضطراب سے ہار گیا، جازم لاہور شہر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا وہ فریش ہونے کے لئے ایک ڈھابے پر رکا تھا، جب اسے سر جان کی کال موصول ہوئی۔

”کہاں ہو؟“ اس نے بغیر دعا سلام کے چھوٹے ہی پوچھا۔

”لاہور میں ہی ہوں۔“ وہ حیران ہوا تھا مگر لہجہ اس نے نارمل ہی رکھا۔

”میری ریڈیٹس پر آؤ۔“  
”بھائی!“ مگر اپنی بات مکمل کر کے وہ کال منقطع کر چکا تھا۔

جازم نے بے بسی سے ایک نظر موبائل کو دیکھا اور پھر مڑ کر مشام کے سوائے چہرے کی طرف۔

شام گہری ہو رہی تھی جب وہ اس کی ریڈیٹس پر پہنچا تھا، مشام کی نیند ابھی تک برقرار تھی، شاید وہ بہت راتوں سے سوئی نہیں تھی اور اس کی اتنی طویل نیند پر جازم نے شکر ہی ادا کیا تھا، کار کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی اور سر جان کے چلتے قدم ٹھہر گئے تھے وہ ابھی تک یونی فارم میں تھا، شرٹ کے کف کہنیوں تک فولڈ کیے وہ محو انتظار لگتا تھا۔

جازم اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا جب سر جان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

”اے اٹھاؤ۔“ اس نے مشام کی طرف اشارہ کیا، جازم اثبات میں سر ہلا کر مشام کی

سس کو مجروح کیے جانے کا انتقام لینے ان کی زندگی میں شامل ہوئی تھیں اور اپنی ساری زندگی ان نے اس انتقام کے نذر ہی کر دی تھی، وہ محبت جس کی طلب میں انہوں نے نہ جانے کتنی دعائیں مانگیں، کتنا ترپیں وہ محبت ملی تو دل سے طلب ہی جاتی رہی، وہ بس سراپا انتقام اور نفرت بن گئیں اور ان کی یہ نفرت اور انتقام مشام کے دل کو بھی خالی کر گیا تھا۔

☆☆☆

جازم کی نظریں سامنے بھیجی تارکول کی سڑک پر جمی تھیں، جبکہ مشام سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی، جازم نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور مشام خود سے بھی خاموش ہی تھی، ادھ کھلے شیشے سے اندر آتے ہوا کے نرم گرم جھونکے اس کی رت جگے سے دھکی سرخ آنکھوں میں نیند کا خمار پیدا کرنے لگے تھے، اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں اور بالآخر وہ نیند کے خمار میں دو بنے لگی، اگلے چند لمحوں میں وہ مکمل نیند کے حصار میں تھی، جازم نے ایک نظر اسے دیکھا اور گہری سانس خارج کرتا چہرہ سامنے کی طرف موڑ کر ڈرائیو کرنے لگا۔

☆☆☆

رات سے صبح ہوئی اور صبح سے دوپہر کا وقت آٹھبر اور وہ بھی پھل پھل کر سہ پہر کی طرف گامزن سفر تھا اور سر جان ایسے ٹہل رہا تھا جیسے اسے سفر کی سزا سنا دی گئی ہو، منزل دور بہت دور ہو اور اسے ستارا ہی ہو، وہ سسکیاں جو وہ سن کر آیا تھا ان سسکیوں نے اسے لامحدود اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا یہ سسکیاں وہ پہلے سن لیتا تو تباہ ہی ہو جاتا، اس کے اضطراب کو اس کے ہر ماتحت نے محسوس کیا تھا، بغور دیکھا تھا

نے جیب سے موبائل نکالا اور فرزام کا نمبر پیش کر کے موبائل کان سے نکا دیا۔  
 ”جازم کو فون کر لو، وہ لاہور میں ہی ہے۔“  
 اپنی بات مکمل کی اور فون بند، مشائم نے غصے سے اسے دیکھا۔

”حاکم کہیں کا۔“ کرسی کھینچ کر، پیٹ کو گھٹنوں سے پکڑ کر اوپر کھینچ کر اس کے سامنے آگے کو جھک کر بیٹھ گیا، ایسے کہ مشائم اور اس کے درمیان ابھی بھی دو قدم کا فاصلہ برقرار تھا۔  
 ”مجھے یہاں بلانے کی وجہ؟“ مشائم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہاری سسکیاں۔“ وہ ترنت بولا، مشائم جی بھر کر حیران ہوئی اور سر حان نے اس کی حیرانگی کو اس کے چہرے سے پڑھ لیا۔

”تمہاری سسکیاں بہت بری ہیں، مطلب ایسی کہ کسی کو بھی ڈسٹر ب کر سکتی ہیں، بندہ نہ بھی پشیمان ہوتا چاہے یہ ذلیل کر کے ہی دم لیتی ہیں۔“ وہ ہر دم انداز میں بولتا رہا اور مشائم نا بھیجی سے اسے دیکھتی رہی اور پھر افسوس سے سر ہلا کر اس پر سے نظر ہٹا گئی۔

”وہ اس کی سسکیوں سے نہیں اس کی محبت سے ہار گیا تھا مگر یہ اعتراف سر حان با جوہ کرتا تو مرنہ جاتا۔“

”میرے جانے کا پتہ کیسے چلا۔“ وہ ابھی تک اکھڑی اکھڑی تھی۔

”تمہاری ظل ماں سے، جازم کو فون کرنے سے پہلے میں نے انہیں فون کیا تھا۔“  
 ”میری ظل ماں تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں۔“

وہ بے رخی سے بولی۔  
 ”ہاں مگر تمہاری شاید کچھ زیادہ ہی لگتی ہیں۔“ اس کے لہجے میں غصے کی جھلک تھی، شاید ظل ہانے اس سے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی یا

طرف جھکا۔  
 ”مشائم..... اٹھو۔“ اس نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا، مشائم نے آنکھیں کھول کر نیند کے خمار میں ڈوبیں آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایئر پورٹ آ گیا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے کے ساتھ ہی پوزیشن بھی درست کی، بالوں کی اونچی پونی کو ہاتھوں سے کسا چہرے پر ہاتھ پھیرا اور جب سر سری نظر سے بائیں طرف دیکھا تو دھک سی رہ گئی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے دلچسپ اور سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھتا سر حان اسے تعجب کر گیا، اس نے رخ موڑ کر بے یقین اور حیران نظروں سے جازم کو دیکھا، جب کہ وہ نظر چرا کر سیدھا بیٹھ گیا، سر حان نے آگے بڑھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا، مشائم مزید خود میں سمٹ گئی۔

”باہر آؤ۔“ اس نے نرم تاثرات کے برعکس اس کی بھاری آواز میں بلا کی سنجیدگی تھی، اس نے ایک نظر جازم کو دیکھا اور کار سے باہر نکل آئی، دروازہ بند کر کے وہ ادھ کھلے شیشے پر جھکا۔  
 ”تم جا سکتے ہو۔“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے مشائم کا ہاتھ پکڑا اور اس حیرانگی کے مجسمے کو کھینچتا اندر کی طرف بڑھ گیا، جازم نے پہلے حیرانگی سے اور پھر ناراضگی سے سر حان کی پشت کو گھورا اور غصے سے دروازے کے پاس کھڑے

ملازم کی دلی دبی مسکراہٹ کو دیکھ کر وہ زن سے گاڑی نکال کر لے گیا۔

☆☆☆

فیصلہ ہے لوگوں کا  
 ذات تیری میری تھی  
 لاؤنج میں پہنچ کر اس نے مشائم کا ہاتھ چھوڑا اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس

شاید خفگی دکھائی تھی۔

”تم بھی حد کرتے ہو سر جان باجوہ، بے رخی دکھاتے ہو تو بار دینے کی حد تک اور بدگمان ہوتے ہو تو بے یقینی کی انتہا تک۔“  
”شکوہ کر رہی ہو۔“

وہ خفا خفا سے رخ موڑ گئی اور سر جان سوچنے لگا یہ ابھی تک محبت لٹاتی رہی تھی تو ہر ادا زالی رہ گئی تھی اور اگر یہ محبت و صولے تو کتنی قاتلانہ ادائیں دکھائے، بار دینے کی حد تک محبت کرنا کس سے سیکھا اس نے اور مرجانے کی حد تک عشق کی انتہائیں کہاں سے لے کر آئی؟

وہ کرسی سے اٹھا اور اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا، مشائیم غیر محسوس طور پر تھوڑا پیچھے ہوئی تھی۔

”یہ لو۔“ سر جان نے موبائل اس کی طرف بڑھایا، مشائیم نے سوالیہ نظروں سے موبائل کو اور پھر اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”چچا چچی کو فون کرو۔“

”کیوں؟“

”اسنے ولیسے کی انہیں دعوت نہیں دو گی؟“ مشائیم کی آنکھوں اور چہرے پر ایک دفعہ پھر حیرانگی اور بے یقینی پھیلی۔

”آج رات ہماری شب زفاف ہے اور برسوں ولیسہ، ٹھیک ہے نا پروگرام۔“ سر جان نے مسکراہٹ روک کر اس کی طرف دیکھا جو صوفے سے اٹھ کر ایسے دو قدم پیچھے ہوئی تھی جیسے کوئی کرنٹ لگ گیا ہو۔

”دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟“ وہ خفگی سے بولی۔

”بیوی ہو تم میری۔“ وہ بازو پھیلا کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا،

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اردو کی آخری کتاب.....
- ☆ خوار گندم.....
- ☆ دنیا گول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....
- ☆ چلے ہو تو چین کو چلے.....
- ☆ مگر کی تجری پھر اسافر.....
- ☆ خط انشاجی کے.....
- ☆ بستی کے اک کوپے میں.....
- ☆ چاند نگر.....
- ☆ دل خوشی.....
- ☆ آپ سے کیا پردہ.....

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

- ☆ قواعد اردو.....
- ☆ انتخاب کلام میر.....

ڈاکٹر سید عبداللہ

- ☆ طیف نثر.....
- ☆ طیف غزل.....
- ☆ طیف اقبال.....

لاہور: اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز: 7321690-7310797

کرا سے دیکھا، کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ  
تھہری اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔

”پہلے مجھے روکنے کی ٹھیک ٹھیک وجہ بتاؤ۔“  
وہ شاید کچھ سننا چاہتی تھی، کچھ بہت خاص، سرحان  
نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ذیل تمہیں روکنے کی دو بہت خاص  
وجوہات ہیں۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں  
دیکھا۔

”فرزام کہتا ہے کہ تم ایک بار چلی گئی تو  
تمہیں کبھی نہ بھی منانے تو میں نے جانا ہی تھا،  
اس کے دو نقصانات تھے ایک آج کل ڈیوٹی بہت  
ثف ہے چھٹی مانا بہت مشکل ہے اور دوسری اور  
خاص وجہ ٹکٹ کے لئے فضول کے پیسے ضائع  
ہوتے، حالانکہ انہی پیسوں کو بجا کر میں ایک چھوٹا  
موٹا ولیمڈ تواریخ کر ہی لوں گا، جس غریب سا بندہ  
ہوں سو باتیں سوچنی پڑتی ہیں۔“ اس نے مسکین  
سی شکل بنائی، مشائم کا چہرہ بھول کر کیا بن گیا اور  
وہ خونخوار نظروں سے سرحان کو دیکھ رہی تھی۔

”بس یہی وجوہات تھیں۔“ وہ مزید گویا ہوا  
اور مشائم مزید وجہ پوچھنے سے توبہ کرنی دھپ  
دھپ کرنی چکن میں چلی گئی، سرحان مسکرا ہٹ  
روکتا کمرے میں فریش ہونے کے لئے چلا گیا  
اور خفگی سے کافی چھینٹی مشائم جانتی تھی وہ کبھی بھی  
سرحان کے منہ سے محبت کا اظہار نہیں کروا پائے  
گی ہاں وہ اپنے ہر عمل سے اظہار محبت کرتا  
رہے گا، اس بات کا اسے یقین تھا اور امید تھی اور  
وہ ناشکری نہیں تھی، ایک عرصے بعد دعاؤں کو  
مقبولیت کی سند ملی تھی وہ بالاجہ انا کو مسئلہ بنا کر  
محبت سے منہ نہیں موڑ سکتی تھی۔

☆☆☆

مشائم کے چہرے پر غصہ پھیلنے لگا۔  
”بہت شکریہ اس بات کو تسلیم کرنے کے  
لئے، مگر سرحان باجہ ہر کام کو کرنے کے کچھ  
اصول ہوتے ہیں۔“

”مثلاً۔“ وہ مخصوص ہوا اور مشائم تپ گئی۔  
”مثلاً پہلے رخصتی تو کرواؤ۔“

”ابھی تمہارا بھائی، تمہیں یہاں رخصت ہی  
کر کے گیا ہے، کیا یہ رخصتی کم ہے۔“ وہ اس کے  
مقابل آ کر ایک قدم کے فاصلے پر رک گیا، مشائم  
کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔

”بھی تو مجھے بھی عزت دینے کا سوچ لو  
سرحان۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ اس کے  
ہونٹوں سے نکل گیا اور سرحان کا چہرہ سنجیدگی کی  
انتہا کو چھونے لگا۔

”مشائم سرحان باجہ تم بیوی ہو میری اور  
اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھنے کا حق میں رکھتا ہوں  
اور یہی یہ رخصتی اور ویسے کی بات تو میں امی کو بتا  
چکا ہوں اور اب تک تو وہ چچا چچی کو بھی بتا چکی  
ہوں گی اور مجھے نہیں لگتا کہ انہیں کوئی اعتراض ہو  
گا اور جنہیں ہوگا مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، ہاں  
اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو تم بات کرو۔“  
مشائم نے نمی صاف کی اور مدھم آواز میں معصوم  
انداز میں بولی۔

”میرا سامان جازم کی گاڑی میں ہی رہ  
گیا۔“ سرحان نے بہ مشکل انڈے والے قہقہے کو  
روکا۔

”فکر نہ کرو آدھے گھنٹے میں آ جائے گا  
سامان۔“ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھا۔

”اور ہاں یار، اس طرف کچن ہے۔“ اس  
نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔

”مزید اسی کا تو پلاؤ۔“ اس کے ہونٹوں  
پر دبی دبی مسکراہٹ چمکی اور مشائم نے دانت کچکپا



# خوارقِ عشق ہیں

رمشا احمد



”افوہ محترمہ! آپ میرے لئے کیوں دبال جان بنی ہوئی ہیں؟“ سیر شدید جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

”آخر آپ کب جائیں گی؟“  
”پلیز میری جان چھوڑیں۔“ سیر نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”دیکھئے، کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں، آپ تھوڑی دیر کے لئے مجھے پناہ دے دیں۔“ وہ بہت سچی انداز میں بولی، سیر نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے ساتھ سر کھپاتے کھپاتے سیر کا دماغ ماؤف ہوا جارہا تھا، اس نے کچھ لمحہ توقف کیا اور مزید گویا ہوا۔

”کون تھا؟ جس کے ساتھ گھر سے بھاگی ہو، شرم نہیں آتی کیا؟ تم جیسی لڑکیوں کے لئے آئے دن نیوز پیپر بہ خبریں آتی ہیں کہ ایک لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی، یوں ماں باپ کی عزت پاؤں تلے روند کر چل پڑتی ہو کم از کم اپنی نہیں تو والدین کی عزت کا ہی خیال کر لیا کرو۔“ وہ مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے خود سے مفروضے بنائے، نان اسٹاپ بولے جا رہا تھا، تو وہ ششدر سی رہ گئی اور آنکھیں دھندلاہٹ سی گئی، ایکدم اس کا چہرہ احساس توہین سے سرخ ہوا تھا۔

”ایکسکوز می۔“ وہ ٹوکے بنانا رہ سکی۔

”میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزامات لگائے جارہے ہیں۔“ ایکدم آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گیا نا چاہتے ہوئے بھی آنسو چھم چھم اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

”چلو جی بن بادل برسات شروع۔“ سیر

نے منہ بنا کر کہا، وہ مزید ہچکیوں سے رونے لگی۔  
”اچھا زیادہ مگر مجھ کے آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے ایکدم ترس آ گیا تو وہ دانستہ رکھائی سے بولا۔

”چائے پیو گی؟“ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا، اس کا جواب سنے بغیر وہ سروٹ گوارٹر کی جانب بڑھ گیا، گل خان کو چائے کا کہہ کر وہ پھر سے ڈرائنگ روم میں آ گیا، وہ صوفے پر بیٹھی دونوں ہاتھوں کو مسل رہی تھی، سیر مسلسل اسے مشکوک نظروں سے دیکھے جا رہا تھا، ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے، وہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہ پوچھ سکا۔

”سنو! تم جتنی دیر بیٹھنا چاہو بیٹھ سکتی ہو، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مکمل خان سے کہہ سکتی ہو۔“ وہ اسے مخاطب ہو کر بولا، اور اٹھ کر باہر چلا گیا، لان میں آ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ایک اجنبی لڑکی کو اکیلے گھر میں چھوڑ کر کہاں جاؤں اس بات کا امکان بھی ہے کہ کہیں کوئی چور نہ ہو، میرے گھر سے نکلے ہی موقع دیکھ کر گھر کا صفایا نہ کر جائے، آج کل کے حالات تو ویسے بھی بہت خراب ہیں۔“ یہ سوچ کر اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور دوبارہ سے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

”ویسے محترمہ! آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔“ سیر نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔  
”آپ میرا نام پوچھ کر کیا کریں گے؟“

اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔  
”کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ سیر نے گویا دو معنی بات کی۔

”پلیز آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔“ کہتے ہی وہ پھر سے رودی، ایک تو یہ کجذہن آنسو پتھر دل تک پگھلا دیتے ہیں پھر وہ تو کافی

نرم دل کا تھا، اس نے کچھ لمحہ توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔

”آخر تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتی کہ تمہارے ساتھ کیا براہم ہے؟ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایکدم کال بیل بجی، سیر کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

باہر جو کوئی بھی تھا اسے اس لڑکی کی یہاں موجودگی کی خبر نہیں ہونی چاہیے، سیر ایکدم سے گھبرا گیا۔

”اے لڑکی سنو! تم اس بیڈروم میں چلی جاؤ دروازہ بند کر لینا جب تک میں دستک نہ دوں ہر گز نہ کھنوا۔“ سیر نے اوپر کی طرف اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر اس جانب بڑھ گئی۔

سیر نے اپنے حواس بحال کیے اور گیٹ کی جانب بڑھ گیا کیونکہ گل خان بچن میں مصروف تھا۔

”تم! یہ کون سا وقت ہے کسی کے گھر منہ آٹھا کر جانے کا۔“ سیر منہ بنا کر بولا، مقابل بھی شاید ڈھنائی کا عالمی ریکارڈ قائم کر چکا تھا جہی مسکرا کر بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ منہ گھر رکھ کر آتا پھر تو سر کے انسان کو تم نے گھر نہیں گھنے دینا تھا اس لئے میں منہ لگا کر آیا ہوں، میں نے سوچا تم اکیلے ہو گے تو تمہیں کہنی دی جائے۔“ اسد اندر آتے ہوئے بولا۔

”اس وقت مجھے کسی جوکر کی کہنی انجوائے کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“ سیر جان چھڑاتے ہوئے بے رخی سے بولا۔

”یار کر پیلے کیوں چپا رہے ہو؟ حالانکہ کریلوں کا موسم بھی نہیں ہے۔“ اس اس کے کندھے پہ دھپ رسید کر کے بولا، سیر کو ایکدم

بیڈروم والی لڑکی کا خیال آ گیا۔

”اُف اگر اسد کو پتا چل گیا تو۔“ اس سے آگے سیر سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اسد نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔

”کچھ نہیں، اپنی ویز یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے کیونکہ بغیر کھائے ملنے والے تو تم ہو نہیں۔“ سیر زبردستی چہرے پہ مسکراہٹ سجا کر بولا تو اسد اسے گھور کر رہ گیا۔

”گل خان! اس خبیث کے لئے کچھ کھانے کو لاؤ۔“ سیر نے بچن کی جانب منہ کر کے کہا تو گل خان مسکرا دیا۔

اسد کافی دیر بیٹھا رہا کھانے اور کافی کا دور بھی چلتا رہا سیر نے ہوں ہاں کے علاوہ کوئی بات نہ کی، اب وہ اسد کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا کیونکہ رات کافی گہری ہو گئی تھی اسے ایکدم نیند نے آیا تو وہ بیڈ پر گر گیا۔

☆☆☆

صبح جب وہ ناشتہ لے کر خود اوپر کے کمرے میں گیا تو وہ بیڈ پر بے سدھ بڑی سو رہی تھی۔

زلفوں کی چند آوارہ لہریں بے ترتیبی سے اسے چھو رہی تھیں، اس نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ناشتے کی، سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر باہر کی جانب بڑھ گیا اور دروازہ لاک کر دیا، کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

کل رات کے واقعات ہلکے سے خواب کی مانند اس کے ذہن میں چل رہے تھے پہلے تو اسے گمان گزرا کہ شاید وہ سب خواب تھا مگر آنکھیں ملنے ہوئے اس نے ارد گرد دیکھا تو اجنبی بیڈروم نے سب یاد دلایا۔

کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے تھے، اس کے پاس اس کے سوا اس وقت کوئی چارہ نہیں تھا

کہ جس گھر کا گیٹ کھلا دیکھے وہی داخل ہو جائے، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ لاک تھا۔  
”او مائی گاڈ!..... دروازہ کیوں لاک کر دیا

اس آدمی نے۔“ اس نے بے بسی سے سوچا۔  
”شکل سے تو شریف لگتا تھا۔“ وہ رو دینے کو ہوئی۔

”کاش!..... میں یہاں سے نکل سکوں۔“  
اس نے گہری سانس لی اور دوبارہ سے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی پاس کی سائیڈ ٹیبل پہ تاشے کی ٹرے دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اندر آیا تھا اور وہ بے خبر سوتی رہی اسے ایکدم شرمندگی نے آ گھیرا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے دوبارہ دروازہ جا کر چیک کیا وہ اب بھی باہر سے لاک تھا، وقت گزاری کے لئے اس نے فلیٹ میں بھی کتابوں کو دیکھنا شروع کر دیا جہاں ابن انشاء کی بے شمار کتابیں تھیں، کمرہ جس کسی کا تھا بندہ کافی خوش ذوق تھا، اس کے ساتھ ہی خیالات بار بار بھٹک کر گزشتہ واقعات کی طرف جانٹلتے مگر وہ اس بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی اور پھر وہ اسی منگش میں غڈ حال ہو رہی تھی کہ کہیں اس بندے نے مجھے قید تو نہیں کر لیا۔

”یا اللہ! میری مدد کر۔“ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بے ساختہ دعا کی، پھر وہ کمرہ تھا اور سوچوں کی یلغار نجانے کب تک وہ هنوز اسی کیفیت میں بیٹھی رہی اچانک کھٹکا ہوا اور دروازہ کھلا تو وہ چونک سی گئی، اندر آنے والے دونوں تھے اس نے لمحہ بھر کو دیکھا وہ حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کون ہو تم؟“ اس لڑکی نے پہل کی۔

☆☆☆

آفس سے آتے ہوئے وہ اس لڑکی کے متعلق سوچ رہا تھا جس کو وہ کمرے میں لاک کر کے آفس چلا گیا تھا۔

”پتہ نہیں اس نے ناشتہ کیا ہے یا نہیں اور اتنی دیر وہ اکیلی کیا کر رہی ہوگی۔“ گیٹ سے اندر آتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا پورچ میں چاچو کی گاڑی کھڑی تھی۔

”او مائی گاڈ! شامین بھی ہوگی اسے تو اپنے بیڈروم کی ضرورت پڑ گئی ہوگی دروازہ کھول کر وہ خوب گرج پرس کر ہنگامہ مچا چکی ہوگی۔“ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ برآمدے میں چاچو نمودار ہوئے۔

”آئیے جی..... آئیے۔“ چاچو طنز سے بولے۔

”آ..... آپ میرا مطلب ہے وہ آپ تو کل.....“ گھبراہٹ میں وہ ہٹکا کر رہ گیا۔  
”اچھا ہوا آج آ گیا۔“ وہ کھوجتی ہوئی نظروں سے بولے کچھ لمحہ توقف کیا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئے، وہ چاچو کی تھلید میں وہی چلا آیا۔

”پاپا! وہ تو کچھ کہتی نہیں بس روئے جا رہی ہے۔“ شامین بات کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور ٹھک کر رک گئی۔

سمیر کو دیکھ کر ناگواری کی لہر اس کے چہرے پہ آئی وہ..... وہ تیوریوں پر بل ڈالے اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی، شامین اسے اس وقت خانف لگی۔

”سمیر!“ فراز صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا، فراز صاحب نے کچھ لمحہ توقف کیا اور مزید گویا ہوئے۔

”تمہیں میرے فیصلے سے اختلاف تھا تو کہا

کیوں نہیں؟“ اس کا رنگ یکفخت پیکا پڑ گیا۔  
 ”اچھو کی چاچو!“ اس نے کچھ کہنے کے لئے  
 منہ کھولا ہی تھا کہ چاچو نے ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک  
 انداز میں کہا۔

”میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔“ انہوں نے خفگی  
 سے سیر کی جانب دیکھا اور اٹھ کر باہر چلے گئے،  
 اس نے کن آنکھوں سے شامین کی جانب دیکھا  
 جس کی آنکھوں کی خفاف سطح میں نمی ٹھٹھکنے لگی، وہ  
 اسی کی طرف دیکھ رہی تھی یکدم اس کا دل ڈوب  
 کرا بھرا۔

”شامین!“ وہ درمیانی فاصلہ عبور کر کے  
 اس کے قریب چلا آیا اور ہاتھ تھام کر بولا۔  
 ”میرا یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں ہے  
 چاچو کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ اتنی  
 لجاجت اور بے بسی سے کہہ رہا تھا تو شامین کو  
 ایک دم ترس آ گیا۔

”تو تمہیں پاپا کی غلط فہمی دور کرنی چاہیے  
 تھی۔“ شامین کے کچھ میں بلا کی تنجیدگی در آئی۔  
 ”تمہیں میرا یقین ہے؟“ اس نے شامین  
 کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا، شامین نے محض  
 سر ہلانے پر اکتفا کیا۔  
 ”شکر ہے۔“ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

”چاچو کی غلط فہمی میں جلد ہی دور کر دوں  
 گا۔“ پھر اس نے لڑکی سے ہونے والی ملاقات  
 سے لے کر اب تک کے تمام واقعات تفصیل سے  
 سنائے۔

”میں تو اس لڑکی کا نام تک نہیں جانتا اب تم  
 بتاؤ میری جگہ تم ہوتی تو کیا کرتی؟“ اس نے  
 شامین سے رسانیت سے پوچھا۔

”شاید ایسا ہی کرتی جو تم نے کیا ہے، لیکن  
 ہر کسی کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے، آئندہ احتیاط کرنا  
 ہر لڑکی وفا جیسی نہیں ہوتی۔“

”اب یہ محترمہ وفا صاحبہ کون ہے؟“ وہ  
 چونک کر بولا۔

”میں نے پوچھا تھا اس کا نام اسی نے بتایا  
 ہے۔“ شامین مسکرا کر بولی۔

”بس نام کی وفا ہے اور تو کچھ بتاتی  
 نہیں۔“ وہ چڑھ کر بولا۔

”سمیر! میرا خیال ہے کہ ہمیں مل کر وفا کی  
 ہیلپ کرنی چاہیے۔“ تو سمیر کندھے اچکا کر رہ  
 گیا۔

☆☆☆

فراز صاحب لان کے وسط میں کرسی پر  
 بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، چاچو کو لان میں بیٹھا  
 دیکھ کر سمیر وہی چلا آیا۔

”چاچو! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ  
 رسانیت سے بولا۔

”بدرخوردار! لیکن مجھے تم سے کوئی بات نہیں  
 کرنی۔“ فراز صاحب نے قطعیت سے کہتے  
 ہوئے اخبار منہ کے آگے پھیلا لیا۔

”چاچو! آپ کے رویے سے میں بہت  
 ہرٹ ہو رہا ہوں، آپ مجھے صفائی کا موقع دیں  
 گے کیا؟“ سمیر نے مدہم لہجے میں کہا۔

”صفائی کرنی ہے تو اندر جا کر کمرہ کی کرو  
 یہاں کیا کر رہے ہو۔“ فراز صاحب نے اخبار  
 کے پیچھے سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”چاچو! پلیز، اس نے مجھے نکلا کر اخبار چاچو  
 کے ہاتھ سے اچک لیا۔

”یہ کیا بدبینی ہے سمیر؟“ فراز صاحب  
 نے بمشکل مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

”چاچو! آپ مجھ سے خفا ہیں؟“ تو فراز  
 صاحب نے سر کوٹنی میں جنبش دی۔

”تو پھر تنگ کیوں کر رہے ہیں؟“  
 ”سمیر! تم نے مجھے اس وقت کیوں نہ آگاہ

کیا۔“ فراز صاحب مصنوعی خفگی سے گھور کر بولے۔

”میں نے سوچا بعد میں بتا دوں گا پجوائیشن ہی کچھ ایسی تھی جو میں آپ کو خبر نہ کر سکا اور کل تو آپ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔“ وہ خفگی سے بولا، تو فراز صاحب نے زوردار قبضہ لگایا اور اٹھ کر اپنے بھتیجے کو گلے سے لگایا۔

”اب خوش ہو۔“ انہوں نے الگ ہو کر شرارت سے سیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔  
”چاچو! آپ بھی ناں۔“ سمیر مسکرا کر رہ گیا۔

”اپنی دین! تم ایک کام کرو۔“

”جی چاچو کون سا۔“ وہ سوالیہ نظروں سے فراز صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم شامین سے کہو وفا سے سچ اگلوئے، میں نے ایس پی صاحب سے بات کر لی ہے، مجھے یقین ہے وفا کی ہیلپ کریں گے وہ، ویسے بھی مجھے لگتا ہے کچھ برا ضرور ہوا ہے وفا کے ساتھ۔“

”آپ کو کیسے پتا؟“ سمیر حیران ہوا۔

”یار یہ سر میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیا اتنا تو تجربہ ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔“ فراز صاحب مسکرا کر بولے۔

”اچھا میں ضروری کام کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔“ اچانک فراز صاحب اٹھے اور گیران میں کھڑی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

”سمیر! یہاں کیا کر رہے ہو؟“ شامین اندر سے نکلتے ہوئے بولی، اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی جواب دیتا، مین گیٹ کھلا اور اسد اس کے سر پر آکھڑا ہو۔

”سمیر..... سمیر میں نے سنا ہے کہ تم نے کسی لڑکی کو پناہ دی ہوئی ہے کہاں ہے؟ کیسی ہے؟“

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نان اسٹاپ بولے جا رہا تھا، تو سمیر نے ششکلیں نظروں سے شامین کو دیکھا جو مسکرا کر لان میں چلی آئی۔

وہ تینوں بچپن کے ساتھی تھے زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے تھے، اسد چاچو کے بیٹ فریڈ کا بیٹا تھا۔

”میں نے سوچا ایسے موقعوں پر اچھے دوستوں کی اشد ضرورتی ہوتی ہے اس لئے میں نے اسد کو بلا لیا۔“ شامین مسکرا کر کرسی سے ٹیک لگا کر بولی۔

”اسد! خبردار جو تم نے کوئی فضول حرکت کی۔“ سمیر نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا کیونکہ وہ اس کی فلرٹی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔

”اسد!“ مسکرا کر شامین کی طرف متوجہ ہوا۔

”شامین! تم دیکھ رہی ہو مجھے تو اس کی نیت ٹھیک نہیں لگتی تم ذرا ہوشیار رہنا جیسی تو اس نے مجھ سے چھپایا۔“ اسد نے آنکھیں پٹینا کر سمیر کو چھیڑا، تو حسب معمول وہ فوراً ہی آگ بکولہ ہو گیا اور آگے بڑھ کر اس نے اسد کی گردن دبوچ لی، اسد ایلک دم بوکھلا کر رہ گیا کیونکہ وہ اس ڈرون حملے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا اس لئے زور زور سے چلانے لگا، شامین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جارہی تھی۔

”ہائے میں مر گیا کوئی بجائے مجھے، اس خبیث سے شامین! کی بچی تم ہنسے حال رہی ہو تمہارا منہ بولا بھائی معصوم سا ڈر ٹکولے کے چٹکھلیں پھنسا ہوا ہے۔“ اسد منہ میڑھا کر کے بچارگی سے بولا، تو بالآخر شامین کو اس کی حالت زار پر ترس آئی گیا۔

”اچھا بس کرو سمیر جان لو گے کیا بچے کی۔“

شامین معصومیت سے بولی تو سمیر کو زبردست اچھو لگا۔

”بچہ۔“ وہ ہونقوں کی طرح دیکھ کر پوچھنے لگا ایک دم اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑا تو اسد مونچھے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”واہ! بہن ہو تو تمہاری طرح کی۔“ اسد، سمیر کے کندھے پر دھپ رسید کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”ہوش کی دنیا میں آ جا میرے بھائی ساری زندگی یہی چہرہ دیکھنا ہے۔“ اسد اسے شامین کی طرف دیکھتا پا کر بولا۔

”تمہیں تو کسی چیز کی بھٹک نہیں پڑنی چاہیے گھٹیا انسان پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔“ سمیر نے جوابی دھپ رسید کرتے ہوئے کہا تو اسد مسکرا کر رہ گیا۔

”اچھا میرا تعارف تو کروادو اس لڑکی سے قسم سے بہت بے چینی ہو رہی ہے۔“ وہ ایک گہری سانس بھر کر بولا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔

”شامین بی بی!“ گل خان کی آواز پہ سب نے چونک کر گل خان کو دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ گل خان، شامین، گل خان کی جانب متوجہ ہو کر بولی۔

”وہ جی..... وہ لڑکی مسلسل روئے جا رہی ہے۔“ گل خان نے اپنی آمد کی وجہ بیان کی۔

”ہائے اللہ! کہیں سیلاب ہی نہ آ جائے۔“

”چلو..... چلو ہند باندھنے کا کوئی بندوبست کرتے ہیں، ورنہ سب ڈوب جائیں گے۔“ اسد

سرعت سے اندر جاتے ہوئے بولا تو سمیر اور شامین ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گئے اور اس کی تقلید میں اندر کی جانب بڑھ گئے۔

”اے لڑکی! بات سنو۔“ اسد سب سے

پہلے اندر جاتے ہی اس کے سر ہوا، وہ جو دوزانوں سر دیے بیٹھی تھی، اس نے ٹھٹھک کر سر اٹھایا تو اسد مبہوت سا اسے دیکھتا ہی رہ گیا، وہ کچھ نروس سی ہو گئی، اس نے سوالیہ نظروں سے شامین کی جانب دیکھا تو شامین مسکرا کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”وفا! گھبراؤ نہیں یہ میرا بھائی ہے اسد۔“

شامین نے اسد کا تعارف کر دیا جو ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا، شامین نے جیکے سے اسے کہنی ماری تو اس نے چونک کر شامین کی جانب

دیکھا، جو ہمنوؤں کو اچکا کر سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ٹیڑھی نظروں سے سمیر کو دیکھا اور مسکرا کر وفا کی

طرف متوجہ ہوا۔

”بے وفا لڑکی! یہاں چھپی بیٹھی ہو، تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں پاگل ہو گیا۔“ اس کی بات سن کر وفا ششدر سی رہ گئی، سمیر، اسد کو گھور کر رہ گیا۔

”وفا! پلیز آپ اس کی باتوں کو مانڈ مت کیجئے گا یہ تھوڑا سا سائیگی کیس ہے۔“ سمیر

رسانیت سے بولا۔

”وفا! تم اپنی پراہلم سے ہمیں آگاہ تو کرو ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری مدد کر سکیں۔“ شامین اس

کے ہاتھ تھام کر بولی، وفا نے اسے امید بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

☆☆☆

یادیں حسین ہوں تب بھی تکلیف دیتی ہیں مگر اس کا سارا ماضی تکلیف دہ یادوں سے بھر پڑا

تھا، خوشیوں کے چند لمحات کا تصور بھی کرب انگیز تھا کہ ان کے ساتھ ہی تنہا یادیں در آئی چلی آتی

تھیں، اپنے بچپن کا مختصر سا خوشیوں بھرا دور اسے اچھی طرح یاد تھا، اپنی خوبصورت ماما اور شفقت سے

بابا کے ساتھ گزرے ہوئے دن ایک خواب کی

نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو نئی پریشانیوں نے آگھیرا، اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بابا کی ساری جائیداد کی وارث ہے، وہ اسے سنے بابا کے ایک نزن نے بتایا اور وہ اس کا بہت احترام کرتا تھا اس سے رواداری اور اپنائیت برتا اس سے بلا مقصد باتیں کیا کرتا وہ سنی اور بھی ان سنی کر دیتی۔

اسے نفرت تھی نئے بابا اور ان کے رشتے داروں سے جائیداد کے جھگڑے شاید ماما کی زندگی میں شروع ہو گئے تھے، جواد صاحب چاہتے تھے کہ وہ اپنے تمام کاروبار کا سرپرست بنا دیں یعنی سارا چارج ان کے حوالے کر دیا جائے اور یوں فیکٹریوں کا تمام کام وہ سنبھالتے تھے، مگر ذرا ذرا سے دستخط کے لئے وفا کے پابند تھے اور یہی بات انہیں ناگوار گزرتی تھی۔

ماما کی وفات کے بعد انہیں ان کی طرف سے جو کھنکا تھا وہ بھی جاتا رہا اور اب وہ زیادہ دلیری سے اسے قائل کرنے لگے۔

”وفا دیکھو تم ہر وقت آفس نہیں ہوتیں مجھے بار بار دستخط کروانے کے لئے گھبراتا رہتا ہے، آخر تمہیں مجھ سے کیا ڈر ہے؟ میں تمہاری کوئی چیز کھا نہیں جاؤں گا۔“ انہوں نے آج پھر اسے گھیر لیا۔

”آپ اپنی حد میں رہیں آپ کے لئے یہی کافی ہے۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟“ وہ گرجے۔

”میں آپ کو خبردار کر رہی ہوں اگر آپ اسے دھمکی سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی۔“ وہ شانے اچکا کر بولی۔

”میرا خیال تھا کہ تم شرافت کی زبان سمجھ لو گی، مگر مجھے لگتا ہے اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔“ وہ بل کھاتے ہوئے اٹھے اور باہر نکل

ماند لگتے تھے، کتنا پیار کرتے تھے بابا اس سے اس کی ہر خواہش کو پورا کرتے ہر بات کو فوراً مان لیتے تھے۔

”جائیے بابا میں آپ سے بات نہیں کرتی۔“ وہ بلا وجہ ناراض ہو جاتی اور بابا کو کسی کل چین نہ پڑتا جب تک اسے منانہ لیتے۔

پھر ماما اور بابا اسے اپنے ساتھ لاگ ڈرائیو پر لے جاتے ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے اسے کتنا فخر محسوس ہوتا تھا۔

دن سارے ایک جیسے نکلتے ہیں مگر حالات مختلف ہو جاتے ہیں، جب کافی دیر تک کوئی اسے بیدار کرنے نہیں آیا تب وہ خود ہی اٹھ بیٹھی۔

رحو کا کانے اسے بتایا صاحب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی بیگم صاحبہ انہیں لے کر ہاسپٹل گئی ہیں۔

پھر وہ ان کے آنے کا انتظار کرتی رہی اور بابا اسے ہمیشہ کے لئے اکیلا چھوڑ کر بہت دور چلے گئے۔

تنہائیاں اس کا مقدر بن گئی ایک بابا ہی اس کے دوست تھے، اس نے خود کو کتابوں میں گم کر لیا تھا پھر ماما نے دوسری شادی کر لی۔

نئے والد سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔

نئے بابا بھی اس کے کمرے میں نہیں آئے ہاں البتہ ماما بھی کبھار ضرور آتیں تھیں اس کی خیریت معلوم کرنے پھر ایک دن ماما کو ہارٹ ایک ہوا تھا اس نے اپنی ماما کے لئے ڈھیروں دعائیں مانگ ڈالیں، وہ اس کی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھیں، شاید قدرت کو اس کے لئے یہ واجبی سہارا بھی منظور نہ تھا اور وہ پھر سے بے سہارا ہو گئی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا ہی گیا، اس



گئے۔

چونک گئی، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

”آپ کو جواد صاحب بلا رہے ہیں؟“

”اس وقت کیوں بلا رہے ہیں؟“ وہ بڑبڑا

کر رہ گئی۔

”اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔“ اس نے

ملازمہ کو جواب دے کر دوپٹہ شانوں پر درست کیا

اور جواد صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

جواد صاحب کے کمرے داخل ہو کر اس

نے دستک دی کیونکہ دروازہ پہلے ہی کھلا تھا،

اچانک اس کی نظر سامنے کرسی پر براجمان جواد

صاحب کے بھائی ولید صاحب پر پڑی تو وہ ٹھٹھک

سی گئی۔

”آؤ وفا اندر آؤ۔“ اجازت ملتے ہی وہ

آگے بڑھ آئی۔

”بیٹھو۔“ جواد صاحب نے اشارہ کرتے

ہوئے کہا، تو وہ قریب بڑی کرسی پر ٹپک سی گئی۔

”جی فرمائیے۔“ وہ جواد صاحب کو متوجہ

کر کے بولی۔

”وفا! ہم تم سے دو ٹوک بات کرنا چاہتے

ہیں۔“

”دو ٹوک بات ہو چکی ہے۔“ وہ ڈرنے

کے باوجود خود کو مضبوط بنا کر بولی۔

”تم شاید غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو میں تمہارا

باپ ہوں، سو ٹیلا ہی سہی، مگر اس وقت تمہارا واحد

سہارا میں ہوں۔“ جواد صاحب نے تمہید باندھی

اور بولنا شروع کیا۔

”میں چاہتا ہوں تم اپنی جائیداد کا مجھے

مکمل مقرر کر دو۔“

”میرا خیال ہے کہ میں اس قابل ہوں کہ

اپنا سب کچھ سنبھال سکتی ہوں۔“ وہ درستی سے

بولی۔

”یہ اس طرح نہیں مانے گی۔“ ولید

☆☆☆

وہ اندر ہی اندر لرز کر رہ گئی، اگرچہ یہ شخص

اسے کبھی بھی قابل اعتبار نہیں لگا تھا، مگر ایسے تیور

اس نے بھی نہیں دیکھے تھے۔

”وفا بیٹی!“ رحمو کا کا نے آواز دی تو وہ

چونک گئی۔

”کیا بات ہے رحمو کا کا؟“ اپنے آپ پر

قابو پا کر اس نے استفسار کیا۔

”وفا! بیٹی یہ صاحب حد سے بڑھتے جا

رہے ہیں۔“

”رحمو کا کا! آپ جانتے ہیں وہ میرے والد

نہیں ہیں۔“ اس نے دکھ سے کہا۔

”ہاں وفا بیٹی! تمہاری ماں نے زندگی کی

سب سے بڑی بھول یہی کی تھی، مگر یہ ضروری تو

نہیں کہ اس کی سزا تم بھگتو، ان گھٹیا لوگوں سے ہر

بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

”رحمو کا کا! فکر تو اس بات کی ہے کہ میں

بے سہارا ہو گئی ہوں۔“ آنسو خود بخود اس کی

آنکھوں سے چھلک پڑے۔

”وفا بیٹی! روتے نہیں ہیں۔“ رحمو کا کا نے

اس کے آنسو پونچھ دیے اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”جب تک میں زندہ ہوں تم پر کوئی آنچ

نہیں آئے گی۔“

وہ رات کچھ زیادہ بھیا تک تھی یا پھر اسے

لگ رہی تھی اس کا دل اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔

چھٹی حس کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی

تھی، وہ بظاہر اپنے بیڈروم میں لیٹی مانی اور حال

مستقبل کی سوچ میں غرق تھی اس کا ذہن کسی

انجانی آہٹ پر لگا ہوا تھا، حال نے اسے بے

حال کر دیا اور مستقبل جس کی کوئی خبر نہیں۔

”وفا بیٹی!“ اچانک ملازمہ کی آواز پردہ

آدمی رات کو چلتے چلتے تھک گئی تو تھوڑی دیر کے لئے فٹ پاتھ پر بڑی بیچ پر تک گئی تھی لوگ عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ سرعت سے اٹھ کر دوبارہ چل پڑی ایکدم اس نے محسوس کیا کہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ چل رہا ہے تو اس نے اپنے ارد گرد نظر اٹھا کر دیکھا تو ساکت رہ گئی۔

وہ تین افراد تھے شکل سے ہی بد معاش لگ رہے تھے اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر ایک مسکرا دیا اور بڑی ادا سے ہاتھ سر پر لے جا کر کرسیلوٹ کے انداز میں سلام کیا۔

”آپ شاید راستہ بھول گئی ہیں؟“ ایک نے کہا۔

”چلیے ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔“ دوسرا فوراً بول پڑا وہ خاموش رہی۔

”آپ کہیں کوئی تو نہیں ہیں؟“ وہ پھر بولا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا، وہ بھلا کب اس قسم کے واقعات کی عادی تھی اس لئے اور پریشان ہو گئی اور بلا سوچے سمجھے دوڑ لگا دی گئی کا مونٹر مڑتے ہی جس گھر کا گیٹ ٹھوڑا سا کھلا نظر آیا وہی ہنس گئی۔

☆☆☆

وہ اب بھی بلک بلک کر روئے جا رہی تھی، اس کا دل دکھ سے کٹ کر رہ گیا اسے خود بھی اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

”وفا! تم اکیلی نہیں ہو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“ شامین نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دلا سادیا۔

”ایس پی صاحب پایا کے دوست ہیں انشا اللہ وہ تمہاری مدد ضرور کریں گے، پلیز تم رو مت۔“ شامین نے رسانیت سے کہا۔

”بالکل تم فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ

صاحب کو فیصلے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”میں آخری بار کہہ رہا ہوں وفا تمہیں یہ سودا مہنگا پڑے گا۔“ جواد صاحب نے سختی سے کہا۔

ابھی وہ کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ ولید صاحب ایکدم پھرے اور آگے بڑھ کر وفا کے بالوں کو جکڑ لیا۔

”اب یا تو تمہارے ہاتھ ہر جگہ دستخط کریں گے یا پھر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جائیں گے۔“

شدت و کرب سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اتنی ذلت سہنی پڑے گی اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”مجھے افسوس ہے جواد صاحب آپ لوگ دولت کی ہوس میں اتنا گر جائیں گے سوچا بھی نہ تھا۔“ وہ اپنے بالوں کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دکھ سے بولی۔

”میرا خیال ہے جواد اس کا گلہ دبا دیتے ہیں نہ رہے گا باس نہ بجے گی باسری۔“ ولید

صاحب قہقہہ لگا کر بولے، اسی وقت جواد صاحب نے آگے بڑھ کر وفا کا گلہ دبانے کی

کوشش کی ایکدم سے دھڑام سے دروازہ کھلا،

رحمو کا کانے زور سے ڈنڈا ولید صاحب کے سر پر دے مارا وہ کراہتے ہوئے نیچے بیٹھتے چلے گئے۔

”وفا بیٹی! تم بھاگو یہاں سے۔“ تو اس نے بغیر سوچے دوڑ لگا دی اور دروازہ باہر سے

لاک کر دیا۔

سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا شاید بجلی چلی گئی تھی، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس گھر میں تو

وہ محفوظ نہ تھی اس وقت اس نے یہی مناسب سمجھا کہ یہاں سے بھاگ جائے باہر ہر طرف تاریکی

تھی ویسے بھی وہ گم گشتہ منزلوں کی مسافر تھی، وہ

”وفا کی مرضی بھی پوچھ لے میری جان کیا پتہ وہ تجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دے۔“  
سمیر نے اسے آنے والی صورتحال سے ڈرایا تو اس نے رک کر سمیر کو گھورا اور کچھ توقف کے بعد مزید گویا ہوا۔

”اپنے ہی گراتے ہیں نشمن پہ بجلیاں رونہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے اور میری تم جیسے آستین کے سانپ سے ریکوسٹ ہے کہ اپنا منہ بند رکھنا اور میرا بیچ خراب کرنے کی کوشش ہر گز مت کرنا میں با آسانی اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا۔“ سمیر جو اس کی آواز و انداز تحیر کے حجر نگہراں میں غوطہ زن تھا ایکدم اسد پر بل پڑا۔

”سو کینے مرے ہوں گے ایک تو پیدا ہوا ہو گا، غیث انسان تو مجھے ایسا سمجھتا ہے آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ایکدم سمیر نے اسے گھٹنوں کے نیچے دبا لیا پھر وہ صوفے پر ہی گھٹم گھٹا ہو رہے تھے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسد، سمیر کے نیچے ہی تھا اور اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ خود کو چیخنے سے باز نہ رکھ سکا۔

”ہائے ہائے بچاؤ یہ ابلیس میری جان لے لے گا۔“ اسی اثناء میں وفا اسد کو شامین کی معیت میں وہاں آتی دیکھائی دی تو اسد حلق کے بل چلا یا۔

”اے وفا! اس وقت تمہاری وفا کی مجھے اشد ضرورت ہے۔“ وفا بیجاری بوکھلا کر شامین کی اوٹ میں ہو گئی، اسی پل سمیر نے اسد کو چھوڑا اور ایک طرف بیٹھ گیا، اسد اٹھ کر اپنا کندھا سہلانے لگا اور دانت پیس کر سمیر کو دیکھا کچھ توقف کے بعد اسد نے سمیر کو ہنسی مار کر کہا۔

”بچو! تجھ سے تو میں بعد میں نیٹ لوں گا پہلے اس لڑکی کو تو پٹالوں۔“ وہ اب بھی سمیر کو زچ کرنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

ہوں۔“ اسد بیڈ پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے بولا، وہ بدک کر پیچھے کی جانب کھسک گئی، اسد مسکرا کر رہ گیا۔

”آپ تو ایسے ڈر رہی ہیں جیسے کہ میں نے کرنت چھوڑ دیا ہو۔“ اسد مسکراہٹ دبا کر بولا، ایکدم وفا کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔

”اسد!“ سمیر کو اس کا بیہودہ مذاق ناگوار گزر رہا تھا تو اس نے قریب آ کر ٹوک دیا۔  
”تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ اسد زچ ہو کر بولا۔

سمیر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو دلوچا اور باہر کی جانب دھکیل کر لے گیا، ڈرائنگ روم میں لے جا کر سمیر نے اسد کو صوفے پر دھکا دیا، صوفے پر گر گئی ہی اسد نے تلملا کر سمیر کو دیکھا۔  
”شرم کرو، وہ ایک بے بس لڑکی ہے اور تم اس سے زبردستی فریج ہونے کی کوشش کر رہے ہو اس کی حالت تو دیکھو۔“ سمیر دانت کچکچا کر بولا، اسد نے کچھ لمحہ توقف اور گویا ہوا۔

”یار سمیر! مجھے لگتا ہے کہ مجھے بے وفا..... میرا مطلب ہے وفا سے محبت ہو گئی ہے۔“ اسد نے رسائیت سے کہا، سمیر نے اسے تعجب سے دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، سمیر کو ہنستے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو چپ ہوا۔

”میں بہت سیریس ہوں۔“ اسد کچھ توقف کے بعد گویا ہوا تو سمیر نے ٹھنک کر اسد کی جانب دیکھا، اسد کے چہرے اور لہجے سے سچائی چھلک رہی تھی، وہ کبھی یقین نہ کرتا اگر اسد کو بچپن سے نہ جانتا ہوتا ہے شک وہ فلٹ کرنے کا ماہر تھا لیکن اس وقت یکسر بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا، سمیر ایکدم خوشگواریت میں گھر گیا۔

”تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔“ سمیر نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا چائے لو گے یا کافی؟“ فراز صاحب مسکرا کر بولے۔

”نہیں بارڈیوٹی پر ہوں۔“ ایس پی ریحان صوفے سے اٹھتے ہوئے بولے فراز صاحب نے صوفے سے اٹھ کر ایس پی ریحان سے مصافحہ کیا، اور وہ اللہ حفظ کہتے ہی باہر نکل گئے، فراز صاحب کمرے کی جانب بڑھے ہی تھے۔

”پاپا!“ شائین کی آواز پر چونک کر متوجہ ہوئے۔

”جی بیٹا!“ فراز صاحب شائین کے کندھے پر بازو پھیلا کر بولے۔

”پاپا! اسدی، وفا میں انوالو ہو گیا ہے میرا اور سیر کا خیال ہے کہ ان دونوں کی شادی کروا دیجئے ہیں اس طرح وفا کو سیکورٹی بھی مل جائے گی۔“ شائین سنجیدگی سے بولی، بات تو کافی مقول تھی، فراز صاحب کے دل کو بھی لگی۔

”کیا وفا راضی ہے؟“ فراز صاحب نے مسکرا کر استفسار کیا۔

”ہم سب مل کر اسے راضی کر لیں گے۔“ شائین عزم سے بولی۔

”ٹھیک ہے اگر وفا مان جاتی ہے تو یہ اچھی بات ہے۔“ فراز صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے اور کچھ لمحہ توقف کیا اور مزید گویا ہوئے۔

”بلکہ ان دونوں کے ساتھ تمہاری اور سیر کی شادی کی ڈیٹ فکس بھی اسی دن طے کر لیں گے۔“

”کیسا.....؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ شائین شرماتے ہوئے بولی تو فراز صاحب مسکراتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

شام کے وقت آسمان پر پرندوں کی

”ارے مس وفا! آپ ڈریں مت یہ شکل سے خوفناک نظر آتا ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر وفا کے پاس کھڑا ہو کر بولا وہ بچپاری ایکدم ہی زرد ہو گئی، سیر نے تلملا کر سر دلفظوں سے اسد کو گھورا۔

”ہائے ہائے ٹھنڈ پڑ گئی۔“ اسد سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا کیونکہ وہ سیر کو تپانے میں کامیاب ہو ہو گیا تھا، سیر نے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے دھمکی دی۔

”افوہ سیر، اسد کب تم لوگوں کو عقل آئے گی؟ بچپن سے تم لوگوں کا یہی حال ہے اب سدھر جاؤ۔“ شائین نے جھڑک کر کہا۔

”السلام علیکم!“ فراز صاحب کی آواز پر اسد جلدی سے سیر کے ساتھ صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گیا، فراز صاحب نے قریب آ کر وفا کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”کیسی ہو بیٹا؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“ وفا رسانیت سے بولی۔

”بیٹا! میں نے اپنے دوست سے بات کر لی ہے تم اپنا بیان لکھوا دینا مجھے یقین ہے تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔“ فراز صاحب رسانیت سے بولے وفا نے محض آنکھیں سے سر اثبات میں ۱۱ دیا۔

☆☆☆

اگلے دن ایس پی ریحان صاحب نے وفا کے کیس کی تمام تر ڈیٹیل آ کر فراز صاحب کے گوش گزار کی جس سے وہ مطمئن ہو گئے۔

”بھینکس ریحان! تمہاری وجہ سے ایک مظلوم لڑکی کو انصاف مل گیا۔“

”جناب! یہ میرا فرض تھا۔“ ایس پی ریحان مسکرا کر بولے۔

”دیکھو..... دیکھو پلیز رونا نہیں ہے، ورنہ میں یہی فوت ہو جاؤں گا اور تم یقیناً اتنی کم عمری میں بیوہ ہونا نہیں چاہو گی۔“ اسد نے جس قدر معصومیت سے کہا، نا چاہتے ہوئے بھی وفا کو ہنسی آگئی۔

”گلتا ہے لڑکی مان گئی ہے، یا اللہ حیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ وفا کو مسکراتے دیکھ کر وہ بولا، وفا نے ایکدم ہونٹ سمجھنے لگے۔

پھر اسد نے ایکدم اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو وفا اس حرکت پر جھینپ سی گئی۔

”اب چلو گی میرے ساتھ؟“  
 ”اس طرح۔“ وفا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”نہیں پورے اہتمام سے آئیں گے میڈم بیٹڈ باجے کے ہمراہ۔“ اسد شوشی سے بولا، وفا ایکدم ہی شرما کر رہ گئی۔

☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اردو کی آخری کتاب.....
- ☆ خمار گندم.....
- ☆ دنیا گول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلے.....
- ☆ نگرانی نگرانی پھر اس سفر.....

قطار پر گزر رہی تھیں پودوں سے نگرانی ہوا میں ناموس لیکن بھلی سی خوشبو کا احساس رہا جابا تھا۔  
 وفالان کے وسط میں کرسی پر بیٹھی آسمان کو دیکھے جا رہی تھی۔

مین گیٹ کو کراس کرتے ہوئے اسد کی نظر اس پر پڑی تو وہ وہی چلا آیا، ارد گرد سے بے خبر وہ ہنوز اسی کیفیت میں بیٹھی تھی، اسد نے گلہ کھنا کر اسے متوجہ کیا۔

”ہیلو کیسی ہو؟“ اسد نے مسکرا کر استفسار کیا، وفا نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا اور ایکدم گھبرا کر وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ اسد نے لپک کر اس کا راستہ روک دیا اور گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں صاف گو بندہ ہوں اور صاف بات کرتا ہوں، مجھ سے شادی کرو گی؟“ وفا ایکدم بوکھلا کر رہ گئی۔

”دیکھیں پلیز مجھے جانے دیں۔“ وہ رو دینے کو ہوئی۔

”اپنی بات کا جواب لئے بغیر تو نہیں جانے دوں گا۔“ اسد مسکرا کر بولا، اس کے پرپش لہجے میں ہلا کی حدت تھی، وفا سمٹ کر رہ گئی۔  
 ”آپ کسی اور سے شادی کر لیں۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”مفت مشورے کا شکریہ۔“ اسد جھنجھلا کر بولا۔

”یار! تم میرا اعتبار کر سکتی ہو۔“ اسد کے لہجے میں سنجیدگی درآئی۔

”میرا اعتبار منترل ہو گیا ہے، دنیا کی ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔“

”محبت پر سے بھی؟“ اسد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہ ایکدم ہی رو پڑی اسد کی تو جیسے دل کی دھڑکن ختم سی گئی۔

# لالہ سہو کا لکے ولس نہیں مبشرہ انصاری

براجمان ہو گیا۔

“I have a news ladies!”

المان کی مسکور کن بارعب آواز ساعت سے ٹکراتے  
ہی وہاں پر موجود تمام لڑکیاں ایک ساتھ سر  
اٹھائے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ سجائے المان  
کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”فائنلی! آشلے کو المان کے ساتھ رشل

”ہائے المان!“ سحر نے المان کو چوب محل  
کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ، میگزین  
فولڈ کرتے ہی شیریں لہجے میں مخاطب کیا، المان  
اس کی جانب دیکھتے ہی بے ساختہ اثبات میں سر  
ہلانے لگا، اسے یاد آگیا تھا کہ کل رات، سحر کس  
قدر تحفارت بھری نگاہوں سے مانہ کی جانب دیکھ  
رہی تھی اور اس کا لہجہ بھی اس کے ساتھ کس قدر رخ  
تھا، اسے اگنور کرتا وہ دھڑام سے کاؤچ پر

## ناولٹ

ڈیٹ کا موقع مل ہی گیا۔“ تنکھے نین نقش کی  
(ریش مسلم) اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائی لہجے  
سلی تراشیدہ بالوں کو جھٹکا دیتی ایک انداز سے  
کو یا ہوئی تھی۔

”اس کے نام کا اعلان ہونے کے بعد سے  
وہ پھولے نہیں سار ہی تھی، خوشی کے مارے پاگل  
ہوئی چلی جا رہی تھی۔“

اس بار مسکان نے لقمہ دیا، پانہ دلچسپی سے  
ان دونوں کی باتیں سنتی، اپنا چ بنانے میں  
مصروف رہی۔

”تم نے اس کا ڈریس دیکھا تھا؟ یا اس  
قدر شاندار ڈریس تھا، اتنی تیاری کے ساتھ ڈیٹ  
پر گئی ہیں میڈم کہ بس۔“ مسکان بات مکمل کرتے  
ہی جی بھنڈی سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”اچھا..... کہاں پر ہے ڈیٹ؟“ غیر دلچسپی  
کا مظاہرہ کرتی مانہ لا پرواہ لہجے میں پوچھنے لگی۔  
”سندر کے چچ وچ، یاٹ پر ڈیٹ ہے ان  
دونوں کی اور جس طرح سے وہ میڈم تیار ہو کر گئی





ہیں، آئی بیٹ الحان آج فل فدا ہونے والا ہے  
آٹھلے پر۔“

بسکٹ کا مزہ لیتی فارا بھی اب کے میدان  
میں کود پڑی تھی، مانہ اثبات میں سر ہلانے لگی،  
اسے ان سب کی پرواہ نہ تھی کہ الحان کس کے  
ساتھ ڈیٹ پر جاتا ہے اور کس پر فدا ہوتا ہے، وہ  
ان سب کی باتیں اگنور کر لی اپنے کام میں  
مصروف رہی۔

☆☆☆

”اس دن پارٹی کے بعد میں نے جنہیں  
کانٹیکٹ کرنے کی بہت کوشش کی الحان! لیکن تم  
تک پہنچنا، تم سے رابطہ کرنا کوئی آسان کام تو نہ  
تھا، میری بیڈلک چلتی رہی، پھر جب مجھے معلوم  
پڑا کہ تم اس ریلیٹی شو کے BACHELOR  
ہو تو یقین جانو، میں ایک دم خوشی سے اچھل پڑی  
اور پہلی فرصت میں عاشق زبان کے آفس پہنچ گئی،  
مجھے اس شو میں آنا تھا، صرف تمہارے لئے،  
قسمت نے میرا ساتھ دیا اور آج دیکھو، ہم تم  
دونوں ایک ساتھ ہیں۔“

یاٹ پر آنے سانسے رکھی مٹی کریسوں پر وہ  
دونوں براجمان تھے آٹھلے اپنے کرل کئے کئے  
بالوں کی لٹوں سے کھپائی مسور کن انداز میں جھونکھو  
تھی، الحان لبوں پر ہاتھ رکھے بغور اس کی جانب  
دیکھتا اس کی گفتگو پر دھیسے سے مسکرا دیا تھا۔

موسم بہت خوشگوار تھا، امیر کا سا سامان تھا،  
بادل اٹھانڈ کر گھمے چلے آ رہے تھے، جنگ ہوا  
بھی ادھر سے ادھر کھیلتی پھرتی تھی، یاٹ فل سپیڈ  
سے سمندر کا سینہ چیرنی انجانی منزل کی طرف  
رواں دواں تھی، آٹھلے مارون سلک میکی میں  
مبلوس، لائٹ سامک اپ اور بالوں کو کرل کیے  
بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی، الحان بغور دیکھتی  
سے اس کا جائزہ لیتا دیکھائی دیا تھا، آٹھلے واقعی  
بے انتہا خوبصورت تھی لیکن اس کے پاس مانہ  
جیسی آنکھیں نہ تھیں، مانہ جیسی خوبصورت

مسکراہٹ، مانہ جیسی پرسنالٹی اور نہ ہی وہ مانہ جیسی  
سوچ کی مالک تھی، الحان نے ہر انداز سے آٹھلے کو  
مانہ کے ساتھ تشبیہ دینے کی کوشش کی تھی، نتیجہ مانہ  
اسے ہر انداز ہر زاویہ سے بالکل مختلف، بالکل  
الگ اور بارعب دیکھائی دی تھی۔

”لڑکی کمال کی ہے، لیکن مانو سے بڑھ کر  
نہیں، اس کی آنکھیں بھی خوبصورت ہیں، مگر مانو  
کی آنکھوں کی بات ہی الگ ہے، اس کی آنکھوں  
میں ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔“ وہ اپنی ہی  
سوچ پر دھیسے سے مسکرا دیا، اگلے ہی بل وہ اپنے  
ذہن میں ابھرتی تمام سوچوں کو جھٹکتا، مکمل طور پر  
آٹھلے کی جانب متوجہ ہو بیٹھا تھا، وہ دونوں تقریباً  
ایک آدھ کھٹے تک یونی بیٹھے باتیں کرتے  
رہے۔

”میں شو کے پہلے دن سے انتظار میں تھی  
اور میری خواہش تھی کہ ہم تم کسی ایسی ہی ڈیٹ پر  
جائیں، سہانہ موسم ہو، میرے اور تمہارے سوا دور  
دور تک اور کوئی نہ ہو۔“ وہ محسوس کن انداز میں بولتی  
اٹھ کھڑی ہوئی اور دیر دیر سے دھیرے چلتی یاٹ کی  
گرل تھاے وسیع خوبصورت آسمان کی جانب  
دیکھنے لگی، الحان بھی اس کے تعاقب میں چلتا اس  
کے برابر میں جا کھڑا ہوا، الحان کی نظروں کا محور  
وسیع خوبصورت آسمان تھا، آٹھلے نظر سے گھا کر  
دلکش نگاہوں سے الحان کی جانب دیکھتی اس کے  
شولڈر پر اپنا سر ٹکائے کھڑی تھی، الحان اس کی اس  
حرکت پر یکایک چونک اٹھا۔

”ہم سیراز کئے ہیں میڈم! بی کیئر فل۔“ وہ  
استعطاء کرنے لگا۔

”جانتی ہوں، لیکن مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔“  
وہ اپنے انگلیں لہجہ میں مسور کن انداز میں بولتی  
آنکھیں سوندے اس کے کس کو محسوس کرنے لگی۔  
”دیکھو آٹھلے! میں تمہاری فیلنگو سمجھ سکتا  
ہوں، لیکن پلیز فرمائے تو انڈر شینڈ، فی الحال ہم  
دونوں کا اتنا بے تکلف ہونا ٹھیک بات نہیں، پوری



دنیا دیکھے گی یہ شو، آئی ہوپ یو انڈر سٹینڈ۔“ وہ محل بھرے انداز میں بڑی مہارت سے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے بولا، آٹھلے اب براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔  
”تمہیں واقعی پوری دنیا کی پرواہ ہے، یا مانہ کی؟“

”مطلب؟“ مانہ کے نام پر وہ اچنبھے سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔  
”تمہیں معلوم ہے؟ جزیرہ پر موجود تمام لوگ ایک ہی افواہ پھیلانے چلے جا رہے ہیں۔“  
”کیسی افواہ؟“ الحان نے پوچھا۔

”یہی کہ تم ہم سب لڑکیوں میں مانہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہو؟“ وہ جیلسی کا مظاہرہ کرتی اپنی آنکھیں گھما کر رہ گئی، الحان کو اس کا انداز پسند نہ آیا تھا، ابھی وہ تیوری چڑھائے اس کی جانب دیکھنا زیر لب بڑبڑایا۔  
”مانو.....؟“

”اوہ تو اس کے لئے سپیشل نام بھی منتخب کیا ہوا ہے آپ جناب نے۔“ وہ جل بھن کر رہ گئی، الحان جواباً کچھ نہ بولا۔  
”تم اسے پسند کرتے ہو؟“ جیلسی اس کے لہجے اور چہرے سے لپکتی دیکھائی دی تھی۔  
”مجھے تمہارے سمیت جزیرے پر موجود

تمام لڑکیاں پسند ہیں۔“ وہ پر جستہ بولا۔  
”لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں مانو کیوں پسند نہیں؟“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتا پوچھ رہا تھا، آٹھلے نخوت سے ناک چڑھا کر رہ گئی۔  
”وہ بہت عجیب لڑکی ہے؟“

”ہاں..... عجیب تو ہے وہ۔“ وہ سوچتے ہوئے دیکھے سے مسکرا دیا۔

”اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ اس شو میں رہنا بھی نہیں چاہتی۔“

”ہوں۔“ وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہ پایا۔

”مجھے لگتا ہے، یہ سب اس کا بلان ہے۔“ وہ اپنے ٹیلر کا جائزہ لیتی لاپرواہی سے گویا ہوئی۔  
”بلان؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”تمہاری مکمل توجہ حاصل کرنے کے لئے اس نے خود کو ہم سب سے الگ اور مختلف ظاہر کیا، تا کہ تم اسے نوٹس کر سکو۔“  
”میر توجہ تم سب پر ہے، میں تم سب کو نوٹس کرتا ہوں۔“ وہ چلتا ہوا واپس ٹیبل کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔

”خیر چھوڑو ان سب باتوں کو، یہ ہماری ڈیوٹی ہے اور ہمیں صرف اپنے ہی بارے میں بات کرنا چاہیے۔“ گلاس میں جوس اٹھلٹا وہ خوشگوار لہجے میں گویا ہوا، آٹھلے مسکرا دی اور ایک بار پھر سے اپنی ذات کے متعلق بات کرنے لگی۔  
الحان چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کی گفتگو سن رہا، لیکن اندر ہی اندر وہ مانہ کے لئے خاصا پریشان تھا۔

”مانو صرف مجھے ہی نہیں، بلکہ اس جزیرہ پر موجود ان تمام لڑکیوں کے رخ رویوں کو بھی برداشت کر رہی ہے۔“ من ہی من میں سوچتا وہ لب بلیچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

”ہم عجب لوگ ہیں، موقع ضائع کر دیتے ہیں، پھر ان کی تلاش شروع کر دیتے ہیں، جانے کے بعد کون واپس آتا ہے؟ موقع تو ابھی واپس نہیں آیا، جو گیا، وہ واپس نہیں آیا، اور جو واپس آیا، وہ..... وہ نہیں تھا جو گیا تھا، وہ کچھ اور ہی تھا، دھا کہ ٹوٹ جائے تو اسے جوڑا جاسکتا ہے، لیکن گرہ ضرور لگ جاتی ہے، ہم ہمیشہ حسرت سے سوچتے رہ جاتے ہیں، کیونکہ ہم خوابوں میں رہتے ہیں اور وقت سے پیچھے رہ جاتے ہیں، ہم وقت کے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ ہم کیا کرتے ہیں؟“  
مانہ تمام لڑکیوں سے دور اپنے من پسند

”ایک اہم اعلان کرنا ہے۔“ خرم آشلے کی جانب دیکھا شیریں لہجے میں گویا تھا، آشلے اس کی آنکھوں کا اشارہ سمجھتی ایک بار پھر سے قہقہہ لگائی، تمام لڑکیوں کے نزدیک جا کھڑی ہوئی، جاتے جاتے وہ الحان کو فلاننگ کس دیتی تھی، مانہ اس کی بے باکی پر تیوری چڑھا کر رہ گئی، الحان مکمل طور پر خرم کی جانب متوجہ تھا۔

”سو لیدر! اپنے اپنے دل تھام لیجئے، کیونکہ سر پرائز انیمیشن کی گھڑی آن پہنچی ہے۔“ خرم کا اعلان سنتے ہی مانہ کے سوا تمام لڑکیوں کے چہروں پر اک خوف کی لہر دوڑنی دیکھائی دی تھی، وہ تمام کی تمام اک دو بجے کو دیکھنے کے بعد عالم مضطرب میں اب خرم کی جانب پلچتی چلی جا رہی تھیں، الحان بھی اس اچانک کی انیمیشن پر خاصا حیران ہوا تھا۔

”سر پرائز؟“ خرم معنی خیز نگاہوں سے مسکراتا ہاتھ کے اشارے سے روز باسکٹ منگوانے لگا، مس فاطمہ روز باسکٹ سمیت الحان کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں، ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی، روز باسکٹ ٹیبل پر الحان کے قریب رکتی مس فاطمہ واپسی کے لئے مڑ چلیں تھیں۔

”الحان! ایک خوشگوار ڈیٹ کے بعد تمہیں ایب اس مشکل ٹاسک کو پورا کرنا ہے، پچھلی انیمیشن سے لے کر اب تک تم تمام لڑکیوں کو کافی اچھے سے جان چکے ہو، رائٹ؟“ خرم کے پوچھنے پر الحان اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”اگر الحان کو میرے پلان کی کان دکان خبر نہیں ہوتی، تو آج میں واپس گھر جاسکتی تھی، آہ میری بیڈ لک۔“ مانہ اپنا چشمہ اتارے اسے اپنی شریٹ سے صاف کرنی دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئی تھی۔

”اور کل رات کی گروپ ڈیٹ ہم نے اسی لئے اریج کی تھی تاکہ الحان آپ تمام لیڈریز کو مزید

درخت کے سائے تلے بیٹھی، ڈائری تھاے پین کی سیاہی سے لفظوں کی برسات کیے چلی جا رہی تھی، کہ یکا یک پیچھے سے آئی یاٹ کے انجن کی آواز پر چونکی پلٹ گریاٹ کی جانب دیکھنے لگی، الحان اور آشلے کسی بات پر کھلکھلا کر مسکراتے، یاٹ سے نیچے اترتے دیکھائی دیئے تھے، ایک اچھٹی سے نگاہ ان دونوں پر دوڑائی وہ ایک بار پھر سے اپنے کام میں جت گئی، قدم بہ قدم آگے بڑھتی آشلے کے قہقہے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے، جس کی بدولت مانہ کی، اپنے ناول کی طرف مبذول توجہ بشہ کر رہ گئی تھی، وہ محل کا مظاہرہ کرتی بسی سانس پھینکتی، ان دونوں کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی ایک جھٹکے سے اٹھی اور انا فانا چوب محل کی جانب بڑھنے لگی، مین دروازے پر پہنچنے ہی خرم سمیت تمام لڑکیوں کو لاؤنچ میں اکٹھا دیکھا، وہ شیشا کر رہ گئی، ان سب کو نظروں کا محور بنائے وہ دھیرے دھیرے چلتی مسکان کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”کیا چل رہا ہے؟“ اس نے سرگوشی کی تھی۔

”تم کہاں تھیں؟ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی، خرم نے کچھ ضروری اناؤسمیٹ کرنا تھی، اب معلوم نہیں کہ یہ کون سا ضروری اعلان ہے؟“ مسکان کی بات پر وہ خاموش ہو رہی، اتنے میں چوب محل کا دروازہ ایک بار پھر سے کھلا، آشلے قہقہہ لگائی اندر داخل ہوئی، الحان اس کے تعاقب میں تھا۔

”کیسی رہی تم دونوں کی ڈیٹ؟“ خرم نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”گریٹ!“ آشلے خاصی خوش دیکھائی دے رہی تھی۔

”اچھی رہی، یہاں پر کیا ہو رہا ہے؟“ الحان سب کی جانب اچنبھے سے دیکھتا، خرم سے پوچھنے لگا۔

جان سکے۔“ خرم لیڈیز سے مخاطب ہوتا اب اپنے برابر میں کھڑے المان کی جانب دیکھنے لگا جو ساٹھ لگا ہوں سے، ٹیبل پر رکھے گلابوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”المان! مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ان تمام لیڈیز کو مزید جاننے کی ضرورت پاتی ہے، لیکن..... یہ اس شو کا حصہ ہے، تمہیں آج دس لیڈیز کو یہ پھول دے کر سلیکٹ کرنا ہے اور سلیکٹ نہ کی جانے والی پانچ لیڈیز کو گھر واپس کے لئے ایڈمیٹ کرنا ہے سو آریوریڈی؟“

”آئی کیس سو؟“ المان دھیمے لہجے میں بولتا اپنی مخصوص مسکراہٹ مسکرا رہا تھا۔

”آل دی بیسٹ۔“ خرم واپس جا چکا تھا، خوفزدہ کھڑی تمام لیڈیز پر نظر دوڑاتا المان، ایک لمبی سانس کھینچتا، ٹیبل پر سے گلاب اٹھا کھڑا ہوا۔

”مانہ!“ وہ ساٹھ لہجے میں گویا ہوا، مانہ کو مانو کہہ کر پکارنے کا فیصلہ کرنے کے بعد آج اسے پہلی بار اسے اس کے پورے نام سے پکارا تھا، سب سے پہلے اپنا نام ساعت سے نکراتے ہی وہ آنکھیں میچتی، غلجٹ سے چلتی المان کے سامنے جا کھڑی ہوئی، ہکا بکا کھڑی تمام لڑکیاں مانہ کا نام سب سے پہلے پکارے جانے پر نفرت سے اسے گھورتی دیکھائی دی تھیں۔

”کیا آپ مزید ایک ہفتہ یہاں رہ کر مجھے برداشت کرنا پسند کریں گی؟“ وہ سرگوشی میں بولا، چہرے پر شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، مانہ اسے گھورتی، گلاب پکڑتی، لڑکیوں کی قطار کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی۔

دوسرا پکارے جانے والا نام آسکے کا تھا، وہ خوشگوار انداز میں گلاب تھامتی، مانہ سے کچھ فاصلے پر آ کھڑی ہوئی، تیسرا نام مسکان کا تھا، گلاب اسے تھماتے ہی وہ شریر مسکراہٹ لئے ایک بار پھر سے سرگوشی کرنے لگا۔

”اس ہفتے کہیں کھونا نہیں۔“ مسکان دھیمی

مسکراہٹ لیوں پر سجاتی اثبات میں سر ہلاتی اٹھلے کے برابر میں جا کھڑی ہوئی، ایک کے بعد ایک گلاب کا سلسلہ چلتا رہا، منتخب کی جانے والی دس لڑکیاں مکمل ہوتے ہی ایڈمیٹ کی گئی پانچ لڑکیاں افسردگی سے منہ لٹکائے منتخب کی گئی لڑکیوں سے کھل کر، اپنا اپنا سامان پیک کرنے کی غرض سے اپنے اپنے رومز کی جانب بڑھنے لگیں، ایڈمیٹ کی جانے والی پانچ لڑکیوں میں سرفہرست سحر تھی، جو بے ٹیبل گے عالمی میں اپنی جگہ کھڑی آنسو بہاتی المان کو گھور رہی تھی، اٹھلے سحر کی ایڈمیٹ ہونے پر خاصی افسردہ دیکھائی دی تھی، سحر کے ساتھ ساتھ ایڈمیٹ کی جانے والی لڑکیوں میں ایک بیوقوف کورین جوڑی، غیوری، میراں، بوش مسلم فارا اور ایک انڈین لڑکی پوجا شامل تھی۔

مانہ کی نگاہ اچانک المان پر جا گئی، جو سب کی موجودگی کے باوجود غفلت سے باندھے شریر مسکراہٹ لیوں پر سجاتے اس کی جانب دیکھتا دیکھائی دیا تھا، مانہ جلدی سے نظروں کا زاویہ بدلتی، لب بچتی، لمبی سانس کھینچ کر رہ گئی۔

”سارا پلان چوہٹ ہو کر رہ گیا، اب پھر سے وہی سب برداشت کرنا ہوگا۔“

☆☆☆

پل لمحوں، منٹوں، گھنٹوں اور گھنٹوں میں بدلتے چلے گئے، مانہ، المان کو اپنے قریب بٹھکنے کا موقع تک نہ دے رہی تھی، المان مکمل طور پر بیزار ہو کر رہ گیا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ ڈھیروں خوبصورت لڑکیوں کی موجودگی میں بے انتہا مزے کرنے والا ہوں میں، لیکن آئی وائز روگ۔“ وہ بن پانی پھٹی کی طرح اپنے کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹتا پھر رہا تھا۔

”نہیں جائے ان سب کی موجودگی مجھے اور جس کی موجودگی کا میں طلبگار ہوں، وہ محترمہ،

وہ دھبے سے مسکرا دیا۔  
 ”ہوں..... گنڈا“ وہ اپنی ڈائری کو دیکھتی  
 بولی۔

”ڈیٹ کے انتظامات اور ایلیمنٹ کی  
 گنریاں تھکا کر رکھ دیتی ہیں اور پھر ایڈیٹنگ آزا  
 رینگی ٹف جاب۔“ وہ دور کہیں غیر مرئی نقطہ پر  
 نظرس نکاتا سنجیدگی سے گویا تھا، مانہ اثبات میں  
 اپنا سر ہلا کر رہ گئی۔  
 ڈائری پر نظر دوڑائی۔

”آں..... اپنے ناول کے لئے، یہاں پر  
 گزارے گئے کچھ پوائنٹ نوٹ کر رہی تھی۔“ وہ  
 دھبے لہجے میں جواب دہی۔  
 ”او کے..... گنڈ۔“

”کبھی کبھی مجھے شدت سے احساس ہوتا  
 ہے کہ کاش، آپ نے مجھے وہ کانٹریکٹ نہیں دیا  
 ہوتا۔“ وہ نظرس جھکائے اسردگی سے گویا ہوئی،  
 عاشر اس کی جانب دیکھتا ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔  
 ”اوہ آئی ایم رینگی ویری سوری مانہ! مجھے  
 بالکل اندازہ نہ تھا کہ الحان تمہیں ایلیمنٹ نہیں  
 کرے گا۔“

”الحان میری سمجھ سے باہر ہیں۔“  
 ”پہلے دن سے لے کر اب تک، میں نے  
 بھی Observe کیا ہے مانہ اور مجھے لگتا ہے،  
 بلکہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ الحان تم میں  
 اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے، وہ تمہیں  
 ایلیمنٹ کیوں نہیں کر رہا۔“ چند ٹائپ کی خاموشی  
 کے بعد عاشر گہری متانت سے گویا ہوا تھا، مانہ  
 آنکھوں میں بے پناہ حیرت سمونے براہ راست  
 عاشر کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

”شاید الحان سے یہ بات برداشت نہیں ہو  
 رہی کہ یہاں پر موجود ہر لڑکی کی طرح میں ان  
 میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔“ وہ بولی۔  
 ”نہیں..... بلکہ اس لئے کہ تم واقعی ایک

گھاس تک نہیں ڈالتیں مجھے، اپنے دل کا دروازہ  
 ہی نہیں کھول رہی میڈم! انا پرست لڑکی ہوں۔“  
 وہ اپنے بالوں کو ٹھیکوں میں دلوپے بھی سانس  
 بچھ کر رہ گیا۔

”سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گا میں۔“  
 وہ پھر سے ارد گرد چکر لگانے لگا۔

”او کے!“ فیملنگ کن انداز میں آئینہ میں اپنا  
 عکس دیکھتا وہ کمرے سے باہر کی جانب بڑھ گیا،  
 تیز تیز قدم سمندر کی جانب بڑھاتا وہ غصے کے  
 عالم میں اپنی شرٹ کے بٹن کھولا، قدم بہ قدم  
 سمندر کی لہروں کی جانب بڑھتا رہا، موسم ہمیشہ کی  
 طرح بے حد شگوار تھا، نیلے وسیع آسمان پر کالے  
 کالے بادل گھر گھر کر بھاگے چلے آ رہے تھے،  
 اس وقت چوب کل کے باہر کوئی جھمی نہ تھا، شاید  
 تمام لڑکیاں ابھی تک اپنی اپنی خواب گاہ سے باہر  
 نہ نکل چکیں، یا پھر شاید ناشتہ کا دور اپنے عروج پر  
 تھا، الحان چوب کل پر نظر دوڑاتا اپنی شرٹ بچھ کر  
 اتاری اور دور اچھاں دی اور اٹھلائی، مٹکھلائی  
 لہروں کے بچھ و بچھ سوئمنگ کرنے لگا۔

☆☆☆

”گنڈ مارنگ!“

پہنے من پسند درخت کے سائے تلے بیٹھی  
 ڈائری لکھتی مانہ اس وقت یکا یک چونک اٹھی،  
 جب عاشر نے اس کے دو قدم کے فاصلے پر رک  
 کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔  
 ”گنڈ مارنگ ٹوا“ وہ اپنی ڈائری بند کرتے  
 ہی شیریں لہجے میں گویا ہوئی۔  
 ”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ وہ پوچھ  
 رہا تھا۔

”ہاں..... بالکل۔“ وہ برجستہ بولی، عاشر  
 لب سمجھتا، مانہ کے برابر میں بیٹھ گیا۔  
 ”شو کا فیڈ بیک کیسا ہے؟“ وہ متانت سے  
 پوچھنے لگی۔

”بہت اچھا لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔“

دلچسپ پر سناٹائی کی مالک ہو۔“ وہ ایمانداری سے بولا، مانہ مسکرا کر رہی۔  
”تھنک یو۔“

”ڈیکلر!“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”یہاں پر موجود سبھی لوگوں نے محسوس کیا ہے بلکہ دیکھا ہے کہ الحان باقی تمام لڑکیوں کی نسبت، تمہیں زیادہ اہمیت دیتا ہے، تمہارے ساتھ زیادہ تاہم گزارنا چاہتا ہے۔“ عاشق کی باتوں کو سن کر وہ چند لمحوں کے اندر ہی، پھر بولی۔  
”الحان صرف مجھے تنگ کرنے کے نیت سے یہاں ڈھونڈتے رہتے ہیں بس اور کوئی بات نہیں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”کوئی بات ہے یا نہیں، اس سے میں مکمل طور پر واقف نہیں، ہاں البتہ تمہارا خیر خواہ ہونے کے ناطے، میں تمہیں خبردار ضرور کرنا چاہوں گا، کہ الحان کی کسی بھی بات پر فرسٹ ہرگز نہ کرنا، وہ ایک لمبے بوائے ہے، یونیورسٹی کے زمانے سے جانتا ہوں اسے، اس کی رگ رگ ہے واقف ہوں، نہ وہ تمہارے ساتھ سنجیدہ ہے، نہ کبھی ہوگا، بہت چالاک انسان ہے الحان ابراہیم، سو بلی کیر فل۔“ وہ گہری سنجیدگی سے مانہ کے پریشان چہرے کی جانب دیکھتا اسے خبردار کر رہا تھا۔

”آئی نو، مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا عاشق! میں واپس جانا چاہتی ہوں، مجھے یہاں نہیں رہنا پلیر۔“ وہ خاصی خوفزدہ دیکھائی دے رہی تھی۔

”آئی ایم سوری مانہ! شو کی کئی اقتضا آن ایر جا چکی ہیں اور پھر ان کی خاص توجہ کے باعث تم اس شو میں خاصی واضح دیکھائی دے رہی ہو، کانٹریکٹ والی بات بہت دور رہ گئی ہے، اب سب الحان کے ہاتھ میں ہے، وہ تمہیں اینٹی میٹ کرے، کبھی تم واپس جاسکتی ہو۔“

”اور وہ ایسا نہیں کرے گا، وہ بہت ضدی انسان ہے۔“ وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

”دیکھو میرا مقصد تمہیں ڈرانے کا نہیں تھا،

میں صرف تمہیں خبردار کرنا چاہتا تھا، باقی تم خود خاصی سنجیدہ اور سمجھدار لڑکی ہو، بہادری سے اس کا سامنا کرو اور اسے شکست دو اور پلیر ڈونٹ وری، ریلیکس۔“ مانہ اثبات میں سر ہلاتی پر سوچ انداز میں منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہی۔

☆☆☆

تیس منٹ کی سوئمنگ کے بعد ساحل کی جانب بڑھتے الحان کی نظریکا ایک درخت کے سائے تلے بیٹھے عاشق اور مانہ پر جا گئی۔  
”ان دونوں کے سچ آخر چل گیا رہا ہے؟“ وہ من ہی من میں سوچتا مشکوک انداز میں ان دونوں کی جانب دیکھتا رہا۔

”اور یہ محترم! مانو نے آج تک میری باتوں کو اتنی توجہ سے نہیں سنا۔“ تیزی چڑھائے آگ بکول لگا ہوں سے ان دونوں کی جانب دیکھتا وہ دیرے دیرے قدم بہ قدم ساحل کی جانب بڑھنے لگا، ان دونوں کو نظروں کا محور بنائے وہ اندر ہی اندر جل بھن سا گیا۔

”الحان!“ مس فاطمہ ہاتھوں میں سفید اونیپل تھامے الحان کی جانب بڑھتی دیکھائی دی تھیں، ان دونوں پر سے نظر ہٹاتا وہ نظریں گھما کر مس فاطمہ کی جانب دیکھنے لگا۔

”یہ آج کا ڈیٹ شینڈل ہے۔“ انہوں نے وہ لفافہ الحان کی جانب بڑھا دیا۔

”کہاں؟“ وہ لفافہ ہاتھ میں تھامتا بے زاری سے گویا ہوا۔

”یہیں جزیروہ پر، پچھلی جانب ڈیکوریشن کے انتظامات کیے جا رہے ہیں، آپ اگر دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتے ہو، سب ٹھیک ہے یا کچھ مینج کرنا ہے۔“ مس فاطمہ ڈشیل بتاتیں اپنے گلے میں بننے اپنے نام کے کلب بورڈ کی جانب دیکھنے لگیں، الحان نے جبکہ گراہی شرٹ اٹھائی تھی۔

”ڈیٹ کس کے ساتھ ہے؟“  
”گر وپ ڈیٹ ہے، برینڈ اور نیہا کے

واپسی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا، الحان کے اچانک وارد ہونے پر یکا یک چونک اٹھا، الحان بھٹک اپنا غصہ کنٹرول کرتا، چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کی جانب دیکھتا محل سے گویا ہوا تھا۔

”ہائے“  
”الحان تمہیں ڈیٹ شیڈول مل گیا؟“  
”ہاں..... مل گیا..... لیکن میں نے کچھ چیونٹیک کی ہے۔“

”چیونٹیک؟“ عاشر اب کے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”گروپ ڈیٹ دولڑکیوں کے بجائے تین لڑکیوں کے ساتھ ہوگی مانہ بھی شامل ہے آج کے ڈیٹ گروپ میں اور یہ گروپ ڈیٹ لندن میں ہو گی۔“

”لندن میں؟ اچانک سے؟ کوئی انتظامات نہیں، آؤٹ آف بجٹ ہو جائے گا یا۔“ عاشر خاصا حیران دیکھائی دینے لگا تھا۔

”ان سب کی تم فکر نہیں کرو، بجٹ اور انتظامات سب میں اچھے سے سنبھال لوں گا، میں کچھ دیر کے لئے یہاں سے ٹکٹنا چاہتا ہوں یا۔“ اس کے لہجے میں بیزاریت واضح طور پر عیاں تھی، اس کی نظر میں عاشر سے پھسلتی درخت کے سائے تلے پریشان بھی مانہ پر جارکیں۔

”یہ اتنی پریشان کیوں ہے؟“ وہ من ہی من میں ہم کلام ہوا۔

”ہمیں جلدی ٹکٹنا ہو گا۔“ عاشر سے کہتا وہ اپنے برابر رکتی مس فاطمہ کی جانب دیکھنے لگا۔

”مس فاطمہ آپ نیہا اور برینڈا کو تیار رہنے کا کہہ دیں اور یاٹ بھی ریڈی کروادیں۔“ مس فاطمہ اثبات میں سر ہلاتیں اندر کی جانب بڑھنے لگیں جبکہ عاشر سراسیمہ حیران کھڑا الحان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”What?“ الحان اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر سجائے عاشر کی جانب مخاطب

ساتھ۔“ گروپ ڈیٹ ہے تو مانہ کو بھی ایڈ کر دیں گروپ میں۔“ وہ لہجے کو لاہر واہ بتاتے بولا۔

”اور کون کون جانے والا ہے ساتھ؟“  
”دو کیسہ مین ہیں اور کچھ گروپ کے لوگ ہیں، آپ دیکھ لیں یہ لسٹ ایک بار۔“ مس فاطمہ نے لفافہ کی جانب اشارہ کیا۔

”میں یہ ڈیٹ یہاں پر نہیں کرنا چاہتا، تھک گیا ہوں یہاں پر رہ رہ کر، مجھے تھوڑے پیسج کی ضرورت ہے اس لئے آپ پلیز عاشر سے کہہ دیجئے کہ میں یہ ملاقات اس جزیرہ کے کہیں باہر جا کر کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بیزاریت سے گویا ہوا تھا، مس فاطمہ آئی برواچکا کر رہ گئیں۔

”مثلاً کہاں؟“  
”لندن!“

”لندن؟ پھر تو پوری رات لگ سکتی ہے اور کل صبح سے پہلے کی واپسی ممکن نہیں۔“ وہ اچنبھے سے گویا ہوئیں۔

”ہوں۔“  
”پھر گروپ کے زیادہ لوگوں کو ساتھ لے کر جانا پڑے گا اور شاید عاشر بھی۔“

”عاشر ہمارے ساتھ نہیں جائے گا، ناں؟“  
”نجانے وہ پوچھ رہا تھا یا بد کر رہا تھا، مس فاطمہ سمجھ نہ پائیں۔“

”معلوم نہیں، یہاں ایڈٹینگ کا کافی کام ہے جو ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔“

”گڈ میں ان تینوں کو لندن لے کر جاؤں گا یہاں انتظامات رکوا دیں۔“ وہ قطعیت بھرے انداز میں بولتا آگ بگولہ لگا ہوں سے ان دونوں کی جانب دیکھتا انہی کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

”اپنی ایڈٹینگ کا کام ادھورا چھوڑ کر، مانو کے ساتھ کہیں ہانکنے کی اس کی ہمت کیسے ہوگی۔“ وہ من ہی من میں کڑھتا ان دونوں کے قریب جا رکھا، عاشر جو ابھی ابھی مانہ کی کسی بات پر مسکراتا

گئی۔

المان شریہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے مانہ کو چوب محل کی جانب بڑھتا دیکھتا رہا، اس کی نگاہوں سے اوچل ہوتے ہی المان جی سانس کھینچتا اپنے کیمین کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

یاٹ پر بجائے گئے آدمے گھنٹہ کے سفر کے بعد تمام سلیکنڈ ٹیم المان کے پرائیویٹ طیارے پر سوار لندن کے لئے روانہ ہو چکی تھی، نیہا اور بریڈا المان کو گھیرے نجانے کہاں کہاں کی باتیں کہے چلی جا رہی تھیں، مین کیرہ مین اپنے اپنے کیمین کراڑ سنبالے بھی ریکارڈنگ کرنے لگتے تو بھی کیراز سائیڈ پر رکھے آرام کرنے لگتے، مانہ ان سب سے دور کرائی سیٹ پر بیٹھی، کٹری سے باہر جمائی نجانے کیا کیا سوچے چلی جا رہی تھی، المان اپنا سارا ناٹم مانہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند تھا مگر وہ دوڑا کیاں تھیں کہ موقع نہ دے رہی تھیں، ہڑ پڑ بولے ہی چلی جا رہی تھیں۔

”ایک تو عاشر نے کیرا مین کی پوری ٹیم میرے ساتھ روانہ کر دی ہے، آخر ضرورت کیا تھی تین تین کیرہ مین کو ساتھ بیٹھنے کی، ہاں میں نے کہا تھا کہ بجٹ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ ایک انسان آپ کو ہاتھ دے اور آپ اس کی بازوؤں ہی سے بچ لیں۔“ من ہی من میں کڑھتا کیرہ مین پر نظر دوڑا تا اب وہ مانہ پر اپنی نظریں نکا بیٹھا تھا۔

”اور یہ محترمہ..... مجال ہے..... جو تھوڑی سی پلک لے آئیں اپنے رویہ میں، اب دیکھو، اتنی دور بیٹھی، کٹری سے باہر نجانے کون سا خزانہ تلاشے میں مصروف ہے۔“ وہ جمل بھن کر رہ گیا، اب اس کی بیزار نگاہیں نیہا اور بریڈا پر مرکوز تھیں، جو باری باری منہ کھولے مسلسل کچھ نہ کچھ بولے چلی جا رہی تھیں۔

ہوا، جواباً عاشر بنا کچھ بولے ہاتھ کے اشارے سے گزٹک بولٹ پلٹ گیا۔

”مالو! ہماری ڈیٹ کے لئے تم خوش ہو؟“ وہ دور جاتے عاشر کی جانب دیکھتا وہی آواز میں گویا ہوا، تاکہ عاشر اس کا کہا گیا جملہ اچھے سے سن سکے، عاشر نے کوئی ری ایکشن نہیں دیا تھا۔

”ڈیٹ؟“ غالباً مانہ کے سر پر ایک بلاسٹ سا ہوا، وہ حیران کن نگاہوں سے المان کی جانب دیکھنے لگی۔

”ہم لوگ لندن جا رہے ہیں۔“ وہ مگر بخوش کا مظاہرہ کرتا براہ راست مانہ کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”لندن؟“ اسے اچنبھا ہوا، المان مسکراتے ہوئے ایک آنکھ دھاتا، ہاتھ بڑھا کر مانہ کا ہاتھ تھامے ہی اسے پیچ کر اٹھانے لگا۔

”کم آن مالو! تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں، جلدی سے جا کر اپنا کچھ سامان پیک کر لو۔“

”سامان؟“ مانہ کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا، وہ المان کے آٹا فانا برساتی حملوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

”ہم آج کی رات لندن میں ہی رہیں گے، کل صبح ہماری واپسی ہوگی، اس لئے جاؤ اور اپنا ضروری سامان پیک کر لو۔“ المان نے ڈیٹیل بتاتے ہی اسے اپنی جانب کھینچا، المان کے کھینچنے پر وہ ایک جھٹکے سے اپنی اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔

”اور کون کون جا رہا ہے؟“ وہ جو اس باختہ حیران کٹری المان کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

”بریڈا اور نیہا، اب جاؤ اور جا کر تیار ہو جاؤ، چلو شاباش، اچھی بنی۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے اندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا، مانہ تا ساف بھرے انداز میں سر ہلاتی، نڈ حال قدموں کے چلتی اندر کی جانب بڑھنے

سب ایک خواب سا لگ رہا تھا، ستائش بھری نگاہوں سے ہول کی جانب دیکھتی، ناک پر مٹی ٹپک دو درست کرنی وہ دم بخود چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہول کے مین دروازے کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

☆☆☆

”ٹوٹل تھری رومز ہیں، ایک روم میرا اور باقی کے دو رومز آپ تینوں لیڈیز آپس میں شیئر کریں گی اور یہ تینوں کیمرو مین باہر چھینٹل کی گاڑی میں رہیں گے، ناشتہ کے بعد ہم لوگ واپس آؤں لینڈ کے لئے روانہ ہو جائیں گے، گرلز اگوائڈ سلیکٹ پور رومز۔“ الحان لابی میں داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا تھا۔

نیہا اور بریڈا الحان کی بات سنتے ہی جپ لگاتیں، تقریباً دوڑتی ہوئیں سیڑھیوں کی جانب بڑھیں تھیں، تینوں کیمرو مین اپنے اپنے کیمرو سنبھالے ہول کی ریکارڈنگ میں مصروف تھے، مانہ نظرس مگھا مگھا کر ہول کا کونہ کونہ ذہن نشین کرتی دیکھائی دی تھی، آخر اسے اپنے تاول میں جو لکھا تھا، الحان بغور مانہ کے چہرے کا جائزہ لیتا اس کے قریب آکڑا ہوا تھا۔

”ہائو؟“

”لیس؟“

وہ ہول کی چار دیواری سے بنا نظر ہٹائے مشغول انداز میں گویا ہوئی، وہ کافی حیران دیکھائی دے رہی تھی۔

”تم بھی جا کر اپنا روم دیکھ لو۔“

”نیہا اور بریڈا میرے ساتھ روم شیئر کریں پسند نہیں کریں گی۔“ وہ مکن سے انداز میں بولی۔

”کوئی بات نہیں، تم چاہو تو میرے ساتھ روم شیئر کر سکتی ہو۔“ وہ مٹی خیز انداز میں گویا ہوا،

”اور یہ..... بن سیل کے دور یڈیو، پچھلے دو مگھنوں سے ایک ہی بیزار ترین خبر نامہ نشر کیئے چلی جا رہی ہیں، اف۔“ وہ بظاہر ہلکا سا مظاہرہ کرتا اندر ہی اندر خود سے جنگ لڑنے چلا جا رہا تھا۔

”ایمی دیز! آج کا یہ موقع میں اتنی آسانی سے گنوا نے نہیں دوں گا، آج میں مانہ سے دو ٹوک بات کروں گا، اسے آخر مجھ سے مسئلہ کیا ہے؟ کیوں وہ مجھ سے اس قدر اکٹری اکٹری رہتی ہے؟“ وہ مانہ کو نظروں کا محور بنائے من ہی من میں پلان کرنے لگا۔

”آئی لو، نیہا اور بریڈا اسے جان چھڑاتا تھوڑا مشکل کام ہے اور پھر یہ تین مین کیمرو مین..... ہوں ان سب کی موجودگی میں مانو سے بات کرنا اپو سیل..... خیر کب تک جانتے رہیں گے یہ سب ان سب کے سونے کے بعد ہی میں مانو سے کوئی بھی بات کر سکتا ہوں، یہ محترمہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہیں اس بات کا مجھے اچھے سے اندازہ ہے۔“ من ہی من سارا پلان تصور کرتا اب وہ پرسکون انداز میں سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

انٹر پورٹ پہنچتے ہی ایک بلک مرسیڈیز اس تمام ٹیم کو پک کرنے کے لئے پہلے سے موجودگی، الحان تینوں لڑکیوں سمیت گاڑی میں ہول کے لئے روانہ ہو چکا تھا، کیمرو مین الگ کار میں ہول کے لئے روانہ ہوئے تھے، تقریباً آدھا مگھنہ کی ڈرائیو کے بعد الحان کی گاڑی لندن کے ایک خوبصورت نہایت ہی مصروف عمدہ اور مہنگے ترین ہول کے سامنے چارکی، نیہا اور بریڈا منہ کھولے ساکت کھڑیں، پچھلی نگاہوں سے ٹکر ٹکر ہول کی جانب دیکھے چلی جا رہی تھیں۔

مانہ نے بھی (The Dorchester Hotel) کا نام بہت سنا تھا لیکن اس نے شاید کبھی خواب میں بھی نہ سوجا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی اس عالی شان اور لندن کے مہنگے ترین ہول میں رہنے کے لئے آئے گی، اسے اس پل یہ



ہوٹل کا جائزہ لیتی ماندہ یکا ایک چوک اٹھی، وہ اب شعلہ برساتی نگاہوں سے بغور الحان کی جانب دیکھنے لگی۔  
”دیر ہی فی!“

”اوہ لیس! اٹ اٹنی..... خیر خواہ خواہ فہمہ میں اپنی ازبجی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، میں مذاق کر رہا تھا۔“

”آپ مذاق نہیں کر رہے تھے، بہت اچھے سے جان چکی ہوں آپ کو الحان ابراہیم صاحب!“ وہ فہمہ میں پھنکاری۔

”اچھا..... کیا جانتی ہیں آپ میرے بارے میں؟“ وہ قہقہے سے گویا ہوا۔

”فالتو میں بحث نہیں کرتی مجھے۔“ وہ فہمہ میں پھنکارتی اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

”ہاں سب جانتی ہیں آپ..... بہت سمجھدار جو ہیں، ایک میں ہی بے خوف ہوں اس پوری دنیا میں۔“ ماندہ بیگ اٹھائے میز چیموں کی جانب بڑھنے لگی تھی، الحان نے جلدی سے دیوار بننے ہی اس کا راستہ روک لیا تھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، اپنے بارے میں آپ خود بہتر جانتے ہیں۔“ وہ براہ راست الحان کی آنکھوں میں جمنا چلتے ہوئے پھنکاری، الحان لا جواب ہو کر رہ گیا۔

”اور ہاں..... میں آپ لوگوں کے ساتھ مزید نام نہیں گزار سکتی، آپ لوگوں کو باہر کہیں بھی جانا ہو یا اسی ہوٹل میں کہیں بھی نام سپینڈ کرنا ہو تو پلیز مجھے بلانے کی ضرورت نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، مجھے آرام کرنا ہے۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولتی میز چیموں کی جانب بڑھنے لگی، الحان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی فرض سے اس کا بیگ چھین لیا تھا۔

”کم آن مانو! ایسا نہیں کرو پلیز، یہ سب

میں نے تمہارے لئے کیا ہے۔“ الحان خاصا آرزو دیکھا کی دیا تھا۔  
”میرے لئے؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”ہاں، تمہارے لئے۔“ وہ اپنی بات دہراتا ایک بار پھر بے شرارت پر آمادہ تھا۔

”دیکھو میں آتا ہی ہوگا، نہیں تو تمہیں لینے میں تمہارے روم میں آ جاؤں گا اور تمہیں یہ بات یقیناً نا پسند ہوگی۔“ وہ شرارت بھرے انداز میں اسے دھمکانے لگا تھا، ماندہ آکٹس پاٹنگا ہولی سے اسے گھورتی، فہمہ میں پھنکارتی، اپنا بیگ پھینچتی، تیزی سے چلتی میز چیموں کی جانب بڑھتی لگی، جواباً الحان شریر مسکراہٹ لپوں پر سجائے جینو کی پوٹ سے موبائل نکالتا، نمبر ڈائل کرتے ہی موبائل کان سے لگا کھڑا ہوا تھا، دوسری ہی تیل پر کال رسیو کی جا چکی تھی۔

”ہیلو کبیر! کیا ہو یار؟“ وہ فون پر اپنے اسی میسٹ فرینڈ سے مخاطب تھا جس کے ساتھ شرط لگائے وہ اس شوکا اہم حصہ بنا تھا۔

”اچھا یار ایک کام کر، فوراً سے پہلے دی ڈور چسپر ہوٹل پہنچ، فوراً جلدی۔“ کہہ کر الحان نے فون بند کر دیا اور دیسلنگ کرتے ہوئے اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

”سین کیا ہے ہاس؟ اس کے آس پاس ہونے پر تو بہت عجیب لی ہو کرتا ہے۔“

وہ سب لوگ پہنچ کیے اس وقت ہوٹل کے لاؤنج میں موجود تھے، نیپا اور برینڈ اگھوم گھوم کر لاؤنج کا چپا چپا دیکھ رہی تھیں، تینوں یکسرہ مین الگ الگ جگہیں سنبھالے اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، ماندہ، الحان اور کبیر سے خاصے قاصطے پر بیٹھی تھی، اسی پل ماندہ پر نظر دوڑاتا کبیر

ٹائپ کی ہیں دونوں، میں چاہتا ہوں کہ تو ان دونوں کو پہنچی دے، تاکہ یہ مجھ سے دور رہیں۔“  
الحان ہیرا ریت سے گویا ہوا۔

”اچھا یعنی تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے میدان صاف کروں؟ میں ان دو چڑیلوں کو سنبھالوں اور پیچھے تم اس فیری کو۔“ الحان نے آنکھیں دیکھائی۔

”اوہ سوری مانو؟“

”خبردار جو تو نے اسے مانو بولنے کی جرأت بھی کی، من توڑ دوں گا سالے تیرا۔“  
”اے تو بھی تو.....“

”ہاں میں، صرف میں اس مانو کہہ کر پکار سکتا ہوں بس۔“

”اوائے ہوئے، کیا بات ہے، لو بھیا، تو مجھے صاف صاف شرط ہارتا دیکھائی دے رہا ہے۔“ کبیر نے جوس کا گلاس ٹھیل پر رکھتے ہی فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”لہو سئل۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”لہو سئل کا اصل مطلب ہوتا ہے، آئی ایم پوسبل! سمجھے میرے بھائی۔“

”کبیر!“ وہ اسے آنکھیں دیکھانے لگا۔

”مان لے میری بات، تو یہ شرط ہار رہا ہے اور میں جیت رہا ہوں، مان لے اپنی ہار، کوئی بات نہیں، ایسے بڑے بڑے شہروں میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔“

”بکیر ابھی بات ہے میرے دوست، جسٹ ویٹ اینڈ وای۔“

”اوکے اوکے ہم تو دیکھ ہی رہے ہیں، پر آپ جناب دیکھ نہیں رہے۔“

اسی لمبے کبیر، مانو کو لاؤنج سے باہر نکلتے دیکھ لیا ایک اچھل کر رہ گیا۔

”اے وہ دیکھ، تیرے والی باہر جا رہی

جوس کا سیپ لیتا شریر انداز میں گویا ہوا تھا، جواباً الحان انجان بن کر بولا۔

”کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟“

”تم اچھے سے جانتے ہو کہ میں کیا بات کر رہا ہوں اور کس کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔“ اس بار کبیر سرگوشی کرنے لگا۔

”صاف صاف دیکھائی دیتا ہے میرے بھائی، جب جب وہ تمہارے آس پاس ہوتی ہے، تمہاری نظر اس پر سے ہٹتی ہی نہیں جگ میں، نی دی پر سب دیکھا گیا الحان صاحب۔“  
وہ اس بار معنی خیز انداز میں گویا ہوا تھا۔  
”ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”ایسا کچھ نہ کچھ تو ہے، مجھے لگتا ہے تو اسے پسند کرتا ہے، لیکن وہ تجھے پسند نہیں کرتی، ایسا ہے ناں؟“ الحان کو اچنبھا ہوا، اس کا دوست بالکل درست کہہ رہا تھا، نظروں کا زاویہ گھمائے وہ جوس پینے لگا۔

”وہ مجھے پسند کرتی ہے، اگر نہیں کرتی ہوتی، تو آج یہاں پر موجود نہیں ہوتی، انٹیمٹ اس شو میں ہی موجود نہیں ہوتی۔“ اس نے جلدی سے ایک جھوٹ بولا، کبیر معنی خیز لگا ہوں سے اسے گھورتا رہا۔

”وہ تجھے پسند نہیں کرتی، ..... اور تم اس میں اتنی دلچسپی لے رہے ہو؟ تجھے یاد ہے ناں اپنی شرط، اس شو کے اینڈر ٹوپلٹ کر بھی بھی ان میں سے کسی بھی لڑکی کی جانب نہیں دیکھنے والا۔“

”ہاں ہاں یاد ہے سب کچھ، اچھے سے یاد ہے، تجھے میں نے یہاں شرط یاد دلانے کے لئے نہیں بلایا ہے۔“

”پھر کس لئے بلایا ہے؟“

”یاد رہے نیپا اور برینڈا ان شاپ ریڈیو ہیں، بہت سرگھائی ہیں قسم سے، بالکل تیرے

ہے۔“ الحان جس کا گلاس ٹیبل پر پٹپٹا تیزی سے کھڑا ہوتے ہی پلٹ کر لاؤنج سے باہر نکلتی ماند کی جانب دیکھنے لگا۔

”کبیر! تو یہاں سنبھال، میں ابھی آیا۔“

”کہاں جا رہا ہے؟“

”بس ابھی آیا، دو منٹ میں۔“ وہ چپ لگا تا ٹیبل پھلانگتا، تیز تیز قدم دروازے کی جانب بڑھانے لگا، کبیر اپنا سر کھچا کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہ خشک ہوا سے ٹھمرتی گاڑن میں چلی آئی تھی، موسم بے حد خوشگوار تھا، تازہ ہوا اسے لپٹی روح میں اترتی محسوس ہوئی، وہ لمبی سانس لیتی تھی تازہ ہوا کو کھینچ کھینچ اپنے اندر اتارنے لگی کہ یکا یک ایک شناسا آواز اس کی سماعت سے نکلا۔

”مالو..... مالو!“ آواز ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اسے نزدیک سے نزدیک تر ہوتی محسوس ہوئی، اس نے پلٹ کر دیکھا، سامنے سے الحان دوڑا چلا آ رہا تھا، ماندہ غصے سے بل کھاتی تیز تیز قدم اٹھاتی آگے کی جانب بڑھنے لگی۔

”مالو! رو کہاں جا رہی ہو؟“

”جہنم میں، چلنا ہے ساتھ؟“ وہ غصے سے پھینکاری۔

”ہاں ضرور، تمہارے ساتھ تو کہیں پر بھی جانے کو تیار ہوں اگر تم ساتھ ہو۔“

”الحان پلیز مجھے کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دو۔“

”ایسے کیسے اکیلا چھوڑ دوں، تم فرار ہو گئی تو؟“

”ڈونٹ وری، ٹاپ فور سے پہلے کہیں فرار نہیں ہونے والی، سو جسٹ ریلیکس۔“

”اوہ واؤ، آئی لائک اٹ۔“ وہ قدم بہ قدم

اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”چیکو۔“ ماندہ زیر لب بڑبڑاتی آگے بڑھتی رہی۔

”کیسا؟..... کیا کہا تم نے؟“

”الحان! میں تھوڑی دیر کے لئے اکیلے وقت گزارنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں، تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”پر مجھے کرنی ہے، مجھے یہ پوچھنا ہے تم سے کہ تم مجھے اتنا اگنور کیوں کر رہی ہو؟“

”میں اگنور نہیں کر رہی، میری طبیعت ہی ایسی ہے۔“

”پھر تو بہت ہی فضول طبیعت ہے تمہاری۔“

”شکریہ۔“ وہ ڈھٹائی سے بولتی آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔

”دیکھو مالو! تم صرف ٹاپ فور تک ہو میرے ساتھ، اس کے بعد نبھانے ہماری ملاقات کبھی ہونہ ہو۔“

”نہ ہی ہو تو بہتر ہے، شکرانے کے لوافل ادا کروں گی میں۔“ وہ غصے میں پھینکاری۔

”تم ایک بار پھر سے میرا دل دکھا رہی ہو۔“

”اوہ واؤ تو آپ کا بھی دل دکھتا ہے الحان ایبراہیم صاحب؟“ وہ براہ راست اس کی جانب دیکھتی خطر کرنے لگی، الحان اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھا نہیں۔

”انسان ہوں میں، میرے سینے میں بھی دل ہے، جو دھڑکتا ہے، محسوس کرتا ہے اور تمہارے اس بیڈلی ہیویر پر دکھتا بھی ہے۔“

”بہت قلمی ٹائپ کے انسان ہوتم، ایکٹیوگ  
جتنی مرضی کروالو جتا ہے۔“

”تم؟“ وہ اس کی نگاہوں میں جھانکنے لگا۔

”کیا بات ہے مانو! تمہارے دل میں کوئی

بات ہے میرے خلاف؟“

مانہ بنا جواب دیئے ایک بار پھر سے اپنے  
دلوں ہاتھ سینے پر باندھے آگے کی جانب  
بڑھنے لگی۔

”مجھیں معلوم ہے مانو! تم مجھے ”تم“ کس

وقت کہتی ہو۔“ وہ چند لمحے خاموشی سے چٹا اس

کے جواب کا انتظار کرتا رہا، پھر بولا۔

”جب تم مجھ سے بے حد خفا ہوتی ہو۔“

”میں تم سے خفا کیوں ہوں گی الحان، میرا

تمہارا ایسا رشتہ ہے نہیں کہ میں تم سے کسی پر بات  
ظاہر کروں۔“

”کچھ تو بات ہے، جو تمہارے دل و دماغ

کو جکڑے ہوئے ہے، مجھ سے شیر کر دمانو،

ہاتھیں شیر کرنے سے ہی مسائل حل ہوا کرتے ہیں

ورنہ یہ غلط فہمیاں تو ایک بل نہیں لگا تھیں ہماری

خوشیاں کھاتے تھیں۔“

”تم اتنے چپکے کیوں ہو الحان! مجھے نفرت

ہے تم جیسے چپکے لوگوں سے۔“ وہ غصہ کا اظہار کرتی

ایک بار پھر سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی،

الحان چند تھاپے خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا

رہا، پھر دھیس سے گویا ہوا۔

”میں چپکے نہیں ہوں، تم سے کچھ سوالوں

کے جواب مانگ رہا ہوں بس۔“

”اور مجھے تمہارے کسی بھی سوال کا کوئی بھی

جواب دینے میں کوئی دلچسپی نہیں، آئی ایم

سوری۔“ وہ آتش پا لگا ہوں سے اسے گھورتی

واپس ہوٹل کے مین دروازے کی جانب بڑھنے

لگی، الحان پیچ و تاب کھاتا وہیں کھڑا رہا، مانہ کے

کچھ دور جاتے ہی وہ تیزی سے پلٹا ایک بار پھر  
سے اسے پکارتا اس کے تعاقب میں چل نکلا، مانہ  
اس کی پکار ان سنی کرتی تھیں تیز چلتی  
(Elevator) کا بلن دبانے لگی، لفٹ کا  
دروازہ کھلنے تک الحان اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

”مانو! میری بات سنو۔“

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ دروازہ

کھلتے ہی وہ لفٹ میں داخل ہوئی، الحان بھی

پھرتی کا مظاہرہ کرتا تیزی سے لفٹ میں داخل

ہوا۔

مانہ اس کی اس حرکت پر کڑھ کر رہ گئی، اس

وقت وہ دلوں اس لفٹ میں بالکل تنہا تھے، مانہ کو

پاس کھڑے الحان سے بے حد خوف محسوس ہونے

لگا تھا، بظاہر وہ خود کو نارل پوز کرتی اسے انکور کر

کے کھڑی تھی لیکن اندر ہی اندر اس کا دل زوروں

سے دھڑکتے چلا جا رہا تھا، الحان چند تھاپے

خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر دو قدم اس کے

قریب بڑھتے ہی سرگوشی میں گویا ہوا۔

”دل چاہتا ہے یہ لفٹ یہیں پر رک

جائے، تاکہ تم چاہ کر بھی مجھ سے دور بھاگنے کی

گستاخی نہ کر سکو۔“ اس کے لہجے میں کچھ چھپا تھا،

کچھ الگ سا، مانہ خود میں سمٹی شے کی بنی دیوار

سے جا لگی، الحان ایک قدم اور آگے بڑھا۔

”تاؤ مجھے، کیوں بھاگ رہی ہو مجھ سے؟“

وہ اس کے چند انچ کے فاصلے پر کھڑا اس کے

چہرے کا طواف کرتا، اسی سے مخاطب تھا، اسے

اس قدر نزدیک کھڑے دیکھ کر اس کا طلق خشک

ہونے کو آیا تھا، بمشکل الفاظ جمع کرتی وہ نظریں

جھکائے لڑکھائی آواز سے گویا ہوئی۔

”دیکھ..... کوئی بات ہے.....“

نہیں..... حق..... تو کیا تاؤں۔“ اس کی پیشانی

پر چھوٹے چھوٹے پانی کے قطرے نمودار ہونے

تم..... ایک ہی بل میں مجھے میری ہی نظروں میں  
گرا کر رکھ دیا ہے تم نے۔“ رقت انگیز انداز میں  
وہ اپنی آنکھیں سچ کر رہ گیا۔

”میں آپ کی پسند نہیں، آپ کی ضد بن  
چکی ہوں اور آپ جیسا انسان جب ضد پر اتر  
آئے تو کچھ ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے جیسی آپ کر  
رہے ہیں، اینڈ آئی ایم سوری ٹو سے، مجھے آپ کی  
کمی گئی کسی بھی بات پر رتی برابر یقین نہیں۔“ وہ  
آنسو صاف کرتی کہنے لگی تھی، الحان ساکت کھڑا  
اسے دیکھتا رہا، اسی لمحے لفٹ کا دروازہ کھل گیا،  
مانہ جاتے جاتے چلی۔

”ایک اور بات، میں آپ کو گھٹیا انسان  
سمجھتی نہیں ہوں، آپ گھٹیا انسان ہیں اور یہ میں  
پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔“ آگ  
گولا لگا ہوں سے اسے گھورتی وہ زہر افکتی اپنے  
کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی، الحان ایک لفظ بھی  
نہ بول پایا تھا، وہ اپنی ہی نظروں میں ڈھیر ہوتا چلا  
جارہا تھا، کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے وہ لمحہ، جب  
آپ کسی کو اپنی پوری ایمانداری کے ساتھ چاہیں،  
اسے اپنے سچے ہونے کا یقین دلانے کی بارہا  
کوشش کریں لیکن وہ ایک شخص آپ پر یقین نہ  
کرتے ہوئے آپ کو آپ ہی کی نظروں میں گرا  
کر چلا جائے، اسے آج اس بات کا شدت سے  
احساس ہوا تھا، اس نے آج سے پہلے نہ جانے کتنی  
لڑکیوں کا دل دکھایا تھا، ایک سرور تھا جو اسے ہر  
دوسری لڑکی کے ساتھ محسوس ہوا کرتا، جو نئی نئی  
ہوتی اور پھر وہ اپنے پرانے لباس کی طرح جس  
سے دل بھر جائے وہ مرد راتا پھینکتا اور نئی راہوں  
میں نئے جال بچھا کر نئے دانے گراتا، مگر آج  
کچھ بدلا تھا اس میں، وہ پہلے جیسا ہرگز نہ رہا تھا،  
اسے دل دیکھنے کا احساس ہوا تھا، کچھ تھا جو اندر ہی  
اندر اس پر ضرب لگائے چلا جا رہا تھا۔

لگے، الحان ان قندروں پر نگاہ دوڑاتا ایک بار پھر  
سے گویا ہوا۔  
”ڈرو نہیں مجھ سے، کھا نہیں جاؤں گا  
جہیں۔“

”مم..... میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ وہ  
اپنے ہٹ دھرم انداز میں گویا ہوئی، الحان ایک  
قدم اور آگے بڑھا۔  
”اچھا۔“

”خبردار، مجھے چھوٹنے کی کوشش بھی کی تو۔“  
وہ ایک دم چلا اٹھی۔

”سب سے پہلی بات، میرا ایسا کوئی ارادہ  
ہے نہیں اور چلو مان لو، میں نے جہیں چھو بھی لیا،  
تو کون آئے گا اس لفٹ میں، جہیں مجھ سے  
بچانے؟“ وہ اب شرارت پر آمادہ تھا، الحان کے  
اس قدر قریب کھڑے ہونے پر وہ خوف سے  
کپکپاتی، پلوں میں کمی لئے لرزتی آواز سے گویا  
ہوتی۔

”دیکھو الحان! میں تمہارے نائب کی ہا نکل  
نہیں ہوں، پلیز میری جان چھوڑ دو، ہاتھ جوڑتی  
ہوں تمہارے آگے۔“ وہ ہنسی آنکھوں سے اپنے  
دوٹوں ہاتھ جوڑے اس کی نگاہوں میں جھانکنے  
لگی، الحان ایک جھٹکے سے دور جا کھڑا ہوا، اس  
کے چہرے پر آزدگی واضح طور پر عیاں تھی۔

”اتنا گھٹیا انسان سمجھتی ہو تم مجھے، کہ..... کہ  
اکیلی لفٹ میں ایک اکیلی لڑکی دیکھ کر.....“ وہ  
تاسف بھرے انداز میں بولا۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری سوچ  
پر مانو! تم میرے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے  
سکتی ہو؟ اگر مجھے تمہارے ساتھ ایسا دیا کرنے کا  
شوق ہوتا تو اس رات جنگل میں کرگزرتا، وہاں پر  
بھی جہیں مجھ سے بچانے والا کوئی نہیں تھا، تم مجھے  
واقعی اچھی لگی تھیں، تمہاری عزت کرتا رہا میں، اور

ایک دم طیش میں آگیا، آنا فانا غصہ کا اظہار کرتا وہ ہوش کے بین دروازے کی جانب بڑھنے لگا، کبیر چند ٹاپے یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر زیر لب بڑبڑانے لگا۔

”المان بیٹا! تم تو مجھے کام سے۔“ اپنی ہی بات پر مسکراتا وہ کبھی سانس کھینچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

”اتنا گھٹیا انسان سمجھتی ہو تم مجھے؟ نہ..... کہ اکیلی لفٹ میں ایک لڑکی دیکھ کر میں کچھ بھی اف مانی گاؤ۔“ مانہ ہوش کے دم کے عملی خوبصورت آرام دہ بیڈ پر سیدی لیٹی کمرے کی خوبصورت ڈیکوریشن سمیت پر نظریں گاڑھے نچانے کیا تلاش کرنے میں مگن تھی، المان کی آواز مسلسل اس کی سماعت سے ٹکرائے جلی جاری تھی۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری سوچ پر مانو! تم میرے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو؟“

اگلے ہی پل مانہ کرڈٹ لئے، سائینڈ ٹیبل پر رکھے بڑے سے خوبصورت لیپ پر نظریں نکالے آنکھیں جھپکاتے لگی۔

”تم مجھے واقعی اچھی لگی تھیں، تمہاری عزت کرتا رہا میں، اور تم ایک ہی پل میں مجھے میری ہی نظروں میں گرا کر رکھ دیا ہے تم نے۔“ بے چینی کے عالم میں وہ خشک ہوتے کیوں کو زبان سے تر کرتی ایک بار پھر سے سیدی ہو لی۔

”میں آپ کو گھٹیا انسان سمجھتی نہیں ہوں، آپ گھٹیا انسان ہیں۔“ اپنی ہی آواز سماعت سے ٹکرائی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، پریشانی کے عالم میں وہ لب پختی من ہی من میں ہم کلام ہوئی۔

”مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا، سامنے والا انسان کیسا بھی ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اس کی

☆☆☆

”کہاں رہ گیا تھا بھائی تو، تیری ان دو چڑیلوں نے بول بول کر مجھے پاگل کر دیا ہے۔“ کبیر اسے دیکھتے ہی چلانے لگا۔

”میں اب مزید ان دونوں کی کمپنی برداشت نہیں کر سکتا، تیری دونوں چڑیلیں تجھے ہی مبارک ہوں بھائی، میں چلا۔“ کبیر متلاشی ٹکا ہیں ادھر ادھر دوڑاتا بولا، المان نڈ حال قدموں سے چلتا اس کے قریب آیا، المان پر نظر پڑے ہی کبیر اپنے دل کی ہمز اس نکال چکا تو بخور المان کا سرخ ہوتا آتش پاچہ دیکھتا اب وہ مشتبه انداز میں گویا ہوا۔

”تجھے کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں ٹھیک ہے، تجھے تھوڑی دیر ان دونوں کے پاس رکھنے کو کہا تھا، تو اب تک یہاں کیا کر رہا ہے؟“ وہ بمشکل ہارل پوز کرتے ہوئے بولا۔

”تھوڑی دیر؟ اسے میرے بھائی، آپ کی یہ تھوڑی دیر پورے ایک گھنٹے میں بدل چکی ہے اور تیری وہ دونوں ریڈ پوشیشن بول بول کر میرے سر کے بال گرا دیں گی، بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں قسم سے۔“

”ہوں۔“ المان مکمل طور پر منتشر دیکھائی دے رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے نا المان؟“ کبیر کو اب کے فکر ستانے لگی۔

”ہاں، مجھے کیا ہونا ہے، اچھا چل تو مگر جا۔“

”المان!“ کبیر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”کیا بات ہے؟ کچھ ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں یار، پیچھے مت پڑ جایا کر، کچھ نہیں ہوا ہے، سب ٹھیک ہے، ہانگل ٹھیک۔“ وہ

”اچھا! ابھی تم سو رہے ہو؟“

”ہاں..... کیوں؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے

اس کی جانب دیکھنے لگا، بریڈا مسکرا دی۔

”مجھے نیند نہیں آرہی، میں سوچ رہی تھی کہ

کیوں نہ ہم واک کے لئے نیچے جائیں، یا پھر

لاگ ڈرائیو۔“

”رات کے دو بج رہے ہیں بریڈا، ہمیں

صبح واپسی کے لئے جلدی لگنا ہے، اس لئے ایم

سوری، ہم نہ واک پر جاسکتے ہیں نہ ہی لاگ

ڈرائیو پر۔“

”کم آن الحان، یہ ہماری ڈیٹ ہے۔“ وہ

بے ہاکی سے آگے بڑھتی، الحان کے کھلے کر بیان

پر نظر دوڑاتی ایک ادا سے اس کی شرٹ کے بٹنوں

کو چھیننے لگی، الحان نے اسے خود سے دور

کرنے کی غرض سے اس کی دونوں کلاٹیاں تھام

لی تھیں۔

”بریڈا رات بہت ہوگئی ہے، تم اپنے روم

میں واپس جاؤ۔“ اسی پل الحان کی نگاہ بریڈا کے

پچھے ساکت کھڑی مانہ پر جاگئی، وہ آنکھوں میں

بے پناہ حیرت سمونے، سراسیمہ حیران کھڑی پٹی

نگاہوں سے الحان کے کھلے کر بیان اور بریڈا کی

الحان کے ہاتھ میں پکڑی نازک کلاٹیاں گھورتے

چلی جا رہی تھی۔

”مالو! ایک جھٹکے سے بریڈا کی کلاٹیاں

جھٹکتا وہ حواس باختہ مانہ کل جانب دیکھنے لگا،

بریڈا اپلٹ کر مانہ کی جانب دیکھتی، خباثت سے

مسکرا کر رہ گئی۔

اس کا اس وقت سانس لینا عذاب ہو رہا

تھا، پیٹ سے ایک گولہ اٹھتا اس کے حلق میں آن

پھنسا تھا، حقارت بھری نگاہ سے الحان کو دیکھتی وہ

دوڑتی ہوئی واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھتی

چلی گئی۔

ذات پر انگلی اٹھائیں، یا اللہ کیا کروں اب یہ

شرمندگی مجھے سکون کا سانس تک نہیں لینے دے

رہی، کیوں میں غصہ میں اتنی پاگل ہو جاتی

ہوں؟“ وہ خاصی نادم دیکھائی دے رہی تھی، وہ

کچھ سوچنے لگی۔

”ایک کام کرتی ہوں، الحان کو جا کر سوری

بول دیتی ہوں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی

ہوئی، پھر سوچنے لگی۔

”اگر الحان نے میرے سواری کا غلط مطلب

لے لیا تو؟“ وہ پھر سے لب بچھ کر رہ گئی۔

”سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے مجھے اس وقت

صرف اپنے آپ کو دیکھتا ہے، مجھ سے غلطی ہوئی

ہے، سواری بول دوں گی تو سکون میسر ہو جائے

گا۔“ فیصلہ کن انداز میں سوچتی وہ سیلبر پاؤں میں

اڑتی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔

☆☆☆

دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی تھی،

کھوئے کھوئے انداز میں شرٹ کے آدھ کھلے

بٹنوں کو دیکھتا وہ آنکھیں میچ کر رہ گیا۔

غذ حال قدموں سے چلتا وہ دروازے تک

آیا، دروازہ کھولتے ہی ایک شناسا چہرہ اس کی

نگاہوں سے ٹکرایا، تیوری چڑھائے وہ حیران کن

انداز میں گویا ہوا۔

”بریڈا؟“ سامنے بریڈا کھڑی کھلکھلا

رہی تھی۔

”کیا بات ہے الحان! تم ڈنر کے بعد سے

دیکھائی ہی نہیں دیے، مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی،

میں نے سوچا آ کر تم سے ایک بار پوچھ لوں کہ

سب ٹھیک تو ہے؟“ وہ انگلیش میں گویا تھی، الحان

سر ہلا کر رہ گیا۔

”ہاں سب ٹھیک ہے، پوچھنے کے لئے اور

فکر کرنے کے لئے شکریہ۔“

”شٹ۔“ الحان اس ساری صورت حال سے پریشان حواس باختہ کھڑا ماندہ کوپکار کر رہ گیا۔  
”مانو!“

”الحان!“ اس بار برینڈا نے اپنی زبان کھولی، الحان کھا جانے والی لگا ہوں سے اس کی جانب گھورنے لگا۔

”شٹ اپ..... اینڈ کو بیک ٹو یور روم۔“  
”ہٹ؟“ وہ ڈھٹ بنی کھڑی رہی۔

”آئی سیڈ کو بیک ٹو یور روم۔“ کس قدر برفیلہ لہجہ تھا اس کا، برینڈا اس کی آکس پانگاہوں اور برفیلے لہجے سے خوفزدہ ہوئی، اگلے قدموں اپنے روم کی جانب دوڑنے لگی، الحان وہیں دروازے کے چنچ کھڑا ضبط کے عالم میں اپنا سر تھام کر رہ گیا۔

☆☆☆

”میں ہی بے وقوف تھی، جو منہ اٹھا کر سوری بولنے چلی گئی۔“ ماندہ بند دروازے سے ٹیک لگائے آنسو بہائے چلی جا رہی تھی۔

”یا اللہ! میں رو کیوں رہی ہوں؟ مجھے ان سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ الحان کسی کے ساتھ رہے۔“ وہ بے دردی سے اپنے گال رگڑنے لگی، اسی ٹاپے دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی الحان کی آواز بھی سنائی دی۔

”مانو! پلیز دروازہ کھولو، مجھے میری صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دو پلیز۔“ وہ دروازے سے باہر کھڑا التجاء کر رہا تھا۔

”مانو پلیز میری بات سن لو ایک بار۔“

”الحان! چلے جاؤ یہاں سے، میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی، جسٹ گو۔“ وہ گال رگڑتی غصہ میں پھنکاری۔

”مانو پلیز! ایک بار موقع دے دو، پلیز میری بات سن لو۔“ ماندہ لہجے لہجے سانس کھینچ کر خود

کو نائل کرتی جھٹکے سے دروازہ کھولتی سپاٹ چہرے سے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”جھپٹیں مجھے کچھ بھی ایکسیلین کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں، کیونکہ مجھے تمہاری کسی قسم کی کسی بھی ایکٹیوٹی سے کوئی لینا دینا نہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں گویا تھی، الحان خاصا نام دیکھائی دے رہا تھا۔

”مانو! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، جیسا تم سوچ رہی ہو۔“

”میں کچھ بھی نہیں سوچ رہی الحان ابراہیم، سو جسٹ ریلیکس اور جا کر سو جاؤ۔“

”مانو پلیز! ایک بار مجھ پر فرسٹ کر کے دیکھو، پلیز۔“

”فرسٹ! اور وہ بھی تم پر۔“ وہ ایک دم قہقہہ لگانے لگی۔

”تم اس قابل نہیں الحان کہ میں تم پر فرسٹ کر سکوں۔“

”مانو! میں کیسے یقین دلاؤں تم کو، کہ میں بے قصور ہوں، تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، برینڈا واک پر جانا.....“

”مجھے کچھ نہیں سننا الحان۔“ وہ اس کی بات کاٹی سپاٹ لہجے میں بولی۔

”مانو! میں بہت ہرٹ ہو رہا ہوں۔“

”یو نو واٹ الحان، دماغ میرا خراب تھا جو میں تمہیں سوری بولنے کے لئے چلی آئی، لیکن اچھا ہی ہوا، مجھے سب کلیئر ہو گیا کہ میں تمہارے بارے میں بالکل ٹھیک سوچتی تھی، تم واقعی ایک گھٹیا ترین انسان ہو۔“ ماندہ کی آواز میں لرزش واضح طور پر عیاں تھی، وہ نم لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھتی پٹاخ سے دروازہ بند کرتی، تیزی سے اپنے بیڈ پر آ لیٹی، الحان کافی دیر بند دروازے کے سامنے کھڑا اندر ہی اندر گھلتا رہا،



اس کی نگاہوں میں فکری واضح طور پر عیاں تھی۔  
 ”کیوں ہو رہا ہے یہ سب کچھ میرے  
 ساتھ؟ کیوں سب کچھ اس قدر اچھوٹا ہوتا چلا جا  
 رہا ہے، کیوں؟“ من ہی من میں الجھتا وہ شکستہ  
 نگاہوں سے بند دروازے کی جانب دیکھتا لمبی  
 سانس بچھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

محبت اشتہائے نفس اور تسکین وجود کا نام  
 نہیں، اہل ہوس کی سائیکی اور بے اور اہل دل کا  
 انداز فکر اور محبت دور وحوں کی نہ ختم ہونے والی  
 باہمی پرواز ہے۔

بہت پہلے کہیں پڑھا تھا کہ محبت کوشش یا  
 محنت سے حاصل نہیں ہوتی، یہ عطا ہے، یہ نصیب  
 ہے، بلکہ یہ بڑے ہی نصیب کی بات ہے، زمین  
 کے سفر میں اگر کوئی چیز آسانی ہے تو وہ محبت ہی  
 ہے، محبت کی تعریف بے حد مشکل ہے، اس پر  
 کتب میں لکھی گئیں، افسانے رقم ہوئے، شعراء نے  
 محبت کے قصیدے لکھے، مرچے لکھے، محبت کی  
 کیفیات کا ذکر ہوا، وضاحتیں ہوئیں، لیکن محبت کی  
 جامع تعریف نہ ہو سکی، واقعہ کچھ اور ہے، روایت  
 کچھ اور بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک چہرہ جب  
 انسان کی نظر میں آتا ہے تو اس کا انداز بدل جاتا  
 ہے، کائنات بدلی بدلی سی لگتی ہے، بلکہ ظاہر و  
 باطن کا جہاں ہی بدل جاتا ہے۔

محبت سے آشا ہونے والا انسان، ہر طرف  
 حسن ہی حسن دیکھتا ہے، اس کی زندگی نثر سے  
 نکل کر شعر میں داخل ہو جاتی ہے، اندیشہ ہائے  
 سود و زیاں سے نکل کر جلوہ جاناں میں گم ہو جاتا  
 ہے، اس کی تنہائی میں میلے ہوتے ہیں، وہ ہنستا  
 ہے بے سبب، روتا ہے بے جواز، محبت کی  
 کائنات جلوہ محبوب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔  
 محبت وحدت سے کثرت اور کثرت سے

وحدت کا سفر طے کراتی ہے، محبت آسمانوں کی  
 بے کراں وسعتوں کو ایک جست میں طے کر سکتی  
 ہے، محبت قطرے کو قلمزم آشنا کر دیتی ہے، محبت  
 زمین پر پاؤں رکھے تو آسمانوں سے آہٹ سنائی  
 دیتی ہے، محبت کرنے والے کسی اور ہی مٹی سے  
 بنے ہوتے ہیں، یہ خلوص کے بیکر دنیا میں رہ کر  
 بھی دنیا سے الگ ہوتے ہیں، دراصل محبت  
 زندگی اور کائنات کی انوکھی تشریح ہے۔

محبت کرنے والا اپنی ہستی کے نئے معنی  
 تلاش کرتا ہے، وہ باطنی سفر پر گامزن ہوتا ہے،  
 زندگی کے پتے ہوئے ریزار میں محبت کو با ایک  
 نخلستان سے گم نہیں، محبت کے سامنے ناممکن و  
 محال کچھ بھی نہیں، محبت پھیلے تو پوری کائنات اور  
 سمٹے تو ایک قطرہ خوں، درحقیقت محبت آرزوئے  
 قرب حسن کا نام ہے، ہم ہمہ وقت جس کے  
 قریب رہنا چاہتے ہیں، وہی محبوب ہے، محبوب  
 ہر حال میں حسین ہوتا ہے کیونکہ حسن تو دیکھنے  
 والے کا اپنا انداز نظر ہے، ہم جس ذات کی بقاء  
 کے لئے اپنی ذات کی فنا تک بھی گوارا کرتے  
 ہیں، وہی محبوب ہے، محبت کو محبوب میں کجی یا  
 خاص نظر نہیں آتی، اگر نظر آئے بھی تو محسوس نہیں  
 ہوتی، محسوس ہو بھی تو ناگوار نہیں گزرتی، محبوب کی  
 ہے، محبت کرنے والے جدائی کے علاوہ کسی اور  
 قیامت کے قائل نہیں ہوتے۔

ہر انسان کے ساتھ محبت ایک الگ تاثر  
 رکھتی ہے، دو انسانوں کی محبت کبھی بھی یکساں نہیں  
 ہوتی، اس لئے محبت کا بیان مشکل ہے، دراصل  
 محبت ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنی اصل  
 شکل باطنی شکل، حقیقی شکل دیکھتا ہے، محبت ہی  
 قدرت کا سب سے بڑا کرشمہ ہے، محبت ہی کے  
 ذریعہ انسان پر زندگی کے معنی منکشف ہوتے  
 ہیں، کائنات کا حسن اسی آئینے میں نظر آتا ہے۔

تمام لیڈز کی جانب متوجہ دیکھا دے رہا تھا، وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔  
 ”کاش کے المان اس بار مجھے ایلیمینٹ کر دے، تاکہ میری ان تمام الجھنوں سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ جائے۔“ وہ من ہی من میں ہم کلام ہوئی۔

”المان! آرپورٹی؟“

پھولوں کی ٹیکل المان کے سامنے آتے ہی خرم نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پوچھا، المان اثبات میں سر ہلاتا، ایک گلاب ہاتھ میں اٹھائے گہری سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ہائے!“ اہنا نام ساعت سے ٹکراتے ہی لمبی سانس کھینچتی، چلتے ہوئے المان کے سامنے جا کھڑی ہوئی، المان نے اس بار بھی اس کی جانب نہ دیکھا، تمام لیڈز پر نظریں جمائے وہ گلاب مانہ کی جانب بڑھائے کھڑا تھا، مانہ گلاب تھا سستی، جلدی سے چلتی دوسری سائیز پر کھڑی مس فاطمہ کے نزدیک جا کھڑی ہوئی، اک ٹیس سی اٹھی تھی اس کے دل میں، گلاب کی ٹہنی دبوتی وہ آنکھیں بند کر کے کھڑی تھی۔

”آٹھ!“ اگلا نام آٹھلے کا پکارا گیا، پھر مکان، حانہ، تائبہ، آماندہ، صلیبہ اور پھر جینی، تمام سلیکٹ کی جانے والی لیڈز ایک الگ قطار بنا کھڑی ہوئیں، نیہا اور برینڈا دھواں دار چہرہ لئے سر جھکائے کھڑی رہیں، آٹھلے ان دونوں کے ایلیمینٹ ہو جانے پر کافی افسردہ دیکھا دے رہی تھی، سحر کے بعد یہ دونوں اس کی بیسٹ فرینڈز اور بائرنٹران کرائم بن چکی تھیں، لیکن المان نے ایک لمحے میں اس گروپ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”نیہا اینڈ برینڈا آپ دونوں کا سفر ہمیں پر ختم ہوا چاہتا ہے، آئی ایم سوری۔“ خرم نیہا اور برینڈا سے سوری کہتا اب کے بانی تمام سلیکٹ

المان پورا ہفتہ اذیت کا شکار رہا، بظاہر وہ سب کے سامنے نارل لی ہو کر تھا لیکن کمرے میں آتے ہی سوچ سوچ کر اس کا ذہن پھنسنے والا ہوتا، عذرات، اشتیاق، خواہش اور اداسی، الگ الگ جذبات ایک ساتھ اس کے اندر رش کرتے محسوس ہوتے، وہ خود کی اپنی حالت سمجھنے سے قاصر تھا، وہ اس کے قریب جانا چاہتا تھا، اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اسے تنگ کرنا چاہتا تھا، پر وہ ایسا کر نہیں پار پاتا۔

آج رات ایلیمینٹیشن کی رات تھی، بلاوا ملنے ہی وہ اپنے کیمپن سے لکھنا چوب محل کے لاؤنج میں چلا آیا جہاں سب لوگ اسی کے منتظر دیکھا دے رہے تھے، عاشر ہمیشہ کی طرح کیمراز کے پیچھے سکرین کے سامنے معروف دیکھا دیا تھا، تمام لیڈز ایک سائیز پر قطار بنائے کھڑے افسردہ دیکھا دی تھیں، المان سب پر ایک اجنبی سی نگاہ دوڑاتا، خرم کے برابر میں جا کھڑا ہوا۔

”لیڈز! ہمارے اس شو کی تیسرے ایلیمینٹیشن کی کھڑیاں آن پہنچی تھیں۔“ خرم مہذب لہجے میں گویا ہوا۔

”آج رات جو لیڈز ایلیمینٹ ہوگی وہ کل صبح ناشتہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کے لئے روانہ کر دی جائیں گی اور باقی سلیکٹ کی جانے والی تمام اٹھ لیڈز کو المان کی من پسند جگہ پر جانے کا موقع فراہم کیا جائے گا اور وہ جگہ کوئی ہے، یہ آپ تمام لیڈز کے لئے ایک سرپرائز ہے۔“

جوش اور خوشی کی لہر ایک ساتھ تمام لیڈز کے چہروں پر دوڑنی دیکھا دی تھی، سوائے مانہ کے، جو تھوڑا سا نظر اٹھا کر المان کی جانب دیکھ رہی تھی جبکہ المان اسے مکمل طور پر انکور کیے بانی

طرف سے مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے گہری دھند میں چمکتی ہوئی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ان کو اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دے رہے تھے، ان نزدیکی کھیتوں سے بھی پرے ایک بہت بڑا جمیل نما جوڑ تھا، جس کے کنارے فضا میں اڑتے ہوئے اچلے اچلے گئے اور دوسرے ننھے ننھے پرندے شور کر رہے تھے۔

Well come to the ranch!  
شاداں دیکھائی دے رہا تھا۔

”پرکٹ!“ سبھی لیڈیز نے مسکراتے ہوئے ایک ساتھ جواب دیا۔  
”او کے آپ سبھی لیڈیز جا کر اپنا اپنا روم سلیکٹ کر لیجئے اور مجھے کی بات یہ ہے کہ آپ س کو یہاں پر الگ الگ روم دیا جا رہا ہے، سو پی؟“

وہ دونوں ہاتھ ہوا کے زور پر اٹھائے شیریں لہجہ میں بولا، جواباً سبھی لڑکیاں خوشی کا اظہار کرتیں اپنا اپنا بیگ سنبھالتیں باڑا کے چوب محل کی جانب قدم بڑھانے لگیں، مس فاطمہ نے سبھی لڑکیوں کو ان کے کمروں تک رسائی ممکن قرار دی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ کے وقفہ کے بعد تمام لڑکیوں کو اس نئے چوب محل کے لاونچ میں اکٹھا ہونے کا حکم صادر ہوا، حکم صادر ہوتے ہی تمام لاونچ میں اکٹھی ہو بیٹھیں، المان اسی پہلے مین دروازہ سے اندر داخل ہوا تھا۔

”گڈ ایوننگ لیڈیز!“ سبھی لیڈیز ایک ساتھ المان کی جانب توجہ ہوئی تھیں، وہ دروازہ کے پاس کھڑا شیریں لہجہ میں مخاطب تھا۔  
”آج آپ میں سے کوئی ایک لیڈی میرے ساتھ ڈیٹ پر چلنے والی ہے۔“

کی جانے والی لیڈیز کی جانب مڑا۔  
”آپ تمام لیڈیز بھی اپنا اپنا سامان پیک کر لیجئے کیونکہ کل رات پہلی فرصت میں ہمیں اس آئس لینڈ سے نکلنا ہے، کہاں..... یہ ایک سکرٹ ہے، ہے ناں المان؟“ وہ شریر مسکراہٹ لہوں پر سجائے المان کی جانب دیکھنے لگا، جواباً المان اپنی مخصوص مسکراہٹ لئے سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

پہلے یاٹ بھر المان کے پرائیوٹ طیارے اور پھر وین کے لیے سفر کے بعد وہ لوگ دوپہر تقریباً تین بجے کے نام Ranch میں پہنچ گئے، موسم ہمیشہ کی طرح آج بھی خوشگوار تھا، زمین کی ابھری ڈھلکتی سرسبز و شاداب سطح پر سکون دیکھائی دے رہی تھی، آئس لینڈ کی طرح یہاں پر بھی ایک چوب محل موجود تھا، جس کے ارد گرد کھلے درخت موجود تھے جو اپنا سایہ چوب محل پر کیے صاف دیکھائی دے رہے تھے، چوب محل سے خاصے فاصلے پر فگہ گوڈام اور اصطبل بھی موجود دیکھائی دیئے تھے، کچھ نوجوان (CowBoy) بوس اور ہیٹ میں لمبوس پہلے سے وہاں موجود اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، المان نے وہاں پہنچتے ہی ایک لمبی گہری سانس چینی تھی، وہ اس وقت بہت پر سکون اور خوش دیکھائی دے رہا تھا، (Crew) اپنے کام کی دیکھ بھال کرنے لگا تھا، عاشر Crew کے لوگوں کے سر پر کھڑا تمام کام کی دیکھ بھال کرنے لگا تھا، پانی تمام لیڈیز بڑی دہشتی سے باڑا کا نظارہ کرنی دیکھائی دی تھیں، دور درختوں کے ایک جھنڈ میں پرندوں کے پھڑ پھڑانے کا شور صاف سنائی دیتا تھا اور اس جھنڈ سے پرے درختوں کی میز میز قطاریں بڑھتی ہوئی آفت میں کھڑی تھیں، ارد گرد کے کھیتوں میں کھڑی فصل سوری تھی، دور شمال کی

کر پار ہی ہوں۔“

تقریباً آدھا گھنٹہ کے ٹرائی اور کلاس کے بعد وہ گھوڑا پر بیٹھی اسے کسی کی مدد کے بغیر آہستہ آہستہ چلائے ہوئے ہینڈل کیے ہوئے تھی، وہ خاصی خوش دیکھائی دے رہی تھی، الحان ایک الگ گھوڑے پر سوار اس کے برابر میں چل رہا تھا۔

”کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہوتی ہے، بس تمھوڑی سی لگن اور محنت..... باقی کام اپنے آپ آسان ہو جاتا ہے۔“ وہ اپنے کھوڑے کو سنبھالتا اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا تھا۔  
”ہوں۔“ مکان سر ہلا کر رہ گئی۔

”ہوں۔“ مسکان سر ہلا کر رہ گئی۔

”سو؟“ الحان نے اپنا گلہ کھنکرا، وہ شاید

کچھ پوچھنے کو بے چین تھا۔

”اس دن کے سانحہ کے بعد سے تمام  
لوگوں کا رویہ ایکشن کیسا تھا؟“

”تم بریڈا کے الزام کی بات کر رہے ہو؟“ وہ سواری کرتے دوران الحان کی جانب دیکھنے لگی۔

”نہیں!“ وہ مختصر بولا۔

”کچھ خاص نہیں..... سب لڑکیاں نارمل ہو

گفتیں۔“

”اور مانے؟“

”مانہ کیا؟“ مسکان تیوری چڑھائے اس کی دیکھنے لگی۔

”مانہ کے معصنف ہونے کی خبر سب کو ہو چکی ہے، وہ اس سب کو کیسے فیس کر رہی ہے، میرا مطلب اسی برا بلہم؟“

”مجھے نہیں معلوم، وہ لڑکی تو بات تک نہیں کرتی، اپنا زیادہ وقت اس عجیب سے درخت کے سائے تلے بیٹھ کر گزار دیتی ہے، وہ بہت ہراسر اور عجیب ٹائپ کی لڑکی ہے۔“ مسکان کے لہجے

خبر ملے ہی خوشی کی ایک لہر تمام چہروں پر دوڑتی دیکھائی دی، مانہ اس کی موجودگی سے انجان کیراز کے پیچھے ہوتی حرکات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

”اور اس ایک لیڈی کا نام ہے، مسکان!“

نام پکارتے ہی وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ لہوں پر  
سجائے کھڑا ہوا جبکہ مکان اپنا نام سننے ہی خوشی  
سے اچھل پڑی، اس کے اچھلنے اور چیخنے پر مانہ  
ایکایک چوبک اٹھی، مکان خامی ایکسائیڈ  
دیکھائی دے رہی تھی، وہ لمبی سانس کھینچ کر رہ  
گئی۔

”کیسے، پورا سنڈ؟“ وہ بوجھ رہا تھا۔

”نہا“ وہ منہ بسورتے ہوئے بولی، الحان

مکرا دما۔

جاؤ۔“ الحان اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

نفر پر آدھا گھنٹہ کی تیاری کے بعد مکان خوش خوشی الحان کے ساتھ ڈیسٹ کے لئے روانہ ہو گئی، ہائی تمام لیڈرز مکان کے الحان کے ساتھ جانے پر زیادہ خوش دیکھائی نہ دے رہی تھیں، سبھی ایک ساتھ بیٹھی نجانے کہاں کہاں کی داستان ایک دو جے کی گوش گزار کرنے لگی تھیں، مانہ ان سب پر نگاہ دوڑاتی جب محل سے باہر نکل آئی، وہ یہاں بھی ایک درخت کی مٹلائی تھی، جس کے سائے تلے بیٹھ کر وہ کچھ تنہا اور پرسکون وقت گزارنے کی خواہش مند تھی، لیکن باہر ٹھٹکتے ہی ایک بار پھر سے Ranch کا خوبصورت نظارہ دیکھتی اسے ذہن نشین کرتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

”مجھے یقین نہیں آ رہا الحان کہ میں واقعی یہ

کنٹرول کیے، مصنوعی مسکراہٹ لیوں پر سہا کر بولا۔

”میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں بھی الحان!“ اس نے ایک آہ بھری اور پھر بولی۔  
 ”اس کی یہاں کوئی دوست نہیں تھی، ابھی اسے حقارت بھری لگا ہوں سے دیکھتی تھیں، مجھے اس کے لئے اچھا نہیں لگتا تھا، اس لئے میں نے سوچا کہ چلو بات چیت کر لی جائے تاکہ وہ خود کو تنہا محسوس نہیں کرے، دیکھو الحان! شاید تمہیں یہ سن کر اچھا نہ لگے، لیکن تم نے میری رائے مان لی ہے اور تم سچ جانتا چاہتے ہو، اسی لئے بتا رہی ہوں، مجھے یقیناً ایسا لگتا ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مانہ واقعی تمہاری توجہ چاہتی ہے، اس نے خود کو خاموش اور ہم سے الگ بیہوش کر کے تمہیں بے وقوف بنایا ہے، وہ صرف تمہاری توجہ حاصل کرنا چاہتی ہے کس!“ الحان نے آنکھیں سے اپنا سر ہلایا، اس نے خود پر کنٹرول رکھا، وہ بی الحال کچھ بولنا یا کرنا ہرگز نہ چاہتا تھا۔  
 ”اچھا..... تعجب ہوا سن کر، کہ اس نے یہ سب میری توجہ حاصل کرنے کے لئے کیا.....“ وہ بمشکل بول پایا۔

”اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسئلہ ضرور ہے الحان، ورنہ کوئی بھی نارمل لڑکی اس طرح سے بیہوش ہرگز نہیں کرتی جس طرح سے مانہ بیہوش کرتی ہے، میں سمجھ نہیں پا رہی اس لڑکی کو۔“ وہ متناہب سے بولتی مسکرا دی، الحان کو اس ہل وہ مسکرائی ہوئی زہر لگ رہی تھی۔

”آئی تھنک ہمیں اب واپس چلنا چاہیے، شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔“ الحان نے مہارت سے بات بدل دی، وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل کر چوب محل واپس جانا چاہتا تھا، اسے لگا تھا کہ شاید وہ مانہ کی دوست کے ساتھ رائیڈ یک پر آیا

میں کچھ الگ ساتھ، کچھ روکھا روکھا، اکٹایا ہوا سا، الحان کو اس کا لہجہ بہت عجیب لگا، جیسی وہ براہ راست گردن گھما کر اس کی جانب دیکھنے لگا، وہ اس کا لہجہ سمجھ نہیں پاتا تھا، مزید اسے اگوانے کے لئے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے لگا۔

”ہاں عجیب تو وہ ہے، میں جانتا ہوں۔“  
 ”میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے اپنی فرینڈ کنسڈر کرتی ہے، لیکن..... وہ..... واقعی بہت عجیب ہے۔“ مکان نے اپنے شوڈر اچکائے۔  
 ”میں سمجھا تھا کہ شاید تم دونوں بہت کلوز ہو ایک دوسرے کے۔“ وہ سادگی سے پوچھنے لگا۔  
 ”ہاں.....“ وہ تھوڑی چڑھانے لگی۔  
 ”سوری الحان تم شاید مجھے غلط سمجھ رہے ہو یا بیڈ؟“

”نہیں..... اس اوکے، میں تمہاری رائے کی عزت کرتا ہوں اور میں تمام لیڈز کے بارے میں تمہاری رائے جانتا چاہتا ہوں۔“ وہ مصنوعی مسکرایا، وہ اس لڑکی کی باتوں کے ذریعے اسے جانتا چاہتا تھا اور شاید وہ جان چکا تھا۔  
 مکان نے اپنے سائیکس تراشیدہ بالوں کو ہلکے سے جھٹکا دیا اور ہال ہوا میں لہراتے اس کے شوڈر کے پیچھے جا کرے۔

”خیر! میں تمام لیڈز کے بارے میں کچھ خاص رائے بیان نہیں کر سکتی، کیونکہ ابھی لیڈز مانہ کی وجہ سے مجھ سے بھی بدظن رہتی ہیں، مانہ نے سب کے سامنے بھی شو کیا ہے کہ ہم دونوں بیسٹ فرینڈز اور ایک دوسرے کے بہت کلوز ہیں، جبکہ ہم دونوں تو زیادہ بات تک نہیں کرتی ہیں۔“ وہ اپنے ترمک میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

”میں واقعی یہی سمجھتا رہا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بہت کلوز ہو۔“ الحان کے چہرے کے ہر نقش پر غصہ نمودار تھا، لیکن وہ بمشکل خود پر

منتشر لہجے میں گویا ہوا، عاشر سر ہلا کر رہ گیا، الحان جلدی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا فیم سمیت جنوب کی جانب بڑھنے لگا۔  
 ”یہ لڑکیاں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں، بلک جھکتے ہی کم ہو جاتی ہیں۔“ ہادلوں کی گھن گرج کے ساتھ ہی پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ برتنے لگیں۔

”سربارش کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے، مجھے لگتا ہے کہ ہمیں الگ الگ راستے پر جا کر ان میڈم کو ڈھونڈنا چاہیے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ میڈم اس بارش سے بچنے کے لئے راستے میں موجود کیمپوں میں سے کسی ایک کیمپ میں لازمی پناہ لے کھڑی ہوئی ہوگی۔“

الحان کی دائیں جانب والے ساتھی نے ہوا کی تیز رفتار اور بارش کے شور کا سینہ چیرتے ہوئے اونچی آواز میں چیخ کر کہا۔

الحان سر ہلاتے ہوئے دور نظر آتے کیمپوں کی جانب دیکھنے لگا، Ranch میں جگہ جگہ پر بہت سے کیمپوں موجود تھے، جو کہ خاص اسی موسم کے لئے بنائے گئے تھے، یہاں کا موسم ایسا ہی تھا، اچانک خراب ہو جایا کرتا تھا اور پھر یہ موسلا دھار مینہ گھنٹوں جاری رہا کرتا تھا اور اگر کوئی اچانک اس موسم کا شکار ہو جایا کرتا، تو وہ راستے میں بے کسی نزدیکی کیمپ میں پناہ لے لیا کرتا، خشک ہوا زور و شور سے آگے بڑھی الحان کے چہرے سے کھرائے چلی جا رہی تھی۔

”او کے اتم سب لوگ اپنی اپنی راہ لو، میں سامنے سے جاؤں گا اور ہاں، اگر طوفان حرید بڑھ جائے تو ہم لوگ کیمپوں میں چلے جانا اور طوفان رکنے تک وہیں پر رہنا، حرید کسی قسم کے نقصان کی گنجائش ہرگز نہیں رکھتا۔“ سب لوگ اثبات میں سر ہلاتے الگ الگ راستے پر چل نکلے، الحان

ہے لیکن وہ غلط تھا، وہ اس کی دوست نہیں بلکہ چوب محل میں موجود باقی تمام لیڈز میں سے ایک تھی، جو دوستی کا لبادہ پہنے اسے ڈس لینے کو تیار تھی، الحان جلد سے جلد مانہ تک پہنچا چاہتا تھا، اسے مسکان کی اصلیت کے بارے میں بتانا چاہتا تھا، گھوڑے اب تقریباً دوڑتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

☆☆☆

”کیا مطلب کہ مانوسنگ ہے؟“  
 الحان کے واپس آتے ہی عاشر نے اس کے سر پر بم بلاسٹ کیا، عاشر بے حد پریشان دیکھا کی دے رہا تھا۔  
 ”یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے اسے جنوب کی طرف جاتے دیکھا تھا، ان سب نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملی؟“

الحان اپنا سر تمام کر رہ گیا، اس نے سراٹھا کر وسیع آسمان پر نگاہ دوڑائی، موسلا دھار طوفان اپنی آمد کا سندیس بڑی تیزی سے لئے چلا آ رہا تھا، اس نے جلدی سے وہاں پر موجود اپنے تمام نوجوانوں کا ایک بار پھر سے اکٹھا کیا اور ایک فیم بنا کر مانہ کو ڈھونڈنے کا ارادہ کیا، سبھی لوگ اپنے اپنے گھوڑے سنبھالے مانہ کو ڈھونڈنے کے لئے تیار ہو کھڑے ہوئے۔

”میں کرپو کے کچھ لوگوں کو تمہارے ساتھ بھیج دوں؟“ عاشر نے آفر دی۔

”نہیں عاشر، یہ لوگ یہاں کی جگہوں سے واقف ہیں، کرپو کی ضرورت نہیں اور اس بگڑتے موسم میں تو ریڈیو بھی کام نہیں کرنے والے، بس تم میرے اور ان تمام لوگوں کے واپس آنے تک کسی کو باہر نہیں نکلنے دینا، میں حرید کسی کے کھو جانے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ الحان

کیبٹ بھی موجود تھا، وہ جلدی سے چلتی فائر پیس کے پاس گئی، اس پر رکھی ماچس اٹھاتے ہی وہ سردی سے ٹھہرتے ہاتھوں سے ماچس جلانے کی ناکام کوشش کرنے لگی، سردی اس قدر تھی کہ اس کے ہاتھ حرکت میں ہی نہ آ رہے تھے، وہ کیبٹ میں جھانکنے لگی، کیبٹ میں بہت سے مکمل ایک ساتھ رکھے دیکھائی دیئے، وہ جلدی سے آگے بڑھی، مکمل اٹھاتے ہی وہ خود کو لپٹنے کو تیار تھی کہ یکایک بارش اور ہوا کے زور و شور کے ساتھ دروازہ پورا پورا کھلا، لکڑی کی دیوار سے جا ٹکرایا، اس اچانک کی افتادہ پر وہ خوف کے مارے چیخ اٹھی، اک لمحے کو اس کا سانس رکتا محسوس ہوا، دل کی دھڑکنیں ایف سولہ کی سی تیزی سے دوڑتی محسوس ہوئیں، وہ ہنسی لگا ہوں سے بنا پلکیں جھپکائے دروازے کی جانب دیکھے چلی گئی، اسے لگا کہ شاید یہ اس کی آنکھوں کا دھوکہ ہے، اس کے لب کپکپانے لگے۔

”المان!“ اس کی آواز دور اندر سے کہیں ابھری تھی۔

المان! سر سے پاؤں تک سرخ، بے تاب ٹکاہیں مانہ پر نکالے لمبی لمبی سانس سچ رہا تھا، اس کے چہرے اور سر سے ٹپکتا پانی اس کے ہچکے کپڑوں میں جذب ہوتا چلا جا رہا تھا۔

”مالو!“ اس نے سرکشی میں اس کا نام پکارا، دروازہ بند کرتا وہ تیزی سے چلا اس کے قریب چلا آیا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، کہ تم بالکل ٹھیک ہو، میں بہت ڈر گیا تھا مالو! کہ کہیں تم.....“ وہ لمبی لمبی سانس کھینچتا اپنا سانس بحال کرنے لگا۔

”کیا فضول حرکت ہے یہ؟ کیا ضرورت تھی تمہیں اتنا دور چلے آنے کی؟“ اس کے ٹھکانہ انداز پر مانہ سر جھکائے دیر ج سے گویا ہوئی۔

نے اپنا گھوڑا سانس کی اور دوڑانا شروع کیا۔

پادلوں کی گھن گرج، ہوا کی سائیں سائیں، بارش کی آوازیں المان کو مزید بے چین کیے دے رہی تھیں، المان کا سفید گھوڑا اپنی اگلی ٹانگوں کو فضا میں نیم دائرہ بنا رہا تھا اور اس قابلیت پر داد کا خواہاں تھا، بارش کے فرش پر گھوڑے کی پر یقین پاپوں، بارش کے پانی میں پڑتے ہی ایک الگ قسم کی موسیقی پیدا کیے دے رہی تھی، موسلا دھار طوفانی بارش کی بنا پر اب المان کو سامنے کچھ بھی دیکھائی نہ دے رہا تھا، سردی سے ٹھہرتا وہ اپنی آنکھوں سے بارش کی برسات صاف کرتا زیر لب بڑبڑانے لگا۔

”آئی ہوپ کہ وہ ٹھیک ہو، آئی ہوپ کہ اس نے کسی کہین میں پناہ لے لی ہو۔“ پریشانی چہرے پر سجائے وہ ایک بار پھر اسے اپنے گھوڑے کو ایڑہ لگاتا دیر سے دیر سے آگے کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

”یا اللہ! کہاں پھنس گئی میں؟“

فل بارش میں بیٹھی وہ سردی سے ٹھہرتی کہین کی لکڑی سے باہر جھانکنے لگی، تیز ہوا اور طوفانی بارش اس قدر تھی کہ اسے کچھ دیکھائی نہ دیا، اسی بل ایک درخت کی ٹہنی تیز ہوا سے اڑتی اس کی ٹھکڑی سے آن ٹکرائی، مانہ خوف سے چپٹی فرش پر جا گری، اس کی بازوؤں پر گہری چوٹ آئی تھی، درد سے کراہتی وہ سی سی کرنی ایک بار پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی، چشمہ اتار کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، پاس ہی کرسی پر اسے ایک ٹاول پڑا دیکھائی دیا، جلدی سے ٹاول سے چشمہ آنکھوں پر لگا کھڑی ہوئی، اس نے پھر سے ارد گرد نگاہ دوڑائی، پاس ہی ایک چھوٹا سا فائر پیس دیکھائی دیا، بیڑ کے ساتھ ایک چھوٹا سا

”المان!“ اس بار اس نے تھوڑی ادھی آواز میں اسے پکارا۔

”مانہ! تم اندر جا کر چیخ کر لو، یہاں کا موسم ایسے ہی اچانک خراب ہو جاتا ہے، اسی لئے ہم نے یہاں کے تمام کنبھو میں ضرورت کی ہر چیز مہیا رکھی ہے، کہ کبھی کوئی اچانک اس طوفان میں پھنس جائے تو اسے زیادہ پرالیم نہیں ہو۔“ وہ اس کی پکار ان سنی کرتا اپنے ہی ترنگ میں بولے چلا جا رہا تھا۔

”مانہ؟ یعنی یہ ابھی بھی مجھ سے خفا ہے، اس نے اکیلے میں کبھی بھی مانہ کہہ کر نہیں پکارا۔“ وہ من ہی من میں بولتی ایک بار پھر سے اس کی جانب دیکھتی اسے مخاطب کرنے لگی۔

”المان میں.....“

”ہمیں آگ جلا لینی چاہیے۔“ وہ اس کی بات کا ٹٹا اپنے آپ کو میرف ظاہر کرنے لگا۔

”تم اندر جا کر چیخ کر لو، اور ان کپڑوں کو دھیں پر ٹانگ دو، سوکھ جائیں گے تو واپس نیچا پہن لیتا۔“

ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کی آنکھیں بھگ بھگ سی گئیں، وہ اسے بھرے گنور کر رہا تھا، حلق میں اٹکا گولہ اسے مسلسل اذیت دینے چلا جا رہا تھا، اس کی ناک سردی سے سرخ ٹٹاڑ ہو چلی تھی، وہ دھیرے دھیرے چلتی کینٹ کے پاس چلی آئی، وہاں ایک ٹوکری رکھی تھی، مانہ نے کانپتے کمزور ہاتھوں سے وہ ٹوکری اپنی جانب کھینچی، ٹوکری میں بہت سے کپڑے رکھے دیکھائی دینے مگر وہ سب کے سب مردانہ کپڑے تھے، اس نے اس پل ان کپڑوں کو بھی مال غنیمت سمجھا، وہ ایک جوڑا اٹھائی اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی، المان پلٹ کر بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ موسم اچانک سے خراب ہو جائے گا۔“

”تم اتنی دور آئی ہی کیوں؟“

”مجھے نہیں پتا چلا، میں چلتے چلتے اتنی دور نکل آئی، میں واپسی کے لئے مڑی ہی تھی کہ موسم اچانک سے خراب ہو گیا، اس سے پہلے کہ میں واپس پہنچتی، اتنی تیز بارش شروع ہو گئی، یہ تو شکر ہے کہ یہ کینن یہاں پر موجود تھا۔“

”جی ہاں، شکر ہے کہ یہ کینن موجود تھا، ورنہ آج آپ کئی تھیں، اوپر اللہ تعالیٰ کے پاس۔“

المان کے کنبے پر وہ شرمندہ ہوئی، نادم انداز میں وہ اپنا سر جھکا کھڑی تھی، اس نے دیکھا کہ المان دو قدم پیچھے ہٹا تھا، وہ متلاشی نگاہوں سے کیننٹ میں جھانکنا دیکھائی دیا۔

”یہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک چلا آیا، یعنی اسے ابھی بھی میری پرواہ ہے۔“ اس کی جانب دیکھتی وہ دل ہی دل میں ہم کلام ہوئی۔

”نہیں..... یہ اس کا ایریا ہے اور یہاں پر ہم سب اس کی ذمہ داری ہیں، اگر یہاں کچھ ہو جائے کسی کے ساتھ تو اس کا ذمہ دار المان کو ٹھہرایا جاسکتا ہے، ہاں..... یہ صرف اپنے لئے آیا ہے یہاں۔“ وہ من ہی من میں جنگ لڑنے لگی تھی۔

”لیکن جو بھی ہے..... وہ آیا تو ہے، مجھے المان کو سوری بول دینا چاہیے۔“ وہ اس کی جانب دیکھتی لب بھینچنے لگی۔

”المان؟“ اس نے دھیرے دھیرے اس کا نام پکارا، المان نے شاید سنا نہیں بھی وہ کیننٹ میں سے نوڈکین اٹھائے کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا۔

”یہاں پر ہم لوگ زیادہ تر ڈرائے فروٹ اور یہ کینن نوڈی رکھتے ہیں، یہ چیزیں دریا ٹھیک رہتی ہیں ناں..... اس لئے۔“ وہ کینن ٹھونکنے میں مصروف تھا۔



”کیا بات کرنا چاہتی ہو؟“ اس نے بتا پلٹے  
پوچھا، لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔  
”کیا آپ میری طرف دیکھ کر بات کر سکتے  
ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جو کہتا ہے..... کہو..... میں سن رہا  
ہوں۔“ مانہ خاموش رہی، کافی دیر وہ خاموش  
کھڑی اس کے پلٹنے کا انتظار کرتی رہی، الحان  
سے وہ کین کھل نہیں رہا تھا، وہ مسلسل اس کین کو  
کھولنے کی کوشش میں لگا رہا۔

”آئی ایم سوری، میں نے آپ کو غلط سمجھا،  
آپ پر شک کیا، آپ پر اعتبار نہیں کیا، اس سب  
کے لئے آئی ایم رینگی وبری سوری۔“ وہ دھیسے  
سے گویا ہوئی، اگلے ہی پل الحان نے کین کی  
معروفیت چھوڑ، ایک لمبی سانس چبھی، وہ آہستگی  
سے پلٹا۔

”تھینک گاڈ..... کہ تم نے کہہ دیا۔“  
”کیا؟“ وہ حیرانگی سے اس کی جانب  
دیکھنے لگی۔

”میں تو ڈر رہا تھا، کہ کہیں تم پھر سے  
ایلیمنٹ کی رٹ لگا کر اپنے گھر واپس جانے کی  
خود نہ کرنے لگو۔“

”میں نے سوری بولا ہے الحان!“  
”میں نے بھی تمہیں معاف کیا مالو!“ وہ دو  
قدم آگے بڑھا۔

”میں چاہتا تھا کہ تمہیں احساس ہو، کہ جو  
کچھ بھی تم میرے ساتھ کر رہی ہو، وہ بہت غلط  
ہے، میں چاہتا تھا کہ تم سوری بولو..... اور میں  
تمہیں یقین دلاتا ہوں مالو! کہ میں زندگی بھر  
تمہارا مجھ پہ فرسٹ کبھی ٹوٹے نہیں دوں گا، آئی  
پراس۔“ وہ دھیسے لہجے میں گویا ہوا، مانہ اثبات  
میں سر ہلاتی رہ گئی۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ وہ بات بدلتی، فائر

”مجھے معلوم ہے، یہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی  
ہے، مگر کیا؟ اگر یہ سوری بولنا چاہتی ہے، تو یقیناً  
مجھے خوشی ہوگی کہ اسے آخر کار میرا احساس ہوا،  
مجھ پر اعتبار ہوا اور اگر یہ پھر سے واپس اپنے گھر  
جانے کی رٹ لگانا چاہتی ہے، تو میں اس سے کیا  
کہوں؟ سوری بولے، تو بھی کیا کہوں؟ میں اس  
سے بات ہی نہیں کروں گا، بس!“ وہ دل ہی دل  
میں فیصلہ کرنا کھڑا ہوا۔

جیسے ہی وہ آگ جلا کر فارغ ہوا، مانہ کھلے  
اگلے کپڑوں میں لباس، ٹاول سے اپنے بال  
شک کرتی اس چھوٹے کمرے سے باہر نکل آئی،  
الحان نے اس کی جانب دیکھا ضروری نہ سمجھا تھا،  
اس کے نکلنے ہی وہ تیزی سے چلتا اندر داخل ہو  
گیا، دروازہ بند ہوتے ہی مانہ، پاس رکھے بیڈ پر  
تڑختی، بال شک کرتی بند دروازے کی جانب  
دیکھنے لگی، جب بال اچھے سے شک کر چکی تو توبہ  
رکھ کر خود کین اٹھائی اسے کھولنے کی ناکام کوشش  
کرنے لگی، اسی پل الحان بھی چہنچ کیے باہر نکل  
آیا، مانہ کو کین کے ساتھ زور آزمائی کرتے دیکھ وہ  
آگے بڑھا، اس کے ہاتھوں سے کین پکڑا اور  
سہیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

”تم سے نہیں ہو گا یہ، تم وہاں جا کر بیٹھو  
آرام سے، میں کھول کر دیتا ہوں تمہیں۔“  
”الحان!“

”میں نے کہا ناں کہ وہاں جا کر بیٹھو۔“ وہ  
ہاں اس کی جانب دیکھے معروف انداز میں گویا ہوا،  
مانہ خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی، پھر  
زندگی آواز سے گویا ہوئی۔

”الحان سنو پ اٹ..... میں آپ سے  
بات کرنا چاہ رہی ہوں اور آپ.....“ آنسوؤں کا  
گولہ اس کے مقلق آن نکلا، اس کی آواز کانپ  
رہی تھی۔

”کچھ زیادہ ہی خوفناک ہیں۔“ مانہ بھی دھیسے سے مسکرا دی۔

”اف یہ مسکراہٹ۔“ الحان لمبی سانس کھینچ کر رہ گیا۔

”کتنا بے چمن تھا یہ مسکراہٹ دیکھنے کو۔“  
 ”ایک نمبر کے ڈرامے باز ہیں آپ۔“  
 ”ہرگز نہیں، آپ بس ہمارے دل کی باتیں نہیں سمجھتیں۔“ وہ ایک انداز سے بولا۔

”اچھا خیر، مکان کے ساتھ ڈیٹ کیسی رہی؟“ وہ پوچھ رہی تھی، الحان یکا یک چونک اٹھا۔

”ارے ہاں، یاد آیا، میں نے فیصلہ کیا ہے، کہ اس بار کی آپیکھین میں، میں مکان کو ہلکی سیٹ کرنے والا ہوں۔“

”کیوں؟“ مانہ کو اچھنسا ہوا، وہ پٹٹی لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”جہیں معلوم ہے کہ وہ لڑکی تم سے کتنی نفرت کرتی ہے۔“ الحان ایمان داری سے بولا۔

”مالو! تم یقین نہیں کرو گی کہ اس نے تمہارے خلاف کیا کیا بولا ہے، میں جہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا نہ ہی ہرٹ ہوتے دیکھ سکتا ہوں، اس لئے بتا رہا ہوں کہ اس لڑکی سے دور رہو۔“

”مکان؟..... نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتی۔“ مانہ پر سکتے نے وار کیا۔

”وہ تم سے، تمہاری قابلیت سے، تمہاری کامیابی سے نفرت کرتی ہے مالو! جب تک وہ اس شو میں موجود ہے، اس سے بچ کر رہنا، اس سے دور رہنا، پلینز۔“ مانہ عالم مضطرب میں لب کاٹنے لگی، الحان خاموش ہوا۔

”میں یقین نہیں کر رہی۔“ وہ بہت ہرٹ دیکھا کی دے رہی تھی، الحان اٹھ کر اس کے نزدیک جا بیٹھا۔

پیس کے پاس جا بیٹھی، الحان بھی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے سامنے، فائر پیس کے پاس جا بیٹھا۔

”سر دی ہڈیوں میں اتر چکی ہے، ہاتھ کام ہی نہیں کر رہے۔“ وہ کین کھولنے کی کوشش میں مصروف رہا، مانہ نے ایک اچھتی سی نگاہ اس پر دوڑائی اور پھر ہاتھ آگے بڑھا کر ہاتھ گرم کرنے لگی۔

”کچھ باتیں زبان تک نہیں آتیں اور کچھ کان سن نہیں پاتے اور حقیقت میں وہی باتیں بہت اہم ہوتی ہیں۔“ کین کھولتے ہی وہ کین اس کی جانب بڑھاتا بے حد دھیسے لہجے میں گویا ہوا، مانہ کین تھمتی، حیرانگی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”مطلب؟“

”مطلب کہ آپ معنفہ ہیں اور میں نے سنا ہے کہ لکھاری لوگ تو خاموشی کی خاموشی کو بھی بہت باریک بینی سے جانچ لیا کرتے ہیں۔“ وہ چمکتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا، مانہ اس سے نظریں نہ ملا پائی، نہ بھی کا اظہار کرتی بولی۔

”اگر کان لگا کر اپنے دل کی گہرائیوں سے سن سکو، تو جہیں میری باتوں پر یقین آجائے۔“

”مجھے آپ پر یقین ہے الحان؟“

”جھینک یو۔“ وہ ہلکی ہانپنے سے اس کی جانب دیکھنے لگا، مانہ اس کی نظروں کی تپش کی تاب نہ لائی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”آپ ایسے نہیں دیکھیں مجھے پلینز، مجھے آپ کی نظروں سے خوف آتا ہے۔“ وہ نظریں جھکائے بولی، الحان اپنی مخصوص مسکراہٹ مسکرا دیا۔

”اتنا ڈراما تو نہیں ہوں یا؟“

چاہتا، پراسی کی تم آج کے بعد کبھی نہیں روؤ گی۔“

”یہ آنسو تو زندگی کا حصہ ہیں الحان، زندگی بھر کے سہمی، جب کوئی نہیں ہوتا، تب بھی تو ہوتے ہیں ہمارے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ بھانے کے لئے۔“ ٹپ ٹپ برستے آنسوؤں کے ساتھ وہ زندگی آواز میں گویا ہوئی۔

”میری عام سی زندگی میں بہت خاص ہومنی ہو تم، ایک دم اچانک سے، مجھے کان وکان خبر تک نہیں ہوئی اور تم دے قدموں میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئیں، میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں نہ سوچوں لیکن، میں ہار گیا اس دل سے۔“ مانہ بے یقینی کے عالم میں الحان کی جانب دیکھے چلی جا رہی تھی، اسے لگا شاید وہ کسی حسین خواب میں گم ہے جو آنکھ کھلتے ہی ٹوٹ جایا کرتا ہے۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مانو! پلیز مجھے غلامت سمجھنا۔“ وہ رک رک کر بولا، شاید اسے مانہ کے ردھ جانے کا ڈر تھا، مانہ ہنوز بے یقینی کے عالم میں براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی، الحان نے کچھ کہنے کو لب کھولے پھر رکا، کچھ سوچنے لگا، خشک ہوتے لیوں کو تر کرتا وہ ایک بار پھر سے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”I Love You“ اس نے سرگوشی کی، اک سردی لہر مانہ کے پورے جسم میں دوڑتی چلی گئی، وہ سانس نکالتی، بے یقین لگا ہوں سے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”اور یہ بات میں پورے ہوش و حواس میں تم سے کہہ رہا ہوں مانو I,m in love with you“

(باقی اگلے ماہ)

”جس پر تمہیں یقین کرنا چاہیے، اس پر تم یقین نہیں کرتیں اور جس پر نہیں کرنا چاہیے، اس پر اندھا یقین رکھتی ہو۔“ مانہ نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھنے لگی، اس کی آنکھیں نم تھیں، الحان نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں پر اس کے آنسوؤں کو صاف کیا تھا، وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

”ایسا نہیں کرو، تمہیں ہرٹ دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے۔“ آنسو پونچھتے ہی وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”اور یہ آنکھیں مجھے بہت پسند ہیں، میں ان آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔“ اتنا سننا تھا کہ اس کے آنسو بند تو ذکر تو اتر سے بہہ نکلے، الحان بری طرح سے گھبرا گیا۔

وہ اس کے شولڈر پر سر رکھے دل کھول کر رو دی، الحان اس صورت حال سے پریشان ہو بیٹھا تھا، اس کے آنسوؤں سے اس شولڈر بھگ سا گیا، وہ کافی دیر روتی رہی، نجانے کتنے عرصہ کا دکھ آج وہ آنسوؤں کی صورت بھائے چلی جا رہی تھی، الحان ہلکے سے اس کا سر سہلانے لگا، جب وہ رو رو کر تھک چکی تو ایک دم ہوش میں آتے ہی جھلکے سے سیدھی ہو بیٹھی، اس کی آنکھیں رو رو کر سو جھ چکی تھیں، وہ سوس سوس کرئی اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”آئی ایم سوری؟“ وہ زندگی آواز میں گویا ہوئی۔

الحان خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر آئی بالوں کی لٹ اس کے کان کے پیچھے از ستادھی آواز میں گویا ہوا۔

”آج تمہیں جتنا رونا تھا تم رو چکیں، آج کے بعد میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا

# مرہٹے کی انٹرویو سلسلہ

## نایاب جیلانی

اشٹائیسویں قسط کا خلاصہ

ہیام واپس آتا ہے تو نوی سے ٹکراؤ ہوتا ہے جہاں دونوں میں دلچسپ نوک جھونک چلتی ہے،  
یعنی ہیام کو دیکھ کر ایک بار پھر شرہ کے نصیب سے خار کھانے لگتی ہے۔  
کوئے کے پر پر کی اطلاع پر بلا شرارے ہوئے و عوس کو دیتی ہے وہ ہوسٹل میں ہے اور  
شانزے اس کے پاس تھی۔

لاہور سے آئے اسامہ اور اس کی والدہ نے امام کے گھر اور مہمانوں کو سنبھال لیا تھا ہر کوئی  
کوئے کی موت کی خبر پر افسردہ تھا۔

صندیر ابھی تک حیرانگی میں تھا، وہ شاہدار کے بدلے ہوئے اطوار سے چونکتا ہے اور پھر اپنے  
خاص ملازم کو اس کا کھوج لگانے کو کہتا ہے اور خود بی جاہل کو آکر بتاتا ہے کہ صندیر خان نے قبیلہ  
کے باہر کی لڑکی سے نکاح کر رکھا ہے اس بات کے سچ ثابت ہونے کی صورت میں اسے خاندانی  
جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔

نیل بر کی سالگرہ کے دن جہاندار اسے سر پر انڑ سالگرہ و ش کرتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

اشٹائیسویں قسط





واپسی کا سفر عام دنوں سے ہٹ کر بہت بوجھل تھا۔ ایک تو نئے رشتے داروں سے ملاقات، پھر فون کی تھکا دینے والی مصروفیات، مہمانوں کو نمٹانا، ہسپتال کے پھرے، گوکہ اس نے کسی پر احسان نہیں کیا تھا مگر پھر بھی، ایک تھکاؤٹ ضرور گھبراؤ کر رہی تھی، اوپر سے جاتے سے شانزے کا اظہار شکر، اس کا بیٹھا دم اور اپنائیت بھرا لہجہ۔ اسامہ کا نا چاہتے ہوئے بھی دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا، اسے لگ رہا تھا، محبت میں چوٹ کھائی گئی ہے، آہ محبت کرنے والے اپنے مشغولوں سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے ارد گرد ایک احساس کڑوا لپٹے لگا۔

وہ لاہور جانے کی بجائے واپس دیارِ مری کی طرف محو سفر تھا، ایک نئی مہم پر، مگر اس دن وہ جذبہ وہ جوش و خروش نبھانے کیوں مفقود تھا جو اس کے بیٹے کی اصل دیباغہ تھی۔ اور اب کوچ میں بیٹھنے کے بعد ساری الجھی سوچوں کی ڈوریں ہلنے لگی تھیں، دھیان کا پنچھی اڑا کر حشیہ کی طرف ہی بھاگتا۔

اسے کیوں حشیہ کے انداز بدلے بدلے لگ رہے تھے؟ وہ پہلے جیسی تازگی و تراوٹ کیوں مفقود تھی؟ کیا اس کے پیچھے کچھ ہو گیا تھا؟ کیا آخر کیا؟ اس کا بے قرار دل اتنا غیر مطمئن ہوا کہ نمبر اچانک ہی ہیام کے موبائل کا ذہن جگمگانے لگا، دوسرے ہی بل وہ ہیام کو کال کر رہا تھا، مگر یہ کیا؟ فون پر جس کی آواز غیر متوقع سامعوں میں اتری، اس گھڑی بھری لگائی خوشی نے اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ ”کیا ہیام پھر سے گھر پہنچا ہوا تھا؟ الوکا پٹھا، زن مرید۔“ اسامہ نے زیر لب ہیام کو کوسا اور نہایت موزن انداز میں حال احوال دریافت کیا، اس کے استفسار پر حشیہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

”ہیام کا یہ نمبر اب گھر میں ہی استعمال ہوتا ہے، بہتر ہے دوسرے نمبر پر رابطہ کریں۔“ اسامہ تو اس شائستگی میں لپٹی رکھائی پر بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا۔

حشیہ اور اتنا رکھائی کا مظاہرہ کرے؟ یہ اجنبیت اس کے لہجے میں کس کی مرہون منت تھی؟ ”بتانے کا شکریہ، ہیام کے سارے نمبر میرے پاس محفوظ ہیں۔“ اسامہ کو بھی شہینے ہوئے جواب دینا پڑا تھا۔

”کیا مجھے آپ کے مزاج کی تبدیلی کا سبب معلوم کرنا چاہیے تھا؟“ اور اس سے زیادہ دیر تک صبر ہی نہ ہو سکا، اس کے لہجے میں آپوں آپ پنچن در آئی تھی، دوسری طرف سے ایک لمبا سانس کھینچنے کی آواز آئی۔

”کچھ باتیں ان کہی ہی رہنے دیجئے، کریدنے سے سوائے راکھ کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“ حشیہ کے دیمے لہجے میں تندہی یا رکھائی نہیں تھی، ایک نا معلوم سی اداسی تھی، اسامہ کو لمبی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا، جانے عیش کو کیا ہوا تھا؟ پچھلے کچھ ہی عرصے میں وہ واضح طور پر پرانی حشیہ سے مختلف لگ رہی تھی۔

تو اس کا مطلب تھا، آگے بڑھتے قدموں کو کہیں نہ کہیں بیڑی ڈالنے کا کوئی تجسس لمحہ اس کی زندگی میں در آنے والا تھا، اسامہ نے گہرا سانس بھرا اور اچانک ہی بات بدل دی۔  
 ”نشرہ کی خیریت پوچھ سکتا ہوں۔“ حشیہ نے بھی اندر کے بوجھل پن سے نکل آکر برجستہ کہا۔

”ضرور، بلکہ بات بھی کروا دیتی ہوں۔“ حشیہ بولتے ہوئے نشرہ کو آواز بھی دے چکی تھی، کچھ ہی دیر بعد نشرہ کی چیختی آواز نے اسامہ کو سرشار کر دیا تھا، اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

وہ خوش تھی، ہیام کے دیس میں بہت خوش تھی، اس کی غیر موجودگی میں بھی خوش تھی۔  
 ”میں یہاں آئی ہوں تو آپ لاہور کو ہی پیارے ہو گئے، اب کہاں گئی آپ کی پرانی مہم جوئی؟“ اس کے شکوے پہ اسامہ پھینکی سی ہنسی کو لبوں پہ لا کر مسکرا دیا۔

”آ رہا ہوں تمہارے پاس۔“  
 ”ارے کیا سچ؟ یہاں آئیں گے نا؟“ نشرہ کی بے ساختہ جیجی پر حشیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر لب سمجھنے لگے تھے۔

”ریٹ ہاؤس میں اٹھے ہے، مگر تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔“ وہ محبت سے بولا۔  
 ”ہاں، ضرور آنا، حشیہ کی عیادت بھی آپ پہ ادھار ہے۔“ نشرہ نے بے ساختہ مسکرا کر کہا تھا، اسامہ نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں بولا۔

”حشیہ پر تو بہت کچھ ادھار ہے۔“ اس کے الفاظ بس ایک سرگوشی کی طرح نمودار ہوئے تھے اور وہ دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

حجرہ چشم تو اوروں کے لئے بند کیا

آپ تو مالک و مختار ہیں آئیں جائیں

”آں ہاں، یہ کسے سنایا ہے؟“ نشرہ اچانک ہی چونکی اور بے ساختہ بولی تھی۔

”یہ کسے آنے اور جانے کی دعوت دے رہے ہیں؟“ آپٹیکر کھلا تھا اور یہ دھیمی بوجھل آواز با

آسانی حشیہ کے کانوں تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔

اچانک ہی اسامہ کے ہونٹوں پہ چند الفاظ گنگنائے تھے، شاید وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ آپٹیکر کھلا

ہے، اپنے جذبات اس سنگ دل تک پہنچانے کا بواہی مناسب موقع تھا۔

اس نے سنا دینا کی

مر نہیں تو وہ اپنا ہی کچھ خیال کرے

اسے کہو کہ تعلق کو پھر بحال کرے

ملے تو اتنی رعایت عطا کرے مجھ کو

مرے جواب کو سن کر کوئی سوال کرے

کلام کر! کہ مرے لفظ کو سہولت ہو

ترا سکوت مری گنگو محال کرے

نہ گزرے وقت کا پوچھے نہ آنے والے کا  
 کوئی سوال کرے بھی تو حسب حال کرے  
 وہ ہونٹ ہوں کہ تبسم، سکوت ہو کہ سخن  
 ترا جمال ہر اک رنگ میں کمال کرے  
 بلند یوں میں کہاں تک تجھے تلاش کروں  
 ہر ایک سانس پہ عمر رواں زوال کرے  
 نگاہ یار نہ ہو تو غم نہیں پاتا  
 کوئی جمال کی جتنی بھی دیکھ بھال کرے  
 میں اس کے پھول ہوں نیر! سو اس پہ چھوڑ دیا  
 وہ گیسوؤں میں سجائے کہ پامال کرے

اور عشیہ کو لگا ان لفظوں نے اسے اندر تک زخم خوردہ کر دیا ہے، اس کا جھکا سر پھر اٹھای نہیں،  
 دل میں ایک پھانس سی چھپی تھی، جیسے ایک ٹیس سے اٹھی تھی اور پھر گھوٹوں میں معدوم ہوئی، ہر اٹھتی  
 ٹیس کے پیچھے اس کا ارادہ کھڑا تھا، سر تان کر، سر کو بلند کر کے۔

ہیام کو اس کے حصے کی زمین چھین کر دینے کا فیصلہ، اک اٹل ارادہ، کون تھا جو عشیہ کو اس فیصلے  
 سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹا دیتا، کون تھا جو اس کے ارادوں میں دراڑیں ڈال دیتا؟ اور جب اس  
 شب شاہوار بنو اس کی خیریت معلوم کرنے ہمیں نفیس خود ان کے غریب خانے میں تشریف لے آیا  
 تو مورے کے سارے لفظ، سارا طیس، سارا زہر نجانے کیوں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا، شاہوار  
 خان کی شخصیت کا اثر تھا جو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی تھیں، یا انہوں نے عشیہ کے چٹانوں جیسے  
 ارادوں سے گھرانے اور اس کے ارادوں کی راہ میں دیوار بننے سے خود کو روک لیا تھا، جو بھی تھا، آج  
 کی شب اس گھر کی تاریخ بدلنے والی تھی۔

معزز مہمان کو مہمان خانے میں نہایت عقیدت و احترام سے بٹھا دیا گیا تھا۔  
 حیران پریشان سی قدرے شاکہ نشہ مہمان کی تواضع میں مصروف عمل تھی، ابھی تو اتنے  
 عالی شان سے خانزادے کو قریب سے دیکھنے کے بعد حیرت کم نہیں ہوئی تھی، جب اچانک ہی عروذ  
 کسی بہم کی طرح نشہ کے سر پہ آ پھٹی۔

”دیکھا تم نے، میری عزت مآب بہن کی چلتر بازیاں، یہ ہیں شریف زادیوں کے کروت،  
 عاشق زادے گھروں تک پہنچ گئے اور میری ماں کی غیرت دیکھ کہاں جا سوئی ہے؟ مہمان کے  
 چروں میں جا بیٹھیں، اب کہاں گیا ان کا جلال؟ بو خاندان کے سپو لے کو اپنی کیا میں لا بٹھایا۔“  
 عروذ کسی تیز گام کی طرح تیز دھڑکنی کی مانند چلتی سانسوں میں بول رہی تھی۔  
 اور ادھر نشہ کے پلے اس کی کوئی بات نہیں پڑ رہی تھی، وہ ہونٹوں کی طرح منہ کو لے عروذ کو  
 دیکھتی رہی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ ساری ڈراے بازی سمجھ لوگی، سرداروں کا امیر کبیر لڑکا پھانس رکھا  
 ہے میری بہن نے۔“ عروذ کے منہ میں انگارے بھر گئے تھے اور ادھر نشہ کا سانس کھٹنے لگا۔



”اللہ اللہ۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی رہ گئی تھی۔

”یہ چکر بازیاں ہیں اس کی، خود تو مخلوق میں چلی جائے گی اور ہم یہاں ساری عمر سڑتے رہیں گے۔“

”اب کیا کوئی ہو چکی تم، بولتی کیوں نہیں۔“ عروذ ایک دم ترخ کر چینی تھی، شاید اپنی گفتگو کا کوئی رسالت نہ پا کر اسے غصہ آ گیا تھا، نشہ بے چاری کھپکھپا سی مگی، بھلا اب وہ ان بے سرو پا فضول باتوں کا کیا جواب دیتی؟ ادھر عروذ جواب لینے پہ کمر بستہ تھی، شاید اپنی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی۔

”مجھے کیا پتہ عروذ۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”پتہ نہیں تو جلدی ہی لگ جائے گا، دیمچتی رہو تم، اس گھر میں ہوتا کیا ہے، دیکھنا میں بھی اسے چین سے رہنے نہیں دوں گی۔“ عروذ نہر خندی اپنے خطرناک ارادوں سے اسے ڈرا کر اور بھی خوفزدہ کر رہی تھی۔

”مورے سے بات کرتی ہوں، اب ہمارے دشمن ہم سے مہمان نوازی کروائیں گے۔“ اس کا چہرہ نفرت اور حقارت سے بگڑ گیا تھا، نشہ تو ایک دم ہی کم ہو گئی، مگی بہن سے اتنی نفرت؟ اتنی نفرت تو یعنی اور تائی بھی نشہ سے نہیں کرتی تھیں۔

جانے اب کیا ہونے والا تھا؟

نشہ کا دل سوکے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

لڑائی بھڑائی سے اسے ویسے بھی بہت خوف آتا تھا۔

اور یہاں تو ہیام بھی نہیں تھا، کون انہیں روکتا؟ اور صلح صفائی کرواتا؟

مہمان تو ایک اچھی شام گزار کے اچھی امید کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا، حشیہ کی آنکھوں کی چمک بہت سے راز افشاں کر رہی تھی، اوپر سے مورے کا حوصلہ افزا انداز۔

انہوں نے اپنے دشمن کے نتیجے کو ”خوش آمدید“ کہا تھا، شاید انہوں نے نفرتوں کی تاریخ بھی بدل ڈالی تھی، یا پھر جیجی کی آنکھ میں اتری جوت نے ان کو اندرونی طور پر کمزور کر دیا تھا، جو بھی تھا، مورے کا حوصلہ افزا رویہ اس گھر میں آج کی رات ایک قیامت لے آیا تھا، عروذ سارے مورے سنبھالے تو ہیں تیار کیے مہمان کے جانے تک کا انتظار کر رہی تھی، مورے کو اندر آتے دیکھ کر ہی پھٹ پڑی۔

”انسان کے قول و فعل میں اتنا تضاد نہیں ہونا چاہیے، یہی تھے نا آپ کے دشمن؟ جن کو سر آنکھوں پہ بیٹھالیا۔“ مورے اس کے خونخوار تیور دیکھ کر گہری سانس بھرتی غڑ محال سی تخت پہ بیٹھ گئی تھیں۔

”میرا دشمن یہ نہیں، تیرا باپ تھا اور اسے کوئی معاف نہیں، نہ اس جہاں میں نہ اس جہاں میں، وہ اپنے سارے مظالم کے ساتھ رہتی دنیا تک میرے دشمنوں میں سر فہرست رہے گا۔“ مورے کی آواز میں پیال کے جنگلوں کی وحشت بول رہی تھی، عروذ ان کی بات سن کر چیخ اٹھی۔

”بس کر دیں یہ ڈرا سے بازی، وہ بھی سامنے آئے تو کہہ دینا، میرا یہ دشمن نہیں، اس کا باپ

میرا دشمن تھا، سو، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تو میرے سارے حقوق ان کو معاف۔“ عروذہ کے چلانے پر حشیہ بھی پیر کی تکلیف بھلا کم اندر آگئی تھی، وہیں خوفزدہ سی سبھی شہرہ بھی کوٹنے میں گھڑی تھی، اللہ جانے اب کیا ہونے والا تھا؟ پیام کی فیملی تو تائی کی فیملی سے بھی بڑا ڈرامہ تھی، اس نے ٹھنڈی سانس باہر نکالی اور خود کو ماحول میں بڑا ہی مس فٹ سمجھا۔

”کیوں آیا تھا وہ یہاں؟“ اب وہ براہ راست زہرا گل رہی تھی۔

”عیادت کے لئے آیا تھا، کوئی رقبہ نہیں زبردستی اپنے نام لگوا کر کاغذ ہم سے چھین کر لے گیا، جو تو اس قدر پھٹ رہی ہے۔“ مورے بھی اپنے ازلی جلائی موڈ میں آگئی تھیں، حشیہ کا سر دیسے بھی بھاری تھا، اوپر سے عروذہ کی بکواس اور مورے کا حصہ، وہ شہرہ کے سامنے کم از کم کوئی ڈرامہ نہیں چاہتی تھی مگر.....؟ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ اسے شہرہ کے سامنے عروذہ کی چپ گھٹنگو پہ سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی، کیا سوچتی ہوگی؟ پیام کی بیٹی کیسی ہیں؟ جن کے چاہنے والے گھر وں تک؟ اور اس سے آگے حشیہ کی سوچ اندھیری ٹھکانی میں الٹ جاتی تھی۔

”اپنی بکواس بند کرو اور زبان کو لگا دو، بولنا مجھے بھی آتا ہے مگر میں تمہاری سطح پہ اترنا بھی اپنی تو چین سمجھتی ہوں۔“

”تمہاری کیا ہے؟ آج ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔“ عروذہ نے تالی بجا کر استہزائیہ کہا، حشیہ کا چہرہ مارے رہانت کے سرخ ہو گیا تھا، مگر مورے کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو گئی تھی، کیونکہ اسی وقت پیام کی موبائل فون پہ کال آگئی تھی۔

حشیہ لب بچتی غصے کے عالم میں باہر نکل گئی، اس کے پیچھے شہرہ بھی قدم ٹھٹھتی کھسکی تھی، عروذہ تو پہلے ہی پاؤں بٹخ کر جا چکی تھی، پیچھے مورے سر قہقہے کرتی رہ گئیں۔

”اب جانے یہ فسادن پیام کو کیا بتائے؟“ ان کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزنے لگا تھا۔

☆☆☆

اسلام آباد جیسے پرسکون شہر میں آکر تو یعنی لاہور کے ہنگاموں کو بھول ہی گئی تھی۔

پھر جنسی سہولیات خالہ کے اس بنگلے میں تھیں، کس کا فر کا دل داہیں جانے کو چاہ رہا تھا، یہاں تو نوکر چاکر تھے، آسائش تھیں اور ہر چیز وافر مقدار میں میسر تھی۔

اس کا چالیسویں کے بعد بھی یہیں رہنے کا لمبا پروگرام تھا، کیونکہ پلوٹہ خالہ کی طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں ملے گا وہ تو چاہتی تھیں یہ لوگ ابھی داہسی کا پروگرام ہی ملتوی کر دیں مگر امی کو جلد ہی گھر کی یاد داہس پہنچ کر لے گئی تھی، البتہ یعنی کو وہ یہیں چھوڑ گئی تھیں، جانے ان کی نیت میں کیا تھا؟

یعنی کے یہاں خوب مرے تھے، کون سا کوئی لمبا چوڑا کام کاج تھا، خالہ گھرداری سے سخت بیزار لگتی تھیں، کوئے کے غم کو انہوں نے دل سے ہی لگا لیا تھا، یعنی نے بھی بخوشی خالہ کے عالیشان گھر کا تھوڑا بہت انتظام سنبھال لیا تھا اور یہاں تو فراغت ہی فراغت تھی، خوب مرے تھے۔

صبح ناشتے کے بعد میڈ آئی تھی اور اس کے بعد نچ تک وہ مرے سے ٹی وی دیکھتی، گرم کھانے یا سوتی رہتی، امام اور خالہ اپنے اپنے کمروں میں زیادہ تر رہتے تھے، کم ہی باہر آتے تھے، کبھی کبھی

برابر والے دلا سے شانزے چکر لگا لیتی تھی، باقی اس ہی اس تھا، یعنی اور لومی کا راج پاٹ تھا۔  
کتنے پیارے رشتے دار تھے جن سے امی نے ساری زندگی انہیں ملایا ہی نہیں، جانے کس  
احساس کمتری کے پیش نظر۔

بہر حال ان لوگوں کو اپنے بچھڑے رشتے داروں سے مل کر بہت ہی اچھا لگا تھا۔  
اور ابھی یعنی دھیر سا راترہوز کاٹ کر اوپر تک ڈال کر ہاؤل کا ٹائٹل لائونج میں آئی ہی تھی  
جب اس کے نمبر یہ کسی کی کال آگئی، نمبر غیر شناسا تھا اور باہر کا ہی لگتا تھا۔  
یعنی نے کچھ ٹھنک میں جیلا کال انیڈ کر لی تھی، مگر دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر  
اس پہ شادی مرگ والی کیفیت طاری ہو گئی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دوسری طرف سے آنے  
والی آواز ولید کی آواز ہو سکتی ہے؟ ولید اسے کال کر سکتا ہے؟  
نشرہ کی شادی ختم ہونے کے بعد تو ان لوگوں نے سارے تعلق ہی ختم کر لئے تھے، نیچے  
والوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا، البتہ اوپر والوں سے پھپھو کی ہلو ہائے ضرور تھی، یعنی حیرت کے سمندر  
سے نکلنے ہوئے بمشکل ”ہیلو“ بول سکی تھی۔

دوسری طرف ولید کا خاصا پر جوش اور حوصلہ انفرادیہ تھا، یعنی تو خوشی کے مارے گلاب سی ہو  
رہی تھی، ولید اس کی اولین خوشی تھا، ابھی یعنی کی آنکھوں میں ولید کے نام سے قدیلیں روشن ہوتی  
تھیں، مگر یہ گئے وقتوں کی بات تھی، اب تو اس نے کبھی ولید کو سوچا ہی نہیں تھا۔  
”کیسی ہو یعنی؟“ ولید کا تہمدی لہجہ بلا کلام تھا، یعنی کوٹش آنے لگا، ولید اور اس سے اتنی  
ملاحت و محبت سے بات کر لیتا؟ آج جانے کون سا مبارک دن طلوع ہوا تھا؟  
”میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟ کیسے یاد کر لیا۔“ یعنی کے حواس کچھ کام کرنے لگے تو جلدی  
سے خیریت کی رسم بھائی تھی۔

”ہم نے کیسے ہونا تھا؟“ ولید نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔  
”ممی کی باتوں میں آکر میں نے تمہیں کھو دیا تھا، اب دل کو کیسے سکون آئے؟“ یعنی تو اس  
درد مند لہجے پر لٹو ہوتی بے ہوش ہونے لگی تھی، دل تو اچانک ہی سر پٹ بھاگنے لگا۔  
”تمہیں کھو کر احساس ہوا کہ میں نے اپنا کتنا نقصان کیا ہے۔“ ولید کی بھاری بوجھل آواز  
میں دکھ کر وٹ لیتا نظر آ رہا تھا، یعنی کے رہے سبے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔  
آج ولید کیسی باتیں کر رہا تھا؟ اس کے تو کان ترس گئے تھے ایسی باتیں سننے کے لئے اور  
اب جب اس نے اپنے دل کو سمجھ لیا تھا تو اچانک پھر ولید اس پر سکون ندی میں نکھر پھینکنے آ گیا،  
یعنی کا دل بھر بھر آیا۔

”تو تمہیں آخر احساس ہو ہی گیا نا؟“  
”کوئی ایسا ویسا؟ اب تو صرف پچھتاوارہ گیا ہے۔“ ولید نے جیسے ہاتھ ملے تھے، یعنی تو اب  
چاروں شانے چت ہو پڑی تھی، ولید کے سارے ہی نشانے پہ تیر لگے تھے، کوئی ایک بھی خطا نہیں  
گیا تھا۔  
”تم نے خود ہی جو بھی کیا، ورنہ زندگی اتنی مشکل نہیں تھی۔“ یعنی کو بھی الناسید حائفہ جھاڑنا

یاد آیا تھا، ولید چونکا اور پھر لہجے میں رقت بھرتا بولا تھا۔

”بگڑی چیزوں کی ترتیب درست کی جاسکتی ہے۔“

”تم نے ہر چیز کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے۔“ یعنی کو بھی اترانے کا خیال آیا، کچھ غرہ دکھانے کا خیال آیا۔

”مشکل کچھ نہیں ہوتا، بس انسان کو خود سے ہارنا نہیں چاہیے۔“ ولید کا لب و لہجہ معنی خیز قسم کا تھا، یعنی کی دھڑکنوں میں پھر سے طلام آیا، آج تو ولید اسے بے ہوش کرنے پہ تلا ہوا تھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، ابو تم لوگوں سے جدید تعلقات کریں گے؟ وہ شرہ کے معاملے میں اب بے عزتی کو ابھی تک نہیں بھولے۔“ یعنی کو اسے کچھ یاد دلانا پڑا تھا۔

”اگر تم چاہو، تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ ولید نے معنی خیزی سے جتایا تھا۔

”میں.....؟ مگر کیسے؟“ لاہر واہ سی یعنی اس کے لہجے کی معنی خیریت کو قطعی طور پر سمجھ نہیں سکی تھی۔

”تم ماموں کو رام کر لینا، آخر سگی اولاد کی خوشی بھیجی سے زیادہ بڑھ کر انہیں عزیز نہیں ہوگی۔“ ولید نے بالآخر اس چنگاری کو ہوادے رہی تھی، جو یعنی کے اندر اب تک تو راکھ بن چکی تھی۔

”پھر بھی..... یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔“

”کچھ مشکل بھی نہیں۔“ ولید کا انداز حوصلہ دیتا ہوا تھا۔

”پہچو کیا چاہتی ہیں اب؟“ یعنی کو اچانک خیال آیا تھا، ولید نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

”ظاہری بات ہے، اپنے بھائیوں سے تعلقات بحال کرنا چاہتی ہیں۔“

”تو پھر پہچو کو ابو سے رابطہ کرنا چاہیے تھا، کم از کم معذرت ہی کر لیں۔“ یعنی نے بے ساختہ شکوہ کیا تھا۔

”تم سابقہ ناراضگی بھلا دو، مئی، ماموں سے معذرت بھی کر لیں گی۔“ ولید کے الفاظ نے یعنی کو بے ساختہ سرشار کر دیا تھا، تو کیا واقعی ولید کو احساس ہو گیا تھا؟ اور وہ یعنی کی طرف لوٹنا چاہتا تھا؟

یعنی کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

”اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔“ یعنی نے اگلے مرحلے خواہوں ہی خواہوں میں تیزی سے طے کر لئے تھے، ولید کا ساتھ، اس کی ہمراہی اور دوستی کے مزے۔

”ایسا ضرور ہو جائے گا، اگر تم میرا ساتھ دیتی رہی۔“ ولید نے ایک مرتبہ پھر معنی خیزی سے جتایا تھا، یعنی اپنی خوشی میں سمجھ ہو نہ سکی تھی۔

”میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گی، کیونکہ میں تمہیں پھر سے کھونا نہیں چاہتی۔“ یعنی نے بیگی آواز میں یقین دہانی کرواتے ہوئے ولید کو ایک گونا اطمینان سے نواز دیا تھا، اس نے مسکرا کر اپنی ماں کو روکری کا نشان دکھایا اور نہایت لگاؤ سے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور اب وہ

ماں کو مسکراتے ہوئے خوشخبری سنارہا تھا۔

”ہم جلد پاکستان جا میں گئے گی۔“

”کیوں نہیں۔“ فرخ محل انھیں۔

”یعنی سے گپ شب اچھی رہی؟“ وہ نہایت دلچسپی سے پوچھ رہی تھیں۔  
 ”سو فیصلہ اچھی۔“ ولید نے انہیں کامیابی کی نوید سنائی تھی، فخر کے تاثرات معنی خیز ہو چلے تھے۔

”اب دیکھئے گا، ہوتا کیا ہے؟ ہر چیز پہ قبضہ جما کر بیٹھے ہیں، ہمارا جائز حصہ بھی نہیں دیتے، اب میں ان لوگوں کے ساتھ کیا کرتا؟ آپ دیکھتی رہیے گا، مجھے اپنی بے عزتی بھولتی نہیں۔“ ولید کے لہجے میں ذہنی شیر کی سی غراہٹ تھی۔  
 ”تم نے نشرہ کا نمبر تو لیا نہیں۔“

”وہ بھی ضرور لوں گا، آپ فکر کیوں کرتی ہیں، جین کی زندگی تو وہ بھی نہیں جیئے گی۔“ اس کی غراہٹ ایک دم پراسراریت میں بدل گئی تھی۔  
 فخر معنی خیزی سے بیٹے کی طرف دیکھتی ذرا عجیب سے تاثرات کا شکار ہو گئی تھیں، ایک دم اپنے اندر اتنی لہر کودہ خود بھی سمجھ نہیں پاتی تھیں، پھر اچانک ہی ان کے منہ سے برآمد ہوا تھا۔  
 ”کیا ہمیں نشرہ کا چہرہ کلوز نہیں کر دینا چاہیے؟“

”یہ کیسے ممکن ہے مُمی! میں اسامہ اور نشرہ کو ضرور سزا دوں گا، میں ان دونوں کو کبھی معاف نہیں کر سکتا، نہ میں اپنی بے عزتی بھول سکتا ہوں، میں اتنی ہی ذلت ان دلوں کو لوٹا کر رہوں گا، جتنی ذلت میں نے پاکستان سے سیکھی تھی۔“ وہ زہر خند سا بولتا کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔  
 فخر کے دل کو عجیب سی گھبراہٹ لگ گئی تھی، شاید یہ گھبراہٹ کسی بڑی خرابی کا پیش خیمہ تھی، ان کا دل چاہا، وہ ولید کو روک دیں، مگر انہیں اندازہ ہو چکا تھا، ولید کو روکنا کتاب ممکن نہیں رہا۔  
 وہ اسامہ اور نشرہ سے انتقام لینے کی آگ میں سلج رہا تھا۔  
 اور یہ آگ ایک مرتبہ بھر بہت نقصان کرنے والی تھی۔

☆☆☆

نشرہ کی کال آرہی تھی اور ہیام دھڑا دھڑ میریض بھگتا رہا تھا۔  
 آج سارا دن اسے فراغت ہی نہیں ملی تھی، وہ کمرفون نہ کر سکا نہ میج، دیئے اسے بے چینی لاحق ہو رہی تھی کیونکہ گھر سے اس وقت کبھی کال نہیں آئی تھی، کم از کم عیدہ کو اندازہ تھا، اس وقت ہیام مصروف ہوتا ہے اور یہ اندازہ نشرہ کو بھی تھا۔  
 ”جانے کیا معاملہ ہوا؟“ اسے میریض فارغ کرتے یہی پریشانی لگی رہی، اللہ اللہ کر کے دو بجے تک ریش چماتا تھا اس نے پہلی فرصت میں گھر کال کی تھی۔

اتفاقاً فون حشیہ نے نہیں، نشرہ نے اٹھا یا تو ہیام کے دل کی مرجھائی کلی کھل اٹھی، نشرہ کی آواز میں جانے کیا جادو ہوتا تھا، کہ اس کی ساری سوئی پڑی چو نچالی لوٹ آئی تھی۔  
 ”زہے نصیب، آج تو کچھ اور بھی مانگ لیتا۔“ اس نے زمانے بھر کی تازگی لہجے میں سوکر کھٹکتی آواز میں کہا تھا، دوسری طرف شاید نشرہ کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھل اٹھا تھا، اس نے خاصی بے نیازی سے جتایا۔

”میرے علاوہ اور کیا مانگتا تھا؟ میں تو آل ریڈی مل چکی ہوں۔“

”آں ہاں..... صدقے جاؤں ایسی خوش فہمیوں کے، تم کو کیا لگتا ہے؟ میرے سارے ڈائلاگ سچے ہوتے ہیں۔“ ہیام نے گلے سے اسٹیکو پ اتار کر ریلیکس انداز میں ٹانگیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”تو پھر کیا مانگتا تھا؟“ نشرہ نے تنک کر پوچھا تھا۔

”ایک خوبصورت بیوی مانگ سکتا ہوں۔“ بڑے جذب کے عالم میں کہا گیا تھا۔

”ہونہ، جیسے یہ دعا تو بڑی پوری ہونے والی تھی۔“ نخوت سے سر جھٹک کر نشرہ نے ہیام کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”کیوں؟ تمہیں الہام ہوا کہ میری دعائیں پوری نہیں ہوتیں؟“

”کم از کم یہ تو نہیں ہونے والی۔“ اس کا اعتماد قابل دید تھا، ہیام کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

نشرہ دن بدن اس کی توقعات پہ پوری اتر رہی تھی، شاید اس کے گھر والوں کا رویہ بھی کافی حوصلہ افزا تھا، ہیام کو حشیہ پہ فخر ہوا، یقیناً یہ سب حشیہ کی ہی بدولت تھا۔

”اگر ہو جائے تو.....؟“ ہیام نے اسے جان بوجھ کر ستایا۔

”تو اپنی تمہاری جان ایک کر دوں گی۔“ برجستہ دھمکی نے ہیام کو بے ساختہ ہنسا ڈالا تھا۔

”وہ تو آل ریڈی ایک ہے۔“ ہیام دل و جان سے فریفتہ ہوا۔

”ایک ہونے میں اور کوئی کسر رہ گئی کیا؟“

”اگر کوئی رہ جاتی تو وہ بھی نکل جاتی۔“ نشرہ کا انداز بے نیازی سے مہر پور تھا، ہیام بے

ساختہ ہنس پڑا۔

”اے نشرہ! یہ تم ہی ہو یا میرے آنے کے بعد بدل گئی ہو، بات تمہاری زبان کا رنگ حشیہ نے

مانجھ کر اتار دیا ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ حیرانی کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔

”یہ تمہارے یہاں سے جانے کا اثر ہے۔“ نشرہ کے الفاظ نے ہیام کو بری طرح سے گڑبڑا

ڈالا تھا، وہ جو بڑے ریلیکس موڈ میں جوس پی رہا تھا، اسے سخت اچھوٹک گیا، کھانسی کھانسی کر دوہر

ہو گیا تھا، ادھر نشرہ کچھ ہنسنے لگی اور پھر ایک دم مسکرانے لگی تھی، تیرنٹا نے پہ لگا تھا۔

”ایک مرتبہ پھر بولنا۔“ اس نے کھانسی کا ڈرامہ روک کر پھر سے کہا۔

”تمہارے جانے کا اثر ہے۔“ نشرہ کون سا گھبرا رہی تھی، نوراً تیرنٹ جواب دے کر اسے

تپایا، اچھا تھا تپتا رہتا، یہاں اس کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔

”دیکھ لو، پھر میں نہیں آنے والا۔“ اس نے بھی نشرہ کی دھمکی رنگ پہ ہاتھ رکھنا چاہا تھا، مگر وہ

بھی نشرہ تھی، اس کے آنے کے بعد خوب پر پرزے نکال لئے تھے۔

”تو نہ آنا۔“ اس نے ہونٹوں کا کونا دبا کر ہیام کو خوب تپا ڈالا تھا، ادھر ہیام کے نتھنے پھولنے

لگے۔ یعنی اس کی اتنی سی اوقات تھی؟

”دیکھ لو، پھان ہوں اور ضد میں آ جاؤں گا۔“ اب کہ جناب نے بھی کمال کی دھمکی دی تھی،

مگر دوسری طرف پرواہ کسے تھی؟

”تو آ جاؤ ضد میں۔“ نشرہ نے جیسے ناک پر سے کبھی اڑائی تھی اور ادھر ہیام مصنوعی غصے میں

کھول کر رہ گیا تھا۔  
 ”یہ تم میں حشیہ کی روح کہاں سے آگئی؟“ ہیام صدے کے مارے کرسی پر ہی لڑھک گیا تھا۔

”حشیہ باجی نے کہا تھا، میرے بھائی سے ڈرنا مت، سو میں ان سے کیا وعدہ بھارا ہی ہوں۔“ نشرہ نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تو ہیام نے آہ بھری۔  
 ”حشیہ کی بچی میں نہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے غائبانہ بہن کو دھکی دی تھی، دوسری طرف نشرہ ہنسنے لگی، اس کی بے فکری ہنسی نے ہیام کو سرشار کر ڈالا تھا، وہ جیسے نشرہ سے گفتگو کے بعد تازہ دم ہو گیا۔

”کتنا بدل گئی ہے نشرہ! کہاں تو منہ میں زبان ہی نہیں تھی اور کہاں اب؟ اور یہ سب حشیہ کی کرامات لگتی ہیں، جیو حشیہ! میری بہن۔“ اس کا دل اپنی بہن کی محبت سے لبالب بھر گیا تھا، تاہم اس نے نشرہ پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا، بلکہ اسے الٹا ڈرایا۔  
 ”مجھے آئیے دو، میں تمہاری مورے سے کلاس لکھاؤں گا۔“

”اچھا، خاطر جمع رکھیے گا، میری بجائے اپنی کلاس نہ لگ جائے، کیونکہ ابھی آپ کو گئے مہینہ بھی نہیں ہوا۔“ نشرہ کے جتلانے پر ہیام کو غش آنے لگا۔  
 ”اچھا..... تو اتنا حساب کتاب رکھا ہوا ہے؟“ اس کے انداز میں گدگدانے والی معنویت تھی، نشرہ کا دل پہلو میں دھڑکنے لگا تھا، تاہم اس نے خود کو کنٹرول کیا، ورنہ ہیام کا کچھ پتا نہیں تھا، ابھی کے ابھی کوچ کا ڈنڈا پکڑ لیتا۔

”جی نہیں..... وہ تو صبح مورے اٹھیں پمکن رہی تھیں۔“ نشرہ نے صبح کی تھی۔  
 ”ہاں، ہاں..... میری ماں جو ہوئیں، حساب نہ رکھیں گی تو کیا دشمن رکھیں گے۔“ ہیام نے منہ بنا کر جتلیا۔

”بھئی ستائیس دن ہو چکے ہیں۔“ نشرہ کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا، پھر اس نے زبان دانتوں تلے دہالی تھی، مگر اب کیا فائدہ؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔  
 ”ستائیس دن؟“ ہیام نے اس کے الفاظ اچک لئے تھے۔

”اور ستائیس راتیں پلس چون میں آج کی فلاٹ سے منگورہ آ رہا ہوں۔“ ہیام نے تیز تیز بولتے ہوئے ایک پرچے پر چھٹی کی درخواست لکھی اور شان سے مسکراتا ہوا ایم ایس کے دفتر کی طرف بڑھ گیا تھا، دوسری طرف نشرہ ”ارے ارے“ ہی کرتی رہ گئی تھی، جبکہ ہیام نے کچھ سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

اور نشرہ سر پکڑ کر بیٹھ چکی تھی، اس کی شرارت مہنگی پڑنے والی تھی، اب بھلا ہیام کو اتنی باتیں سننا پڑ گئیں، وہ شدید متحک ہوئے لگی، حشیہ کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔  
 ”مرد بچہ بن کر کام میں دل لگائے رکھیں، خبردار جو ہر روز کوچ کا ڈنڈا پکڑا، ساری تنخواہ اب کراپوں میں مت پھونک دیتا۔“

ادراپ جو درگت حشیہ کے ہاتھوں ہیام کی بننے والی تھی، اس کا سوچ سوچ کر نشرہ کو مزہ آنے

لگا تھا، کوئی تو تھا جو اس ”جن“ کو قابو میں کرتا تھا۔

اس نے سنہری کڑوں کو دھرتی کی پیشانی چومتے دیکھا اور مبہوت ہو گئی تھی، اسے اندازہ ہی نہیں تھا، وہ آنکھ کھولے پر جنت میں کھڑی دکھائی دے گی، اگر یہ جگہ جنت نہیں تھی تو اور کیا تھی۔

اس نے سبز پہاڑوں کے اوپر پھیلے سبزے کو دیکھا، آسمان پہ اڑتی کونجوں کو دیکھا، شاخوں پہ لدے پھولوں کو دیکھا، بہتے جھرنے، غدیاں، آبشاریں، اس کی بے رنگ آنکھیں ان گنت رنگوں سے بھرتی چلی گئی تھیں، اگر وہ زندہ تھی اور زمین کے اوپر تھی تو پھر اس جگہ کو کیا کہتے تھے؟

”شاید جنت الفردوس۔“ اس نے مبہوت ہو کر سوچا اور کھڑکی سے پرے کھلتے منظر میں کھونے لگی، معاً اس کے پیچھے سادہ سی نرم آواز سنائی دی تھی۔

مقامی لہجے میں قدرے اکھڑی اردو کے ساتھ وہ بڑی محبت سے کوئے کو دیکھ رہی تھی، دونوں کی مردوں میں خاص فرق نہیں لگتا تھا مگر شکل میں تو انہیں ہمیں کا بھی فرق نہیں تھا، سچ تو یہ تھا، کوئے نے اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہونا ترک کر دیا تھا، اسے اپنی قلعے کی ایک کچھڑ کا قول یاد آیا۔

”اس دنیا میں کم زرم پانچ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کی شکل آپس میں مل جاتی ہے اور یہ محض اتفاق ہوتا ہے۔“

قلعے کی مہم جس قدر کھسکی ہوئی تھی، بہت سے ایسے بونگے قلعے اپنے پاس سے ایماؤں کر لیتی تھیں اور اب تو کوئے نے محنت نامی اس رحم دل بری کو دیکھ کر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

یہ بیماری سی لڑکی جو اس کی خدمت پر مامور تھی اور جس کی مہمان نوازی نے کوئے کو اس کا گردیدہ بنا دیا تھا۔

اب تک ان دونوں کے سچ دوستی اور تعلق کی ایک بنیاد کھڑی ہو گئی تھی، محنت اسے فطری منظر میں کھویا دیکھ کر مسکرا دی تھی، اس نے آہٹ پہ مڑ کر دیکھا اور بے خیالی میں بولی۔

”میں نے اتنی حسین سویر دھرتی پہ اتنی آج تک نہیں دیکھی۔“

”ہمارے لئے تو ہر سویر عام سی ہے۔“ اس نے سادہ سے الفاظ میں بولتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا کس میز پر رکھ دیا تھا، وہ کوئے کے پاؤں کا زخم صاف کرنا اور شاید ڈریسنگ بدلنے آئی تھی۔

”میں نے اتنی خوبصورت سویر دیکھی نہیں اس لئے۔“ کوئے اب بھی دم بخود سی تھی، اسے انگور اور لوکاٹ کے درخت اتنے فحشی بیٹ کر رہے تھے، جی چاہ رہا تھا، کھڑکی سے چھلانگ لگا کر انگوروں کی بیلوں تک پہنچ جائے اور انگوروں کے پھولوں سے یہ دوائیوں والی ہاسک الٹ کر بھر لے۔

مگر ابھی وہ زیادہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی۔

محنت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پہ بٹھایا تھا۔

”ابھی تم کو زیادہ چلنا پھرنا نہیں درنہ زخم خراب ہونے کا خطرہ ہے۔“ وہ اسے نرمی سے تنبیہ کر رہی تھی، کوئے نے بیزاری سے سر ہلا دیا۔

”یار! اتنے بڑے سوپر ڈوپر ہٹ میں ایک فون کی سہولت نہیں، مجھے اپنے گھر کا کال کرنی ہے۔“ کوئے نے ایک دم اداس ہو کر چلنے ہوئے کہا تھا، وہ زیادہ صند بھی نہیں کر سکتی تھی، ایک تو



ان انجی لوگوں کا اس پر اتنا بڑا احسان تھا، نہ صرف اسے زخمی حالت میں اٹھا کر لائے تھے، اور پھر اسے اتنے دن ہو چکے تھے بے لوث حیرت داری کرتے ہوئے، سودہ اپنے محل سے ان کے دل برے کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”کیا تم کو یہاں کوئی تکلیف ہے؟“ حمت نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا تھا۔

”ارے نہیں تو۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”بلکہ میں تو تم لوگوں کا یہ احسان.....“

”ایسے نہیں بولو، کوئی احسان نہیں، یہ ہمارا فرض تھا۔“ حمت نے بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا، کوئے اس کی محبت کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔

”مجھے بس اپنی خیریت کی گھر اطلاع دینی تھی، میرے گھر والے تو جیتے جی مر جائیں گے، اتنے دنوں سے لاپتہ ہوں۔“ کوئے نے تڑپ کر اپنی بے قراری کی وجہ بتائی تھی، حمت نے دھجی سی آہ بھری۔

”لالہ کو پیغام دے دیا تھا، کہہ رہے تھے، تمہارے گھر اطلاع کر دیں گے اور جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتی یہیں رہو گی۔“

”ہاں، بس اطلاع تو کر دیں، کم از کم خالہ اور بھائی کو آسرا تو ہو، جانتی ہوں، میری خالہ بیمار ہیں اور بھائی بستر پہ، کوئی میرے پیچھے نہیں آ سکتا مگر میری خیریت تو ان تک پہنچ جائے نا۔“ کوئے نے بے قراری سے کہا تھا۔

”تم فکر نہ کرو، لالہ نے وعدہ کیا ہے تو ضرور پورا کریں گے۔“ حمت نے اسے تسلی دی تھی۔

”میں تم لوگوں کا یہ احسان.....؟“ کوئے فرط جذبات سے رونے لگی تھی۔

”پھر احسان؟“ حمت نے ناراضگی سے کہا تھا، ڈرینگ ہو چکی تو وہ ہاتھ دھوئے واش روم میں چلی گئی تھی، باہر آئی تو کوئے سے نرمی کے ساتھ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

”تمہارا خیال رکھنا، کوئی احسان نہیں، ہمارے لئے اعزاز ہے، اگر سمجھ سکو تو، اب تم لیٹ جاؤ، میں ناشتہ لا رہی ہوں۔“ وہ ملاحت سے بولتی ہوئی کیسٹ روم سے نکل گئی تھی، باہر آئی تو سعادت خان خنجر کھڑا تھا۔

”خانان بلارہے ہیں۔“ حمت نے جلدی سے باکس کیبنٹ میں رکھا اور رہائشی حصے کی طرف آگئی۔

خان اس کا خنجر تھا، اخروٹی رنگ کے لباس میں، بال نفاست سے بنائے، چہرے پہ تازہ شیوہ کی نیلا نہیں لئے بے پناہ وجیہہ خان ہو نکل کا حقیقی سردار لگتا تھا، وہی کروفر، وہی رعب، وہی دبدبہ، وہی حلال۔

”جی لالہ!“ وہ دل ہی دل میں ماشاء اللہ بولتی اندر آگئی تھی۔

”آں ہاں، کبسی ہو حمت؟“

وہ مطلب کی بات تک آنے سے پہلے اخلافاً بولا تھا، حمت تو بس خوش کھانے لگی تھی، لالہ اور اس کا حال احوال پوچھیں، مقام حیرت تھی، مگر اب وہ حیرتوں کے ان جھکوں سے سنبھلنے لگی تھی،

کیونکہ لالہ دن بدن اس پہ مہربان ہوئے جا رہے تھے، جانے حمت کے نصیب اس با نصیب لڑکی کے طفیل کھلنے والے تھے؟ شاید بد نصیب حمت کے دن بھرنے والے تھے؟

”میں ٹھیک ہوں لالہ!“ اس نے گھبرا کر جواب دیا تھا۔

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

”نہیں لالہ! سب کچھ میسر ہے۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”مہمان لڑکی کے ذمہ کیسے ہیں؟“

”پہلے سے بہتر ہیں، وہ وادی میں جانے کو چلتی ہے۔“ حمت نے اگلے الفاظ نے صندیر خان

کو مسکراتے پہ مجبور کر دیا تھا اور حمت اسے مسکراتا دیکھ کر بے ہوش ہونے والی تھی۔

”اللہ اللہ، اس لڑکی کی کرامات؟ لالہ اور مسکرا رہے؟“ حمت نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”اس سے کہنا اسے اتنی جلدی کیا ہے؟ یہ برتوں کی شہزادیاں مہمانوں کو اپنے فسوں میں جکڑ

لتی ہیں ہمیشہ کے لئے اپنا اسیر کر لیتی ہیں، اسے کہو اتنی جلد بازی سے کام نہ لے۔“ اس کا انداز

بھرپور سختی خیز تھا، حمت کے کچھ بھی پلے نہیں پڑا تھا، وہ ہونٹوں کی طرح بس سر ہلاتی رہی۔

”وہ کہتی ہے، یہ جنت کا کوئی حسین خطہ ہے، یہ وادی اسے قید کر رہی ہے۔“ حمت نے سادگی

سے کوسے کے تاثرات اور خیالات بتائے تھے۔

”اسے کہو، قیدی بننے کے لئے تیار رہے، برتوں کی وادیاں اپنے قیدیوں کو رہائی کا کوئی

موقع نہیں دیتیں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر قاتلانہ مسکرایا تھا اور حمت نے دل ہی دل میں نظر اتاری۔

”لالہ کی مسکراہٹ کتنی ظالمانہ ہے، بھی تو لالہ مسکراتے نہیں۔“

”اور جھہیں پریشان تو نہیں کر رہی، الٹے سیدھے سوال کر کے؟“ اسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔

”نہیں لالہ! مگر اسے افسوس ہے، اتنے ڈپر سوپر ہٹ میں فون کال کی سہولت تک نہیں۔“

حمت نے سادگی سے مہمان لڑکی کا شکوہ ہٹ کے مالک تک پہنچا دیا تھا، صندیر خان کان کھجاتا رہ

گیا، اس نے از خود سارے نکشن ختم کر دئے تھے، حمت بے جا رہی کو کیا معلوم؟

”اس کا شکوہ بجا ہے، بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لئے۔“

”لالہ! اس کے گھر والوں کو اطلاع.....“ اسے اٹھتا دیکھ کر حمت نے سرعت سے یاد دلانے

کی کوشش کرنی چاہی تھی، صندیر خان جاتے جاتے لمحہ بھر کے لئے رک گیا تھا اور پھر پلٹے ہاتھ

سے مسکرایا۔

”یہ اطلاع تو ان پر ادھار ہے۔“

”جی لالہ، میں سمجھی نہیں۔“ حمت ہونٹ ہوئی تھی، صندیر خان سابقہ انداز میں ہی مسکرایا تھا۔

”تم نہیں سمجھ سکتی، اس لئے اپنی سمجھ کو کچھ مت کہو۔“

”جی لالہ۔“ اس نے تابعداری سے سر جھکا دیا تھا۔

”گڈ گرل۔“ صندیر خان ذرا دیر کے لئے مڑ کر اس کی طرف آیا تھا، پھر اس کا سر تھپتھا کر

باہر نکل گیا، جبکہ حمت کی ایسی پذیرائی پر آنکھیں بھگ گئی تھیں۔

وہ صدیوں سے اس عزت، اس محبت کے لئے تڑپتی آئی تھی۔

بنو محل والوں کے پاس سب کچھ تھا، مگر حمت کے لئے دو لفظ محبت کے نہیں تھے اور شاید یہ اس لئے کہ وہ ”جھگوڑی“ ماں کی بیٹی تھی، جھگوڑی عورتوں کے لئے بنو محل میں کوئی جگہ نہیں تھی، آج گلتا تھا، وہ پور پور سیراب ہو گئی ہے، شاید اس خوش نصیب لڑکی کی طفیل اس بد نصیب لڑکی کا نصیب بھی چمکنے والا تھا، حمت پہ شاید وقت بدلنے والا تھا۔

☆☆☆

لمحہ بھر کے لئے نیل برساکت ہوئی تھی اور پھر جانے اسے کیا ہوا، جہاندار کے کشادہ بازوؤں کی پناہوں میں اچانک بلک اٹھی تھی۔

جہاندار اس افتاد پہ تیار نہیں تھا، اچانک گھبرا اٹھا اور پھر بے ساختہ اس کے بال اور شانہ سہلاتا چپ کروانے لگا اور یہ سب قطعاً غیر ارادتا تھا۔

شاید اس کے (سر پرانز) نے نیل بر کو ڈرا دیا تھا، وہ یکا یک کسی موم کی طرح پکھل کر نرم ہو گیا تھا، شاید ماحول کا اثر تھا، یا محبت کا فسون، وہ جذبات کے طلاطم میں بہنے لگا۔

”اے نیل بر! چپ کر جا۔“ اس کی آواز نرم سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

”گلتا ہے سر پرانز کچھ زیادہ ہی خوفناک ہو گیا، مجھے لائٹس آف نہیں کرنا چاہیے تھی، اچھا سوری۔“ اس نے اپنا سر نیل بر کے سر سے ٹکرایا تھا، نیل بر کی سسکاریاں کچھ اور لمبی ہوئیں۔

”ارے، ویسے تو بڑی بہادر اور پختہ خان بنتی ہو، ذرا سے اندھیرے میں ڈر نہیں۔“ جہاندار اس کے رونے پر زچ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

”چپ کر جاؤ یا! آئندہ سے میری توبہ، تمہیں کینڈل لائٹ سر پرانز دوں تو۔“ اس نے نیل بر کے دونوں کان پکڑ کر کہنے کو اس دفع نیل بر بے ساختہ مسکرا دی تھی اور پھر موجودہ پوزیشن دیکھتی کتنی ہی دیر شرمندہ رہی، جہاندار کے بازوؤں کا حصار توڑنا چاہا تو ناکامی ہوئی، اب کہہ ذرا جھنجھلا کر نیل بر نے کہا تھا۔

”تم تو جیسے بہانے کے خنجر تھے، چھوڑ دیجئے۔“ وہ تھوڑا زچ ہوتی ہوئی کسمائی تھی، جہاندار نے گرفت کو ڈرا اور کسا تو وہ بلبلایا اٹھی۔

”جہاندار!“ نیل بر چلائی تھی۔

”آں ہاں، میں تو بہانے کا ہی خنجر تھا۔“ اس نے نیل بر کو جھٹکا دے کر خود سے قریب کر لیا۔

”اب ذرا سن لو میری بھی کہانی۔“ وہ دھیمی بوجھل آواز میں مسکرایا تھا۔

”مجھے تمہارے قریب آنے کے لئے ”بہانوں“ کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا انداز گھمبیر تھا،

دل میں اترتا ہوا، نیل بر کی دھڑکنوں میں بے ربط قسم کا شور اٹھا تھا، وہ گھبرائی، کسمائی۔

”اب اس سر پرانز کا خراج لو گے؟“

”عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔“ اس کا انداز معنی خیز قسم کا ہو گیا۔

”آخر آپ کی سالگرہ کو یاد رکھا اور سیلبرٹ بھی کر دیا۔“ وہ اسے بازو کے حلقے میں تھام کر

باہر لے آیا تھا، اندھیرے میں ڈوبال بال اب روشن تھا۔

دھول گرد سے اٹے ہال کے چھ چھوٹی تپائی پہ ایک حریف دار ایک رکھا تھا، ایک پہ تپاں روشن تھیں، ساتھ کھانے کے لوازمات تھے اور سب سے زیادہ اٹریکٹو گلابوں کا بو کے، نیل بر کی حسین آنکھیں جگمگانے لگی تھیں، اسے خواب کا سا گمان ہوا۔

”یقین نہیں آ رہا؟“ اس کے تاثرات لوٹ کر تا جہاندار نرمی سے مسکرایا تھا۔

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب میں کر رہا ہوں، جو میری پانک میں شامل نہیں، میں وہ بھی کر رہا ہوں، جو میرے منصوبے کا حصہ نہیں تھا۔“ وہ دھیمی آواز میں بولتا ہوا اسے تپائی تک لے آیا تھا۔

”تم نے بھی دھول مٹی سے اٹے ہال میں ایسی شاندار سالگرہ نہیں منائی ہوگی، مگر تمہیں یہ سالگرہ ہمیشہ یاد رہے گی۔“

جہاندار نے چھری اس کے ہاتھ میں پکڑائی تھی اور نیل بر نے اسی کھوئے کھوئے عاتمانہ انداز میں ایک چھری پھیر دی، جہاندار نے سالگرہ کا اتنا خوبصورت نغمہ پڑھا کہ نیل بر ہکا بکا رہ گئی۔

”تو کیا تمہیں سنلک بھی آتی ہے؟“ اس نے اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے بے ساختہ پوچھا تھا۔

”مجھے تو اور بھی بہت کچھ آتا ہے، میرے جو ہر تم پر آہستہ آہستہ کھلیں گے۔“ نیل بر کے ہاتھ سے ایک کا گلاز بردستی لے کر اپنے منہ میں رکھتے ہوئے وہ اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔

ایک کتنے کے بعد جہاندار نے اسے سرخ گلابوں کا گلدستہ دیا تھا، یہ تازہ خوشبو دار گلاب تھے، نہایت میٹھے ہوئے، نیل بر کے اندر باہر گلابوں سا احساس جھٹکنے لگا تھا۔

”یہ گلاب تمہیں کچھ احساس دلائیں گے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بالائی منزل کی طرف جا رہا تھا، ڈھیروں دیوڑھیاں، خالی راہداریاں، سنسان حویلی، اور خالی کمرے۔

مگر نیل بر کے دل میں اس وقت کوئی خوف نہیں تھا، شاید جہاندار کی موجودگی کا اثر تھا، وہ اپنے دل میں ڈھیروں اطمینان اترتا محسوس کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں جہاندار نے رنگ آلود دروازے کی چٹخی گرا کر ایک بند کمرے کا دروازہ کھولا تھا، یہ کمرہ سامان سے بھرا ہوا تھا اور سالوں سے بند ہونے کی وجہ سے عجیب سی بو ایک دم ناک کے نتھنوں میں محسوس آئی تھی، نیل بر کے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگی تھی، وہ ہاتھ میں کولڈ ڈریک کا گلاس پکڑے ایک ہاتھ میں نیل بر کی کلائی تھامے اندر آ گیا۔

یہ کمرہ کبھی ماسٹر بیڈ روم ہوا کرتا تھا، اپنے وقتوں کا بہترین فرنیچر، جالے اور دھول کی وجہ سے اپنی رنگت کھور ہا تھا، کمرے میں کچھ خاص تو نہیں تھا مگر ان تصویروں کے علاوہ، دیواروں پہ لگی بڑی بڑی تصویر۔

ایک نہایت ہی خوبصورت جوان، گھوڑے پہ سوار تھا اور گھوڑے کے پاس کھڑا ایک لڑکا جو یقیناً جہاندار تھا، اور اس کے قریب ہی پتھر پہ بیٹھی چندادیوں جیسی ایک لڑکی، نیل بر کی جی ٹکا ہیں محسوس کرتے ہوئے جہاندار نے اسے بتایا۔

”یہ دودھا ہے، جانتی ہو دودھا کون تھی؟“

جہاندار کے پونچھنے پر نسل بر نے اثبات میں سر ہلایا تھا، دودھا اور فرزند کو اتنا تو وہ جان ہی پکی تھی۔

”تمہاری چچا زاد بہن، گلنار خان کی پہلی بیوی سے اکلوتی اولاد اور صندیر خان کی بچپن کی منگ۔“ وہ اس کی گلی آنکھوں میں جھانکتا زخمی انداز میں مسکرایا تھا۔

”یہ ایک بے جوڑ رشتہ تھا، کہاں دودھا اور کہاں صندیر، دودھا ایک جوان لڑکی اور صندیر لگ بھگ میری عمر کا تھا، لیکن تب بھی اتنا کم سنی میں اسے دودھا پر ”حق ملکیت“ بتانے کا علم تھا، شاید اس لئے کہ تمہارے باپ کی چارہ خانہ برین واشنگ تھی اور دودھا اس وقت اپنی نخیالی وسیع و عریض جاکیر کی اکلوتی وارث، سردار بنو بھی بھی اتنی لمبی جائیداد سے دستبردار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اسی لئے اس نے صندیر خان اور دودھا کو بے جوڑ رشتے میں باندھ دیا تھا، جس پر اور تو کسی نے اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کی تھی مگر آواز دہاں سے بلند ہوئی جہاں سے تمہارے باپ کو امید ہی نہیں تھی، اس بے جوڑ رشتے پر دودھا کی سوتیلی ماں نے آواز اٹھا کر حویلی والوں کو اپنا دشمن بنایا۔“ وہ عورت جانتی ہو کون تھی؟“ جہاندار بولتے ہوئے اپنی خون رنگ نظروں کا زاویہ بدلتا دھیمی آواز میں بولا، نسل بر کا بے ساختہ نفی میں سر ہلا۔

”حمت کی ماں، دودھا کی سوتیلی مگر با اصول ماں، جسے اس فیصلے سے ٹکرانے کے جرم میں روپوش کر دیا گیا۔“

(جاری ہے)

ماہ جولائی کا شمار ”عید فبر“ ہوگا، قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی مصنفین سے ”عید سروے“ کا اہتمام کیا گیا ہے،

عید سروے کے سوالات:-

- ۱۔ آپ کی زندگی میں وہ کون سی اہم ہستی ہے جس سے عید کے دن آپ ملنے کو بے قرار رہتے ہیں؟
  - ۲۔ ہر خوشی کے موقع پر انسانی جذبات اپنی روئین سے ہٹ کر کوئی انوکھی خواہش کرتا ہے، عید کے خوشیوں بھرے تہوار پر آپ کا دل ایسی کون سی خواہش کرتا ہے؟
  - ۳۔ میٹھی عید کے دن آپ کون سی میٹھین دُش بنانا پسند کرتی ہیں؟
  - ۴۔ عید کا چاند دیکھتے ہی کس چیز کا خیال پہلے آتا ہے، شیر خورمہ، بچا سنورنا، یا کسی اہم ہستی سے ملنے کا خیال؟
  - ۵۔ اگر آپ کو عید کا دن اپنی مرضی سے گزارنے کا کہا جائے، تو آپ یہ دن کیسے گزاریں گی اور کس کے ساتھ؟
  - ۶۔ جو دل کا کین ہے اس کے لئے کوئی ایک خوبصورت جملہ یا کوئی شعر؟
- آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان سوالات کے جوابات اٹھارہ جولائی تک مجھوا دیں شکریہ۔

نورِ محرابِ خورشید

تمثیلہ زاہد



تھا۔

”کیا بات ہے ہیرو، اتنا قصہ، کس بات کا ہے؟“ وہ اس کی کتاب بچنے والی حرکت پر ہنستا کر بولا تھا، صبح جب وہ اس کے ساتھ شام کو جانے کا پروگرام طے کر رہا تھا تب تو وہ خاص جوش و خروش میں رہی تھا، اب اچانک اس خراب موڈ کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ حیران ہوا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے منہ پھیرا تھا، اندازاً لے والا تھا۔

”کچھ تو ہے جو اپنے جگری دوست سے چھپا رہے ہو، دیکھ صرف گزن نہیں ہوں تیرا، دوست بھی ہیں ہم اور دوستوں سے کچھ چھپاتے نہیں۔“ وہ اس کو جتلا رہا تھا، جس کی پیشانی پر بے شمار سولہائیں تھیں وہ مستقل پہلو بدل رہا تھا۔

”اچھا پھر دوستی آزمائی جائے دیکھتے ہیں

”آج کا ڈز میری طرف سے ہے چل اٹھ اب تیار ہو بھی جا، سات بج رہے ہیں ٹو بجے سے پہلے گھر واپس پہنچنا ہے ورنہ پتا ہے نہ پڑے ابا کا، راشد اور بلا ل بھی آنے والے ہوں گے۔“ وہ اس کے کمرے میں گھس کر اعلان کر رہا تھا۔

”تم لوگ چلے جاؤ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ کتاب پر جھکا سر اس نے دیر سے سے اٹھا کر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا اور پھر جھکا لیا۔

”او..... پڑھا کو..... پڑھ لینا پھر..... مہینہ پڑا ہے تیرے امتحان میں تجھے دیکھ چار دن بعد پہچہ ہے میرا لیکن نوٹیشن، راوی اپنی زندگی میں چھین ہی چھین لکھتا ہے۔“ وہ دونوں ہانکیں پھیلائے بیڈ پر دراز ہو کر بولا تھا۔

”مجھے نہیں جانا بس۔“ وہ اپنا کانڈ پر چلنا قلم روک کر بند کر چکا تھا، کتاب ایک طرف پٹی تھی، مزید کچھ پڑھا نہیں جا رہا تھا، اس کا لہجہ طعنی

## مکمل ناول



تمہاری دوستی میں کتابم ہے؟“  
 ”ضرور مگر بات تو بتاؤ ہوا کیا ہے؟“ وہ  
 سنجیدگی سے بولا۔  
 ”بس ہے ایک مسئلہ۔“ وہ پھر کہتے کہتے  
 خاموش ہو گیا۔  
 ”آج تک ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا  
 جس کا حل وقار کے پاس نہ ہو، مسئلہ بتا مسئلہ۔“  
 اس نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا لی۔  
 ”تم یہ بتاؤ شادی کرو گے؟“  
 ”ہاں میں..... شادی۔“ وہ حق دق ہو گیا تھا،  
 وہ اسے شادی کرنے کا ایسے مشورہ دے رہا تھا  
 جیسے گلاب جاسن کھانے کو کہہ رہا ہو ”لو میاں  
 گلاب جاسن کھاؤ گے، بہت مزے دار ہے“  
 ”بولو نہ کرو گے شادی۔“ وہ اب اسے  
 جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”مانا کہ تم سے دو برس بڑا ہوں لیکن شادی  
 وادی کی درد سہری چھبیس سال کی عمر میں پالنا  
 سراسر حماقت ہے، نہ کام نہ دھندا، پڑھائی تک  
 مکمل نہیں اور یہ بیٹھے بٹھائے تم کو شادی کی کیا  
 سوچیں؟ یہ مہملات بڑے ابا تک ہی رہنے دو،  
 اپنی پڑھائی پر توجہ دو، ہمارے خاندان کا تو سب  
 سے لائق اور پڑھا کولڑکا ہے کن چکروں میں ڈال  
 رہا ہے۔“ وہ نامحاند انداز میں بول رہا تھا کہ  
 راشد اور بلال اس کے کمرے میں ایک ساتھ  
 داخل ہوئے۔  
 ”تم لوگ جانے کے لئے تیار نہیں  
 ہوئے۔“ وہ دونوں ہی ایک ساتھ بولے۔  
 ”وہی وقار بھائی کیا بات ہے اپنی پاگٹ  
 منی کس خوبی میں جموگی چارہی ہے۔“ راشد کا  
 انداز شریہ وقار کو بھتانے کے لئے کافی تھا۔  
 ”دل چاہ رہا تھا بس تم مفت خوروں کو کچھ  
 کھلانے پلانے کا۔“ وقار چل کر بولا تھا۔

”اچھا ہم مفت خور ہیں جو پچھلے مفتی آکس  
 کریم کھلائی تھی وہ کس شاہ خرچ نے کھلائی تھی۔“  
 راشد نے برا منہ بنا کر جتایا تھا۔  
 ”کن مسئلوں میں الجھ رہے ہو بھائی، اب  
 چلو بھی نو بجے سے پہلے بڑے ابا کے حکم کے  
 مطابق گھر نہ پہنچو تو داخلہ ممنوع ہو جائے گا۔“  
 بلال نے ان سب کو جیسے یاد دلایا تھا۔  
 ”پہلے ان کا مسئلہ تو حل کر دو یہ شادی کر  
 رہے ہیں۔“ وقار نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔  
 ”ذبح ہو جاؤ یہاں سے تم سب، میرا مسئلہ  
 ہے میں خود ہی حل کروں گا سمجھے۔“ وہ زور سے  
 دھاڑا تھا، بسکی کے احساس نے اس کے جذبات کو  
 مجرد کیا تھا، اسے افسوس ہونے لگا کہ وقار کو  
 اسے شریک راز کرنا ہی نہیں چاہیے تھا، وہ کچھ نہ  
 ہی کہتا تو بہتر تھا۔  
 ”معاف کر دے بھائی غلطی ہو گئی، برا نہ  
 مان چل اب چھوڑنا باہر چلتے ہیں۔“ وہ بچ بچ  
 اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اپنی ناداستہ ہونے والی  
 حرکت پر شرمندہ ہو رہا تھا، راشد اور بلال بھی یہ  
 سب حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے، زیان  
 نے وقار کو زور سے دھکا دے کر پیچھے کی طرف  
 دھکیلا تھا۔  
 ”بند کرو اپنا ڈرامہ میں کہیں نہیں جاؤں گا  
 اور تم سب کے ساتھ تو ہرگز نہیں، اب مجھے اکیلا  
 چھوڑ دو اور جاؤ یہاں ہے۔“ وہ ان تینوں کو سرخ  
 آنکھوں سے دیکھتے ہوئے برس رہا تھا، اس کے  
 لفظوں کی شدت کچھ ہونے کا احساس دلا رہی  
 تھیں، وہ ایسا بد مزاج تو ہرگز نہیں تھا، پھر ایسا کیا  
 مسئلہ تھا جو اس کے وجود کو بے بنارہ تھا، وہ تینوں  
 اس کے جھڑکنے کے باوجود اپنی جگہ سے اُس سے  
 مس نہ ہوئے تھے، پورا خاندان ان چاروں کی  
 دوستی کی پچھلی اور ایک دوسرے سے دیوانہ وار



آنکھوں سے کمرے کی شفاف دیواریں دیکھیں  
پھر قالین پر بھی سفید چاندنی پر وہ بیٹھ کر کراہنے  
لگی، کمرے کی ہر شے گریہ زاری کر رہی تھی، وہ  
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اچانک اپنے پیچھے  
آہٹ سن کر چپ ہو گئی، اس کے سر پر کسی نے  
دھیرے سے ہاتھ پھیرا تھا، اس نے مڑ کر دیکھا  
اور پھر اپنا سر جھکا لیا۔

”زویا بیٹا!“ لہجے میں شفقت ہی شفقت  
ٹپک رہی تھی۔

”جی چچا جان!“ وہ کھڑی ہو گئی تھی، گرتے  
ہوئے آنسوؤں کو اس نے اپنے چہرے سے  
صاف کیا تھا، ہتھیلیاں اس کے آنسوؤں سے  
بھگ گئیں تھیں جسے اس نے مسلا۔

”یوں رو رو کر جان ہلکان مت کر دینا،  
ہمت سے کام لو مشکل وقت ہے یہ کہنا آسان ہے  
مگر اللہ کی مصلحت ہم نادان انسان نہیں سمجھ سکتے،  
اپنے والدین کے درجات بلند کرنے کے لئے  
بہت دعاؤں کیا کرو، تمہارے رونے سے انہیں  
تکلیف ہوگی، آہ..... اس حادثے نے تو ہمارا  
سب کچھ چھین لیا، کاش وہ بھی یوں پر دیس نہ  
جاتا، کاش یہ دوری ہمارے درمیان کبھی مائل نہ  
ہوتی، کاش اپنے بھائی سے..... ایک بار مل لیتا  
تو..... یہ کس میری ساری زندگی کا مقدر نہ بنتی،  
کاش.....“ دکھ اور غم کی شدت سے بڑھتا ہوا  
چوہدری تڑپ تڑپ کر رونے لگے، جتنی کو حوصلہ  
دیتے دیتے وہ خود اپنا حوصلہ ہار گئے تھے، دل  
میں چھپی چھپن بار بار جسم کے ساتھ روح کو بھی  
زخمی کر رہی تھی، کھودینے کا احساس ان پر حاوی  
تھا، کمرے میں اب سسکیاں گونج رہی تھیں، چچا  
جتنی کے ساتھ اب کمرے کی دیواریں بھی غم کی  
شدت سے بڑھتا ہوا تھیں۔

☆☆☆

محبت کا گواہ تھا، اس حالت میں اس طرح اسے  
چھوڑ کر جانا ان کے مان میں درزا ڈال سکتا تھا،  
وہ تینوں ایک دوسرے کو پر سوچ نظروں سے دیکھ  
رہے تھے، زبان نے اپنا رخ پھیرا ہوا تھا، راشد  
ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

”کیا وقار بھائی صحیح کہہ رہے ہیں کہ.....“  
راشد نے جبکہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا، وہ  
اب اس کے چہرے کے اترتے چڑھتے سائے  
دیکھ رہا تھا کچھ لمحے یوں ہی خاموشی کی نظر ہو گئے  
وہ سب اب بھی خاموش نظروں سے ایک  
دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ زبان نے اپنا جھکاسر  
اٹھایا پھر بولا۔

”بڑے ابا میری شادی کا اعلان کرنے  
والے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ادا سی تھی، تینوں  
نے ایک دوسرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا  
تھا۔

☆☆☆

بعض اوقات انسان با اختیار ہوتے ہوئے  
بھی بے اختیار ہو جاتا ہے، وہ ہاشور اپنی زندگی کا  
فیصلہ کرنے کا حق رکھنے کے باوجود بے بسی کے  
اس مقام پر اس کا کھڑے ہونا اس کی مجبوری ہی  
تھی، ہائے یہ مجبوریاں، اپنی زندگی کا مالک  
ہوتے ہوئے بھی یوں محکوم ہونا، اس نے بھلا ایسا  
کب سوچا تھا زندگی یوں بدل جائے گی، لوگ  
بدل جائیں گے، اس کا مقام ہاں مقام بھی تو بدل  
گیا ہے۔

ایک خالی خالی سی نگاہ اس کی کمرے کے  
کھلے دروازے پر پڑی، اس کے قدم کمرے کی  
طرف بڑھنے لگے، کھڑکی پر نیٹ کے گلابی  
پردے ہوا کے ہلکے ہلکے جموں کوں سے اڑتے  
ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے، شاید  
اس کی طرح رو رہے ہوں گے، اس نے غم

”کون ہے وہ؟“ راشد نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”صالحہ پھمو کی بیٹی۔“ زیان کا منہ بدستور لٹکا ہوا تھا، تیزیوں اب ہونے والی لنگھو کا مزہ لے رہے تھے، بات ہی ایسی دلچسپ اور عجیب تھی، خاندان میں سب لڑکے ہی لڑکے تھے، کسی صنفِ باز کا ذکر اس نوجوان نولے کے لئے باعث کشش ہی تھا، البتہ وقار کو راشد کا یوں متجسس ہونا زہر لگ رہا تھا، وہ اس معاملے میں سنجیدہ نظر آ رہا تھا، اس لئے بھی کہ عمر میں بڑا تھا۔

”تو کیا ہوا پھر..... برائی کیا ہے؟“ وقار شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

”میں نے سنا ہے کراچی کی لڑکیاں تیز طرار اور خود پسند ہوتی ہیں اور خود اعتماد تو اس قدر ہوتی ہیں کہ لڑکوں کو منٹوں میں بے وقوف بنا لیں۔“ بلال اپنے دوست کی کہی بات یاد کرتے ہوئے بولا، جس کے خاندان کی کئی لڑکیاں کراچی رہتی تھیں اور وہ جب بھی کراچی جاتا کوئی نہ کوئی وہاں سے منسلک مزے دار قصہ بچسارے لے لے کر بتاتا، وہاں لڑکیوں کی آزاد خیالی پر حیران بھی ہوتا۔

”مرد دین مرد، مردوں پر ایسی باتیں نہیں جیسی، گھوڑی کتبی ہی منہ زور کیوں نہ ہو مرد کو لگام دے کر رکھنا چاہیے۔“ وقار کو بلال کی باتوں پر غصہ سا آ گیا تھا، وہ اپنی سوچوں کو ہلکا تاؤ دیتے ہوئے بولا تھا۔

”لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا اور مجھے کسی گھوڑی کو گدھی بنانے میں دلچسپی نہیں ہے اور صالحہ پھمو کی بیٹی ہو یا کوئی اور..... مجھے صرف پڑھنا ہے اور بس پڑھنا ہے۔“ وہ بے زاری سے بولتا ہوا سراپا احتجاج بنا ہوا تھا، اس کی مسکین سی شکل پر وقار کوچ کچ ترس آنے لگا۔

”نہیں کرنا شادی تو انکار کر دو۔“ راشد اسے بچوں کی طرح مچلتے دیکھ کر جل کر بولا تھا، جو مستقل ایک ہی رٹ لگا رہا تھا۔

”بڑے ابا کو انکار..... نہ بابا۔“ زیان نے کانوں کو ہاتھ لگا کر لٹی میں گردن ہلائی، بڑے ابا کی ہاتھ کی چٹری اسے تصور ہی تصور میں اپنی پیٹھ پر برستی دکھائی دے رہی تھی وہ تو ان کے قہر کو سوچ کر ہی بدکنے لگا تھا۔

”کیا بڑے ابا نے تم سے خود بات کی ہے؟“ وقار اب زیان سے پوچھ رہا تھا، اسے اب بھی اس بات کی صداقت پر یقین نہ تھا۔

”نہیں اماں نے آج مجھے بتایا ہے انہوں نے بڑے ابا کو بابا سے بات کرتے ہوئے سنا تھا، وہ بابا کو کراچی جانے سے پہلے کچھ ہدایات دیتے ہوئے یہ بھی بتا رہے تھے کہ ان کا ارادہ اپنی اکلونی نواسی کا رشتہ مجھ سے کرنے کا ارادہ ہے اور وہ یہ اعلان بہت جلد کرنے والے ہیں وہ خود اس خبر سے بے حد پریشان ہیں، بابا نے اماں کو کچھ نہیں بتایا۔“

”لوجی کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔“ راشد نے با آواز بلند کہا۔

”کیا مطلب؟“ بلال چونک کر بولا۔

”پار تائی اماں کو ساتھ کھڑے بندے کی بات تو سمجھ میں نہیں آتی، اگلے کمرے میں ہونے والی باتیں انہوں نے کیسے صاف صاف سن لیں اور یہ بھی ممکن ہے وہ اپنی اکلونی نواسی کے لئے زیان کے بجائے کسی اور کا انتخاب کریں۔“ راشد نے بات کو ایک نیا رخ دیا۔

”جو ہوگا دیکھا جائے گا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے، جو ہوگا خود سامنے آ جائے گا، ابھی تایا جان کی اچانک موت پر بڑے ابا کو شدید صدمہ ہے۔“

دقار نے زیان کا کینہ حاتھ کا اور تسلی دی۔

”لیکن اگر واقعی ایسا ہی ہوا تو بڑے ابا کو تو فیصلہ سنانے کی عادت ہے وہ کب کسی کی رائے طلب کرتے ہیں۔“ زیان کا دماغ پھر منتشر ہونے لگا۔

”اگر ایسا ہوا تو میں بات کروں گا۔“ دقار اب چڑ کر بولا تھا، زیان کی سوئی گھوم بھر کر وہیں انکی ہوئی تھی۔

”سچ میں دقار بھائی۔“ اس کو دقار کی بات سے کچھ ڈھارس ملی۔

”دیے یہ کام دقار بھائی ہی کر سکتے ہیں، ایسی جرأت اور بہادری کسی اور میں کہاں۔“ بلال نے دقار کی غرر طبیعت کو سراہے ہوئے کہا۔

”میں تم بندروں کی طرح بزدل نہیں۔“ دقار نے اب اپنے پھولے سینے کے ساتھ فرضی کارل ہماڑا، اندر سے وہ ان سب کی طرح بڑے ابا سے ڈرتا ہی تھا۔

”دقار بھائی بی اے کے چار سپر پچھلے تین سال سے جو انکے ہوئے ہیں وہ کب بہادری سے دے رہے ہیں۔“ راشد نے اب دقار کی نالائقی کو نشانہ بنایا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل کر اس کی طرف لپکا۔

☆☆☆

ستارا ڈھونڈنا ہے

ستاروں سے بھرے اس آسمان کی وسعتوں میں

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

فلک پر کہکشاں در کہکشاں اک بے کرانی ہے

نہ اس کا نام ہے معلوم، ناں کوئی نشانی ہے

بس اتنا یاد ہے مجھ کو

ازل کی صبح جب سارے ستارے

الوداعی لٹکھو کرتے ہوئے رستوں پہ نکلے تھے

تو اس کی آنکھ میں اک اور تارا جھلک لایا تھا

اسی تارے کی صورت کا

مری بیگنی ہوئی آنکھوں میں بھی اک خواب رہتا ہے

میں اپنے آنسوؤں میں اپنے خوابوں کو سمجھتا ہوں

اور اس کی راہ نکلتا ہوں

سنا ہے گمشدہ چیزیں

جہاں پہ کھوئی جاتی ہیں

وہیں سے مل بھی جاتی ہیں

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

اس شہر کا موسم بہت گرم تھا، سنا تھا یہاں کا

مزاج معتدل ہوتا ہی نہیں ہے یا تو بہت گرم رہتا

ہے یا بہت سرد، وہ اس قدر شدت پسندی کی

عادی نہ تھی، موسم کی یہ شدتیں خود اس کے مزاج پر

اب کیسا اثر چھوڑنے والی ہیں وہ اس سے قطعی

لاطم تھی، اس نے ایک لمبی گہری سانس اس اجنبی

شہر میں لی تھی، چچا جان اس کا سامان ایک گاڑی

میں رکھ رہے تھے، دوسری گاڑی میں اب وہ اور

چچا بیٹھے سفر کر رہے تھے، دونوں کے درمیان

خاموشی تھی ایک گہری خاموشی، وہ شفاف آسمان کو

دیکھ کر کچھ کھو جئے گی۔

”مما جانی آپ میرے نانا کے پاس ملے

کب جائیں گی۔“ آٹھ برس کی تھی زویا اپنا

اسکول کا ہوم ورک کرتے کرتے اچانک سراٹھا

کر کئی دفعہ کا کیا سوال دہراتے ہوئے بولی،

صالحہ کا سبزی کاٹنا ہوا تھا اچانک رک سا گیا،

ماتے پر کئی سلونٹیں ابھر آئیں، آنکھوں میں سرد

مہری اور دکھ کی نمی جھلکنے لگی، یقیناً آج کسی

دوست کے ناماداد جیسے رشتوں سے ملی ہوگی۔

”معلوم نہیں۔“ اس نے سبزی حریہ تیزی

سے کاٹنا شروع کر دی۔

”مما جانی بتائیں نا آپ نانا جانی سے سے

پیار کرتی ہیں نہ اچھا“ اور دادا جی۔“

کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ اچانک بلال سامنے آ گیا جو اس سے بے تکلف انداز میں مخاطب ہو کر اپنا ہاتھ بڑھا رہا تھا وہ کچھ دیر اسے خائف نظروں سے سر سے ہنچر تک دیکھتی رہی، پھر بتا کچھ کہے آگے بڑھ گئی، اس کی ماتھے پر آئی بے شمار سلوٹوں اور آنکھوں میں غلطی دیکھ کر بلال شپٹا گیا تھا، اپنا بڑھا ہوا ہاتھ اس نے شرمندہ سا ہو کر اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا، اسے اب غصہ آ رہا تھا یوں ہی بلا وہ بے تکلف ہونے پر۔

وہ اب سفید چادر میں لپیٹی زویا کو اندرونی دروازے کے اندر داخل ہوتے دیکھ رہا تھا، وہ ابھی بھی صدمے کی کیفیت میں کھڑا تھا کہ عقب سے آئی آواز نے اسے اپنے حواسوں میں آنے پر مجبور کر دیا۔

”ہوئی تھی، بڑا آیا تمیں مار خان، بڑا آیا جھنڈا گاڑنے.....“ راشد اس کی نقل اتارتے ہوئے بول رہا تھا کچھ دیر پہلے وہ چاروں لان میں کھڑے ہو کر گاڑی کو گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھ چکے تھے، بلال جس کا خیال تھا کہ آنے والی لڑکی یقیناً آزاد خیال ہوگی مگر اس کی بے تکلفی دھری کی دھری رہ گئی۔

تینوں اس کے ماتھے پر آئے سینے کو دیکھ کر اب قہقہہ لگا رہے تھے جو اس لڑکی کی سرد مہری سے اس کے ماتھے پر آ رہا تھا، وہ لڑکی ان سب کی امید کے برعکس بی ہو کر گئی تھی، بڑی سی چادر نے ان کے تصور میں آئی جینز اور شرٹ پر بھی پانی پھیر دیا تھا، اس لڑکی میں ایک عجیب سحر تھا جو کوئی آگے بڑھنے کی جسارت نہیں کر رہا تھا، اب راشد حالات کا جائزہ لینے اندر بڑھا۔

”السلام علیکم!“

وہ بچا جان کے ہمراہ کچھ نروس سی کمرے میں داخل ہو کر دھیرے سے بیڈ پر دروازہ آنکھیں

”فضول سوال کر کے مجھے تنگ مت کرو، وہ نہیں ملتا چاہتے ہم سے، اب ماما کو پریشان نہ کرو بیٹا۔“ صالحہ کا نگار بندھنے لگا، وہ اس موضوع سے جتنا دور جاتی زویا اسے کھینچ کر لے آئی وہ اپنی دوستوں سے جڑے قریبی رشتوں کو حیرت سے دیکھتی پھر آگے سوال کرتی وہ اتنا تو جانتی تھی کہ اس کے نانا دادا چچا چچی ہیں، کہاں ہیں؟ وہ کیوں ان سے نہیں ملتے، صالحہ ان سوالوں کے جواب پر بس رونے لگتی اور وہ ہنسم کر چپ ہو جاتی۔

”ماما آپ نہ رو میں میں آپ سے اب نہیں پوچھوں گی۔“ صالحہ نے زویا کی معصومیت پر اپنے زور سے گلے لگا کر پہنچا تھا، وہ بے حد حساس تھی اور اپنی بچی کے احساسات کو یوں روندنا صالحہ کو کئی کئی دن تڑپاتا رہتا، بعض اوقات وہ بستر سے لگ جاتی کئی کئی دن چھت گھورتی رہتی، گاڑی ایک جھیلنے کے ساتھ بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے رکی تھی، اس نے سختی سے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں، وہ خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی، اپنی یاداشت کو ٹوٹا اس کا دل اب بری طرح دھڑک رہا تھا۔

گاڑی آہنی گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی اس نے کرب سے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ وقت اسے سالم نگل جائے گا، اس لمحے وہ محبت اور نفرت کے درمیان کھڑی تھی، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ کیسا دور آیا تھا، جس پر نصیب نے اسے لا کھڑا کیا تھا۔

☆☆☆

”واٹ اے سر پرائز..... آپ سے مل کر خوشی ہوئی..... مجھے بلال چوہدری کہتے ہیں۔“ وہ گاڑی سے اتر کر بچا جان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے لان عبور کر کے اندر روٹی دروازے

موندے بڑے ابا سے بولی تھی، چچا جان نے بڑے ابا کی خراب طبیعت کا راستے میں ہی ذکر کر دیا تھا، وہ آہستہ آہستہ کروٹ لے کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگے تھے، چچا جان نے انہیں آگے بڑھ کر اٹھنے میں مدد دی تھی، زویا کے وجود پر نہ جانے کتنے پتھر دھڑ دھڑ کر کے گرنے لگے تھے، ایک ایک پتھر اسے اتنی ہی تکلیف دے رہے تھے جیسے اس کے وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہا ہو، ہر اعضاء بلبلارہا تھا، سچ رہا تھا شور مچا رہا تھا، یہ وہی بڑے ابا تھے جن کے ذکر پر اس کی ماں ڈھیروں آنسو بہا دیا کرتی تھیں، نہ جانے وہ کون سی بات تھی جس نے ایک باپ کو اس کے بیٹے اور اس کی اولاد سے دور کر دیا تھا، بابا بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے، اس نے بھی اپنے بابا کو پریشان ہوتے نہ دیکھا تھا، لیکن ماں شاید اپنی اولاد کو دیکھ کر رشتوں کی کمی کے احساس تلے کڑھتی رہتی تھیں، لیکن لب سے کچھ نہ کہتی تھیں۔

”ادھر آؤ ہمیں میرے پاس۔“ بڑے ابا نے نقابت سے کہا اور اپنے ہاتھ پھیلائے وہ ان کی حالت دیکھ کر قریب آگئی اور اپنا سر جھکا لیا جس پر انہوں نے اپنے خمیف ہاتھوں سے ہاتھ پھیرا تھا، وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہے تھے۔

”ان ہاتھوں کے لمس کو پانے کی حسرت یقیناً بابا اور ماما کو بھی تو ہونی ہوگی۔“ اس نے نم آنکھوں سے سوچا، یہ وہ لمس ہے جسے پانے کی اسے نہ جانے کتنی حسرت تھی، لیکن اس لمس کو یا کر وہ کسی محبت کی حدت کو محسوس کرنے سے قاصر تھی، ماں باپ کو کھودینے کی محرومی کا احساس ہر احساس پر حاوی ہو رہا تھا، وہ بے حس بنی سر جھکائے کھڑی رہی، چچا جان نے بڑے ابا کو دھیرے سے لٹا دیا تھا، وہ اب اسے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

”ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں آؤ بیٹا تمہیں

تمہارا کمرہ دیکھا دیتا ہوں۔“ وہ کسی رپورٹ لی مانند سر ہلا کر چچا جان کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلی تھی، بڑے سے ہال نما اس کمرے سے باہر نکلنے ہوئے اسے جیسے صدیاں لگ گئیں، قدم من من بھاری ہو رہے تھے، یہ سب اس کے وارث تھے، وہ اپنے وارثوں کے درمیان ہی تو تھی لیکن پھر کیوں خود کو لاوارث محسوس کر رہی تھی، آنکھیں ٹھہرا آنسو سوال کا جواب ناپا کر چھلک کر زمین بوس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نواز علی چوہدری کا تعلق جاگیردارانہ طبقے سے ضرور تھا لیکن دل علم کی شمع سے روشن اور دماغ روایتی شدت پسندی کا شکار تھا، نواز علی کے تین بیٹے فیاض چوہدری، ایاز چوہدری اور ریاض چوہدری تھے، فیاض کی طبیعت بچپن سے ہی غیر ذمہ دارانہ تھی، آٹھویں جماعت میں یہ مشکل پاس ہونے پر نواز علی چوہدری غیض و غضب کا شکار ہو گئے، چھوٹے دونوں بیٹے لائق فائق تھے، لیکن نواز کا دھیان کھیل کود میں ہی لگا رہتا تھا، نواز چوہدری اس کی پیٹھ اپنی چھڑی سے رنگین کر دیتے، کسی کو ان کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہ تھی، پھر وہ اسے لاہور سے کراچی ہوٹل میں داخل کروا کر آگئے، ان کا خیال تھا یہاں کا ڈسپلن اور سخت ماحول فیاض کو پڑھنے کی طرف نہ صرف راغب کر دے گا بلکہ اس کا دھیان کھیل کود سے بھی ہٹ جائے گا، سال میں ایک بار فیاض چینیوں میں ملے آتا تھا، چینیوں کا وہ ایک ہفتہ بھی نواز چوہدری کے سخت پہرہ میں کٹتا تھا، باپ کے لئے فیاض کے دل میں ہمیشہ ایک نفرت کا احساس رہتا تھا، وہ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں تو بہتر ہو گیا لیکن گھر اور ماں باپ بھائی کی دوری نے اسے خندی اور خود مرنا

نکاح کریں گے۔“

وہ صالحہ کے ساتھ کسی ایسی دلی وابستگی میں مبتلا نہ تھا، وہ تو بس اس کی ایک کلاس فیلو تھی، آن کے آن نواز علی کے بدلے توہران کی منتی سوچیں فیاض کو منتی رخ پر سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں، وہ جذباتی انسان نہیں تھا، ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک خاص تھا لیکن بات اب اس کی ضد اور انا کی تھی، جس کو اس کے والدین پھروں تلے روند رہے تھے، وہ اس کی پاکیزہ شخصیت کو داغ دار کر رہے تھے، وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں، عورت کی عزت اور نگریم ان کو اولین ترجیح ہے انہوں نے ایسا کیسے سوچ لیا کہ..... فیاض کی رنگیں تن رنگیں، وہ مزید کچھ اور سے بغیر خاموشی سے اپنے کمرے میں آگیا اور نواز علی اس کی اس خاموشی کو اقرار سمجھ بیٹھے، لیکن وہ اس دے طوفان کا دوسرا رخ نہیں دیکھ رہے تھے، جس کی زد میں پورا خاندان آنے والا تھا، نواز علی نے دوسرے دن بہن کو فون کر کے نکاح کی خواہش کا اظہار کیا، سب ہی اس فیصلے پر بہ خوش راضی ہو گئے، نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں، فیاض کی ماں اس کے بچے خاموشیوں کو دیکھ کر اسے بولنے پہ اکساتی لیکن فیاض نے لہوں پہ نعل ڈال لیا تھا، وہ بتا کچھ کہے اپنے کمرے میں پڑا رہتا، نواز علی کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی، نواز علی کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی، فیاض بھی ماں کو جانتا تھا، جس کا کردار گھر میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا، نواز علی اپنی بیگم کو برابر والی کرسی پر تو بٹھا سکتے تھے لیکن فیصلہ کرنے اور سنانے کا اختیار صرف نواز علی کو حاصل تھا، رائے دینے کا اختیار کسی کو حاصل نہ تھا، اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا، اس لئے سب خاموش تھے، نکاح کا دن بھی آ گیا۔

ڈالا تھا، اب وہ چہٹیوں میں بھی نہیں آتا تھا، وہ کالج سے یونیورسٹی پہنچ گیا، چار سال تک جب وہ گھر نہ آیا تو نواز علی چوہدری خود کراچی آجائیک پہنچ گئے جہاں فیاض چوہدری یونیورسٹی کی کینٹین میں صالحہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا، صنف نازک سے بے تکلفی ان کے خاندان کے اصول و ضوابط کا حصہ نہ تھے، بلکہ یہ تو جرم تھا، ایک قہر آلود نظر کے ساتھ بھری کینٹین میں نواز علی چوہدری نے فیاض چوہدری کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا تھا، اسی طرح وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لاہور لے آئے، مگر آتے ہی اس کی پیٹھ پر نواز علی نے ویسے ہی چمڑی ماری جیسے بچپن میں مارا کرتے تھے۔

”کیوں لائے ہیں مجھے یہاں۔“ وہ خشک لہجے میں بول رہا تھا۔  
”اپنی حد میں رہ کر بات کرو فیاض، کون تھی وہ لڑکی؟“ ان کا لہجہ غضب ناک تھا۔  
”میری کلاس فیلو ہے۔“ وہ مکمل اعتماد سے بولے نواز علی بیٹے کے لہجے پر پھر گئے تھے۔  
”کیا کلاس میں لڑکے نہیں جو ایک لڑکی سے دوستی.....“

”بابا پلیز اس کے بارے میں ایک لفظ نہیں بولے گا وہ ایک شریف لڑکی ہے۔“ فیاض اپنے باپ کی جاگیر دار نہ منتی سوچ سے واقف تھا، خورا بات کاٹ کر بولا۔

”یعنی جس بات کا مجھے شک تھا ادھبہ، کیا حیثیت ہے اس دو ٹکے کی لڑکی کی جو اپنے ماں باپ کی عزت تہمارے ساتھ بھرے بازار میں بیٹھ کر خراب کر رہی ہے، جانتے ہو ہم نے تمہاری نسبت بچپن سے اپنی بہن کی بیٹی سے منسوب کر رکھی ہے، بس اب ختم پڑ جائی گھائی سنبھالو اپنی زمینیں میں کل ہی بات کرتا ہوں ہم تمہارا اسی ہتھے

فیاض کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں، وہ کب کراچی گیا، کیا پڑھ رہا ہے، کب لاہور آیا؟ اس کی باتیں اس کے گھر میں گردش کرتی رہتی تھیں، وہ اپنا پلو تھاے فیاض کے تصور میں ڈوبی محبت کے ان جملوں کو اپنے تصور میں دہرائی رہتی جو آنے والے وقت میں فیاض نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے کہنے تھے، آج اس تیرہ نمبر کی دہن نے اس کے سارے ارمانوں کو دوسوں کی زد میں ڈال دیا تھا، وہ دہن بنی نہ جانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی، اس کے ساتھ آنی سنبھلی بھی اسے دیکھ کر داری صدتے ہو رہی تھی۔

”آج تو فیاض بھائی کی خیر نہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے بولی تو وہ مسکرانے لگی، اس کی گلابی رنگت فیاض کو تصور میں اپنے ہمراہ دیکھ کر اور گلابی ہو گئی تھی، اتنے میں اس کا بھائی اسے لینے آ گیا، وہ خاصا جلت میں آیا تھا، بھائی کی فق رگت دیکھ کر وہ کھسی ضرور تھی لیکن شہیلی کی موجودگی میں کچھ کہہ نہ سکی، اسے تب مزید حیرت ہوئی جب بھائی اسے ہوٹل کے بجائے گھر کی طرف لے جا رہا تھا، گھر پہنچ کر اس نے دیکھا سب ہی کے چہرے بچھے ہوئے ہیں، کچھ ہونے کا احساس اس کے دل کو دہلا رہا تھا، وہ اپنی ماں کی طرف بڑھی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، اس کی ماں نے دکھ کی شدت کے احساس تلے اس کی جھیل سی گہری سوالیہ آنکھوں کی طرف دیکھا تھا جہاں خوابوں کا ایک شہر آباد تھا۔

”چل بیٹا نکاح کو دیر ہو رہی ہے۔“ ماں کے لبوں کی جنبش اور اجنبیت کو وہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہہ نہ سکی اور بھائیوں کے لٹکے چہروں کے درمیان وہ گاڑی میں گھر سے ہوٹل تک کا سفر کرنے لگی۔

وہ تابعداری، فرمانبرداری سے گندمی

”بھائی جی اپنے کمرے میں نہیں یہ خط ہے۔“ اپنا زکھ رہا تھا اور نواز علی کے برابر کھڑی نزہت بیٹیم کو اپنے قدموں تلے زمین سرکتی محسوس ہو رہی تھی، ان کا لرزنا وجود بل کھا کر زمین ہوس ہو گیا، اپنا زماں کو سنبھالنے کے لئے دوڑا تھا اور نواز علی نے اپنا زکھ کے ہاتھ سے گرا خط زمین سے اٹھایا تھا، گرم لہو کی گردش رکوں میں تیز تر ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ دہن بن کر بے حد خوبصورت لگ رہی تھی، جیسے تین نقش پر پارلر والی اسے کئی بار داد دے چکی تھی، آج تیرہ دہنیں پارلر میں تیار ہو رہی تھیں، وہ ان سب سے الگ ہی الگ رہی تھی، اس نے کبھی اپنے چہرے کو سرخی باز ڈر کی زینت نہ بنایا تھا، آج یہ روپ اس لئے بھی انوکھا روپ بن کر اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہا تھا، اس کا نمبر تیرہ تھا، اس تیرہ نمبر کی نموست سے اسے سخت چڑھ گئی، دل تھا کہ دوسے میں ڈوبا جا رہا تھا، پارلر والی کی تعریفیں بھی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں، اس نے سن رکھا تھا تیرہ نمبر کوئی نہ کوئی نموست لے کر آتا ہے اس نے کوشش بھی کی کہ اس کا نمبر جلد آ جائے یا بدل دیا جائے لیکن باری اسے تیرہ نمبر پر ہی ملی، بعض کی ملنی کوششیں بھی بری طرح ناکام ہو جایا کرتی ہیں، اس نے جماعتیں بھی بارہ ہی پڑھ رکھی تھیں، وہ اپنے دو بھائیوں کی اگلیوں لاڈلی بہن بھی چاہتی تو پڑھ سکتی تھی، گھر میں پڑھنے لکھنے کی پابندی بھی نہ تھی، پھر بھی نہ جانے کیوں اسے اس تیز نمبر سے ایسی چڑھ گئی کہ بارہ جماعتیں پڑھنے کے بعد اس کا دل بڑھائی سے اچاٹ ہو گیا، وہ مکمل گھرداری سیکھنے لگی، آخر کو کام ان ہی چیزوں نے آنا تھا، وہ اپنی نسبت کا بھی جانتی تھی، گھر میں اس سے منسوب

طبیعت کی مالک تھی، آنے والے وقت کی طرف  
 ابھی آنکھوں سے دیکھنے لگی، نہ جانے کاتب  
 تقدیر نے اس کی زندگی میں کیا لکھ رکھا تھا، کچھ  
 غلط ہو جانے کا احساس اس پر حاوی ہو رہا تھا اور  
 پھر اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ زندگی خوابوں کا  
 گھر نہیں پتھر کی راہ گزر ہے، ایک شہزادہ اور  
 شہزادی کی کہانی نہیں بلکہ کئی کردار دکھ اور کرب  
 بن کر زندگی میں وارد ہوتے ہیں، بعض مسلط بھی  
 کر دیئے جاتے ہیں، کاتب تقدیر کا فیصلہ ہو چکا  
 تھا۔

”کیا آپ کو ایاز چوہدری ولد نواز علی  
 چوہدری دو لاکھ حق مہر..... سے رشتہ..... قبول  
 ہے..... قبول ہے..... یہ رشتہ..... قبول ہے.....  
 قبول ہے۔“ لفظوں کا تھیرا اس کے گرد تنگ ہوتا  
 جا رہا تھا، لفظ حلق میں گولہ بن کر اٹکے ہوئے تھے  
 وہ گنگ بنی بیٹھی تھی، شورجی راہ تھا، لوگ ہاتھ کر  
 رہے تھے، عجیب و غریب باتیں، وہ سن رہی تھی،  
 لیکن سمجھنے سے دماغ قاصر تھا۔

کاتب تقدیر نے تو فیصلہ بنا دیا تھا، یہ اس کا  
 اپنا فیصلہ تو نہ تھا، قدرت کا فیصلہ تھا، وہ کیسے انکار  
 کرے، ماں باپ کی عزت کیسے اچھالے، اس کا  
 جسم تھرا رہا تھا، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔  
 ”ہاں۔“ اس کی ماں نے جی سی تھی، وہ  
 دونوں ہی اس اقرار پر پلٹ کر رونے لگیں۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے اپنے زوال کی  
 طرف بڑھ رہی تھی، شاید یہ رات کا تیسرا پہر تھا،  
 یہ وہی پہر تھا جس پہلے اٹھ کر زبا اپنے تقویٰ کے  
 راستے کی طرف بڑھنے کی کوشش میں لگے رہے  
 ہیں، تقویٰ کہ جس نے جتنا اختیار کیا عبد کے  
 رستے کو پالیا، پھر مادی شے کے حصول کی خواہش  
 زائل ہونے لگتی ہیں وہ اس پہر اکثر اٹھ جایا کرتی

ہیں، لیکن آج وہ تہجد کے اس پہر اٹھ کر سجدہ کیسے  
 کرے، اس نے تو ساری رات پلکیں جھپکائے  
 بغیر ہی گزار دی، اس پہر سجدہ کرنے کے لئے تو  
 شرط ہے کہ آنکھ لگ جائے چاہے دو بل ہی کی  
 کیوں نہ ہو، لیکن اس کی آنکھ تو کئی ہی نہیں، جھپکی  
 تک نہیں، وہ یہ سجدہ کیسے کرے، اس کی پلکوں  
 تلے ابھی بھی نمی باقی تھی، آنکھوں کے پوٹے جل  
 رہے تھے، آنکھوں کے آگے بس اک بھولا برہ  
 چہرہ یاد آنے لگا تھا، وہ چہرہ جسے دل نے جانے  
 کب سے فراموش کر ڈالا تھا، وہ چہرہ کسی اور شکل  
 میں اب کے سامنے ہر پہل رہنے والا تھا، وہ کیسے  
 وہ ہنر تلاش کرے جسے اپنا کر وہ اپنے کرب کی  
 شدت کو چہرے کی پرتوں میں چھپالے۔

نہجری اذالوں نے اس کے کمرے کے  
 سکوت کو توڑا تھا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوری اذان  
 یکسوئی کے ساتھ سننے کی کوشش کرنے لگی، پھر  
 سرعت کے ساتھ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی،  
 وہ نہجری نماز کا وضو محن میں جا کر پودوں کے  
 درمیان کیا کرتی تھی، وضو کرنے کے بعد اس نے  
 جائے نماز محن میں ہی بچائی یہ وہ مخصوص جگہ ہے  
 جہاں وہ نماز پڑھتی ہے، ہمیشہ اسی ایک جگہ پر نماز  
 پڑھتا اسے عجیب سا سرور عطا کرتا ہے، نماز کے  
 دوران اسے کسی کے ہونے کا احساس محسوس ہوتا  
 رہا لیکن وہ اپنی عمل توجہ اپنی حیات سے ہٹا کر  
 نماز کی طرف لگانے کی سعی کرتی رہی، سلام  
 پھیرنے کے بعد اس نے اپنے عقب میں دیکھا  
 کہ ایک لڑکی اس کے پیچھے کپڑا بچھا کر نماز پڑھ  
 رہی ہے، جائے نماز پر پڑی اپنی بیچ اٹھا کر وہ  
 لڑکی کو بغور دیکھنے لگی جواب اپنی نماز مکمل کر کے  
 سلام پھیر رہی تھی۔

”میرا نام زہرا ہے، آئی ایم سوری، بلا  
 اجازت آپ کے ساتھ نماز پڑھی مجھے نماز پڑھنے



پکانے میں مدد کے لئے ایک خانہ ماں تھیں جو کافی ضعیف لیکن اپنے کام میں پھر تلی نظر آ رہی تھیں، تقریباً ساٹھ سالہ جلیلہ بی اپنی جوانی سے یہاں کھانا پکانے پر مامور تھی، ان کی دونوں بیٹیاں گھر کی صاف صفائی کیا کرتی ہیں، جلیلہ بی گھر کے ہر فرد کی پسندنا پسند سے خوب واقف تھیں، زوہا یہ سب انتہا سے دیکھ رہی تھی، نظروں ہی نظروں میں گھر کے رہن سہن اور افراد کا جائزہ لے رہی تھی اس نے اپنے ماں باپ کے ساتھ اب تک زندگی کا تنہا سفر کیا تھا، دوستوں کے معاملے میں بھی بہت اچھی نہ تھی، اس کے سب ہی کے ساتھ اچھے دوستانہ تعلقات تو ہوا کرتے تھے لیکن کوئی قریبی دوست نہ تھی، وجہ اس کا خود سے ہی لیا دیا والا انداز تھا، وہ زیادہ تعلقات بڑھا کر خود پر کیے جانے والے سوالات سے بچنے کی کوشش کرتی تھی، اپنے خاندان سے متعلق کئی سوالوں کے جوابات سے تو وہ خود نا آشنا تھی۔

ناشتے کی میز پر مرکزی کرسی بڑے ابا کے لئے موجود تھی، وہ ناشتہ میز پر لگاتی جلیلہ بی کو دیکھ رہی تھی، جو اسے خاندان کے افراد کا تعارف کروا رہی تھی، اس نے بتایا کہ اس تین منزلہ گھر کی سب سے اوپر کی منزل پہ بڑے ابا کی بیوہ بہن کا بیٹا وقار کا کمرہ ہے اس سے نیچے کی منزل پر ریاض چوہدری اپنی بیگم اور دو بیٹوں بلال اور راشد کے ساتھ رہتے ہیں اور پہلی منزل پر ایاز چوہدری اور ان کا بیٹا زیان رہتا ہے

”کیا اس گھر میں کوئی لڑکی نہیں؟“ وہ اس ساری گفتگو میں پہلی بار بولی۔

”نہیں جی۔“ جلیلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔  
”اچھا!“ وہ پھر حیران ہوئی ہوئی بولی، حیران ہونا اس کے لئے لازمی امر تھا، کسی لڑکی کا

کے لئے قبلہ رخ کا علم نہیں تھا آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر میں نے یہیں نماز پڑھنی شروع کر دی۔“ وہ عجیب جھجک کا شکار تھی، سامنے بیٹھی عورت خاصی مرحوب کر دینے والی شخصیت کی مالک تھی، اس روشن چہرے والی خاتون کی چمک دار آنکھوں کو خود پر محسوس کر کے عجیب گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی تھی، وہ سیاہ دوپٹے کو اپنے گرد نماز کی طرح لپیٹے بیٹھی بیچ کے دانے گر رہی تھیں۔

”آئندہ نماز کے لئے جائے نماز وہاں سے لے لیتا۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں اور بیچ کے دانے گرائی گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں، ان کے جاتے ہی زوہا کو ایسا لگا جیسے وہ کسی سحر سے آزاد ہوئی ہو، اس نے اب تک اتنی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی، پھر اس نے اشارہ کی ہوئی جگہ کی طرف دیکھا جہاں ایک ریک بنایا گیا تھا، اس پر قرآن اور وضائف کی کتب بھی موجود تھیں، ایک طرف جائے نماز رکھی گئی تھی، بیچ بھی موجود تھی، اس نے قرآن اٹھایا اور وہیں درمی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا، اس بات سے بے خبر کے دو آنکھوں نے اس کو کافی دیر سے اپنے حصار میں لے رکھا تھا، کچھ دیر وہ یونہی بے مقصد کھڑا رہا، زوہا کی بے آواز بلند تلاوت اس کی دھیمی آواز پر ماحول کو سوز بخش رہی تھی، وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک گہری سانس لینے لگا پھر اپنے لبوں پر دھیمی مسکان سجائے پلٹ کر بیڑھیاں عبور کرنے لگا اس کا دل ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

یہ یہاں کا دستور تھا کہ دسترخوان ایک ہی لگتا تھا جہاں خاندان کے سب ہی افراد مل کر کھانا کھاتے تھے اور پھر زندگی کے معمولات میں شامل ہو جاتے تھے، ڈائننگ ہال کی لمبی چوڑی ہجر کے آگے سامنے بیٹیں کرسیاں تھیں کھانے

ماحول میں پتھر پھینک کر مطمئن انداز میں بیٹھی  
 بڑے ابا کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی، جہاں  
 تھوڑی دیر کے لئے ماتھے پر سلونیس ابھر آئی تھیں،  
 اتنی جرات..... خیر زدہ لوگ کبھی زدہ اور کبھی  
 بڑے ابا کی اب اشتعال بھری آواز کو سننے کے  
 انتظار میں تھے۔

بڑے ابا اب تیز نظروں سے زدہ اور اس  
 کے آگے رکھی خالی پلیٹ کو گھور رہے تھے، ماحول  
 عجیب تاؤ کا شکار ہو گیا۔

”جیلہ لی..... یہاں کیوں کھڑی ہو.....  
 لے کر آؤ۔“ اور جیلہ لی دوڑی کچن میں گئیں  
 تھیں، بڑے ابا نے ایک نظر پھر زدہ کی طرف  
 دیکھا تھا لیکن ان کی نظروں میں نہ جلال تھا نہ  
 اشتعال، بس ایک شفقت تھی، محبت تھی۔

☆☆☆

اس کا کمرہ بڑے ابا کے عین سامنے تھا،  
 ڈاکٹر نے انہیں ڈپریشن کی دوائیاں تجویز کر رکھی  
 تھیں، بیٹے کی موت کے غم نے ان کے پہاڑ  
 جیسے وجود کو ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا، زدہ ہا ہا لکل اپنے  
 باپ کا پر تھی، وہی نین تھیں، وہی گول چہرہ، وہی  
 ضد، وہی اپنی بات منوانے کے انوکھے طریقے،  
 ہاں یہ وہی زدہ ہی تو ہے، فیاض چوہدری کی  
 اکلوتی بیٹی۔

دروازے پر ناک ہوئی تھی اور نواز علی اپنی  
 سوچوں کے دائروں سے نکل کر دروازے کی  
 جانب متوجہ ہوئے تھے، کمرے کے اندر زدہ  
 داخل ہوئی تھی، وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے قریب  
 بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتی ہوں،  
 آپ میرا ایڈمیشن پنجاب یونیورسٹی میں کروا  
 دیں۔“ وہ بے جھجک بول رہی تھی، وہی خود  
 اعتمادی، نواز علی کی آنکھیں بھرنے لگیں، زدہ کی

نہ ہونا اس کی یہاں موجودگی کو مزید مضبوط انداز میں  
 رہنے کا الارم دے رہا تھا، اسے صبح روشن سپید  
 چہرے والی خاتون سیاہ دوپٹے میں لپی یاد آ رہی  
 تھیں، جن کی آنکھوں میں عجیب کرختگی اور بے  
 گمانگی تھی، یہی وہ کرختگی تھی جو اسے کچھ کہنے میں  
 مجبوت کر رہی تھی، شاید مردوں میں وہ کر  
 مردوں کو پال کر یہاں کی عورتوں کی فطرت بھی  
 مردوں سے مشابہت رکھنے لگی تھی، ورنہ عورت کی  
 تو فطرت ہی قدرت نے حلیم اور طبع سے پارک  
 رکھی ہے، اسے جیلہ لی ہی ایک خاتون باتولی نظر  
 آ رہی تھیں جو اسے اب یہاں کے لوگوں کے  
 اٹھنے بیٹھنے جانے سونے کھانے پینے اور بڑے ابا  
 کے اصول و ضوابط سمجھا رہی تھیں، ناشتہ ٹھیک آٹھ  
 بجے شروع ہو جاتا تھا، ابھی آٹھ بجنے میں دس  
 منٹ باقی تھے، آہستہ آہستہ گھر کے افراد ڈائیننگ  
 ہال میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے، بڑے ابا اپنی  
 وکیل چیئر پر طبیعت کی تاسازی کے باوجود پر  
 آئے تھے، اس کی دونوں چپاں بھی خاموشی سے  
 اپنی کرسیوں پر براجمان ہو گئیں تھیں۔

”دھی رانی دیکھنا ناشتے پر بس پلیٹ جج اور  
 گلاس کی آوازیں آئیں گی، سرکشی بھی اٹھنا  
 ممنوع ہے بڑے ابا کے سامنے۔“

اس کے کانوں میں جیلہ لی کی کچھ دیر پہلے  
 ہونے والی باتیں گونجیں وہ مسکرا کر رہ گئی، گھر کے  
 سب ہی افراد اپنی اپنی پلیٹوں پر جھکے ناشتہ کرنے  
 میں مصروف تھے کھانے پینے کے دوران کھنگو نہ  
 کرنے کی سخت تاکید بڑے ابا کی نظر آ رہی تھی،  
 یہ وہ قانون تھے جو بڑے ابا نے اس گھر پر لاگو کر  
 رکھے تھے اور وہ ٹھہری قانون تھیں۔

”میں املت نہیں کھاؤں گی مجھے بوائے  
 انڈہ چاہیے۔“ جیلہ لی نے پھر تھرکانتی نظروں  
 سے زدہ کی طرف دیکھا جو اس سکوت بھرے

فصل فیاض چو ہداری سے ہے انتہا مماثلت رکھتی  
تھی، کشادہ پیشانی پر دو روشن آنکھوں کے پیچھے  
جیسے فیاض چمپا بیٹھا تھا یوں لگتا تھا جیسے انہی  
اچانک وہ آئے گا اور سب کو حیران کر دے گا،  
بڑے ابا نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں پھر  
دوبارہ کھولیں سامنے زدہ بان کی کیفیت کو حیران  
نظروں سے دیکھ رہی تھی، وہ رونے چاہتے تھے اور  
بہت جیج، جیج کر رونا چاہتے تھے کیا پتھر بھی  
روتے ہیں؟

”بابا اب میں واپس نہیں آؤں گا، بابا آئی  
مس یو، زندگی میں بہت سی باتیں کونین کی گولی  
کی طرح کڑوی اور کٹی ہوئی ہیں، محبت اگر ہو تو  
انہیں لگنا آ ہی جاتا ہے، محبت اگر نہ ہو تو، بابا  
آپ کو مجھ سے محبت ہے نہ، مجھے بھی آپ سے  
محبت ہے۔“ وہ خاموشی سے کمرے کی کڑکی سے  
نظر آنے والے آسمان کو گھور رہے تھے، پھر انہیں  
زور سے کھانسی کا دورہ اٹھا، زدہ بان نے گھبرا کر  
کمرے سے باہر مدد طلب کی، وہ بہت شدید  
انداز میں کھانسی کر لوٹ پھوٹ ہو رہے تھے،  
راشد اور بلال، زدہ بان کی آواز پر دوڑے دوڑے  
آئے اور بڑے ابا کو سنبالا، بلال ڈاکٹر کا نمبر  
ملانے لگا۔

☆☆☆

”کیا ہو جاتا اگر میں صنف نازک نہ ہوتی،  
ہزار پابندیوں اور روتاؤں میں جکڑی عورت کے  
مقدور میں صرف تکلیف جھیلنا اور سہنا ہی لکھا ہے،  
گردن جھکی ہو اور ہاتھ کام میں ہوں بس یہی  
مقدور ہے اور انہیں دیکھو، کیسے مزے سے بڑے  
ابا نے ہر چیز کی جھوٹ دے رکھی ہے۔“ سارہ  
بیگم اپنی جھٹانی کے ہمراہ موئے فریم کے چشمے  
کے پیچھے اپنی گول گول آنکھیں گھما کر زدہ بان کو  
یونیورسٹی کے لئے جاتا دیکھ رہی تھیں، سارہ بیگم

بھی حسرت سے زدہ بان کو دیکھ رہی تھیں جس کے گھر  
میں آتے ہی گھر کی روایتی اقتداروں میں دراڑ  
پڑی تھی، وہ لڑکی تھی لیکن بزدل نہ تھی، اس کی خود  
اعتمادی سارہ بیگم کو جلاپے میں جلا کر گئی تھی، وہ  
خود ذاتی طور پر ڈر پوک اور دیوی عورت تھیں، مگر  
کی سب سے چھوٹی بہو اور ریاض چوہدری کی  
بیوی تھیں۔

”ممکن لسی بن گئی ہے تو بڑے ابا جی کو دے  
آؤ۔“ وہ دیورانی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے  
بولیں، زدہ بان دونوں کی طرف الوداعی نظروں  
سے دیکھتے ہوئے سرخم کر کے سلام کا اشارہ کیا تو  
جواباً ان دونوں نے بھی اپنا سر ہلا دیا، وہ ایاز  
چوہدری کے ہمراہ اپنا بیگ کندھے پر ڈالے سفید  
چادر میں لمبوس نظریں نیچے کئے آگئے کو بڑھ گئی  
سارہ بیگم کی نظریں دور تک تعاقب کرتی رہیں۔

”ایاز بھائی نے تو لگتا ہے بیٹی کی مثل ذمہ  
داری اپنے سر لے لی ہے۔“ وہ اب اپنی جھٹانی  
سے راز درانہ لہجے میں بولی تو ہلٹ کر وہ انہیں  
تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگیں، سارہ بیگم  
خفیف سی ہل کر لسی سے بھرا جگ اٹھا کر بچن کی  
جانب بڑھ گئیں، بیگم ایاز دیورانی کی پنجس  
فطرت سے واقف تھیں، وہ ایسی ہر کوشش ناکام  
بنا دینا چاہتی تھیں جو ان کی یا ان کے شوہر کی  
ذات کی طرف اٹھے، وہ بے وقوف ہرگز نہ تھی بیگم  
وادراک رکھتی تھیں، ان کا چہرہ دیورانی کی بات پر  
قدرے تپ سا گیا تھا جب ہی وہ منظر سے غائب  
ہو گئی تھیں، سارہ بیگم اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ  
جھٹانی کو آسانی سے کمزور نہیں بنا سکتیں، لیکن  
چوٹ کرنے کی عادت سے باز نہ آئی کہیں نہ کہیں  
کوئی نہ کوئی جملہ ضرور ایسا اجمال دیتیں جو بیگم  
ایاز کے لئے باعث آزار بن جاتا وہ تو اسی جلن کا  
شکار تھیں کہ ان کے مقابلے میں بیگم ایاز کو زیادہ

”بس ٹھیک اچھا اور دوست وغیرہ کتنی بنا  
ڈالیں؟“  
”میں دوست نہیں بناتی۔“  
”کیا آپ اتنی خوفناک ہیں۔“  
”جی۔“

لڑکیوں کو شاید اسی لئے رحمت کہا گیا ہے،  
جہاں جاتی ہیں رنگ بکیر دیتی ہیں، وہ ایک  
ترجمی نظر اس کے سفید چہرے پر ڈال کر  
ڈرائیونگ میں مصروف تھا جس کی پیشانی تک  
سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی، ہادلوں میں مجھے  
اس چاند پر اس نے کیسی کیسی قاس آرائیاں کر  
رہی تھیں، وہ خود پر ہی طنز کر کے مسکرانے لگا اس  
کے شوش لہجے کے آگے وہ پھر کچھ نہ بول سکا۔

☆☆☆

کاش آپ اس دن اس لڑکی کو دو ٹکے کی  
کہہ کر میری غیرت اور عزت کے ٹکڑے ٹکڑے کر  
کرتے تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔

سوال میری غیرت کا بن گیا تھا بابا، میں  
نے اسی لمحے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس خاندان  
کی عزت اب اس لڑکی کو ہی بناؤں گا جس کی  
عزت کو آپ کے لفظوں نے داغ دار کر کے میری  
غیرت نفس کو بھی پھل ڈالا تھا، میں اس لڑکی سے  
شادی ہرگز نہیں کر سکتا جو میری زندگی میں زبردستی  
میری مرضی کے بغیر شامل ہو، صالحہ ایک اچھی  
سنبھلی اور سید گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، اس کی  
والدہ حیات نہیں اس کی خالہ نے ہی اسے پالا  
ہے، کراچی آنے کے بعد میں نے بہت سوچ سمجھ  
کر صالحہ کے گھر کا رخ کیا تھا اور اس کے والد  
سے رشتے کی بات کی جسے سن کر وہ بہت براہم  
ہوئے مجھے کافی برا بھلا کہہ کر گھر سے چلے جانے  
کو کہا، وہ سید تھے اور غیر سید میں شادی نہیں  
کرتے اور ان حالات میں یوں اکیلے لڑکے کو

اہمیت دی جاتی ہے، یہ اہمیت کب جلاپے میں  
بدلی اندازہ ہی نہ ہوا، چھوٹی بہو ہونے کے ناطے  
ناز غرے کی معنی سارہ بیگم اکثر جھٹانی سے خار  
ضرور رکھتیں لیکن ظاہر نہ کر سکتیں، البتہ ان لہجہ اس  
بات کا غماز ہی ہوتا کہ وہ جھٹانی کو دی جانے والی  
اہمیت سے سخت جملن وحسد میں مبتلا ہیں، دونوں  
کے درمیان روایتی دیورانی جیشٹانی والا حساب  
چلتا۔

☆☆☆

بارش یوں اچانک شروع ہو جائے گی اس  
کے وہم و گمان میں نہ تھا، موسلا دھار بارش، ٹپ  
ٹپ ٹپ۔

گھر سے نکلنے وقت تو آسمان صاف تھا، شہر  
انجان تھا، وہ یہاں کے موسموں سے بھی نا آشنا  
تھی، آج یونیورسٹی میں اس کا تیسرا دن تھا، وہ تو  
کسی کو یہاں جانتی نہ تھی، بڑے ابا نے دین لگوا  
دی تھی واپسی کے لئے، مگر آج دین شاید موسم کی  
خرابی کی بنا پر نہیں آئی تھی، وہ بس اسٹاپ پر ہوتی  
بنی کھڑی تھی، گھر سے تو کیا کرے کی کٹکٹس میں  
اسے کسی نے آواز دی۔

”پلیس امی نے مجھے بھیجا ہے آج دین نہیں  
آئے گی۔“ زیاں رحمت کا فرشتہ بن کر اس کے  
سامنے کھڑا تھا، برستی بوندوں سے بچنے کی خاطر وہ  
اپنے ہمراہ چھتری لانے کی عکھندی بھی کر گیا تھا،  
چھتری اسے تھا کر وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا  
اشارہ کر رہا تھا، وہ تیز قدم اٹھاتی گاڑی میں بیٹھ  
چکی تھی۔

”کیسی رہی کلاس؟“ دس منٹ کی طویل  
خاموشی کے بعد ڈرائیونگ کرتے زیاں نے  
بالآخر اخلا تا پوچھ ہی لیا۔  
”ٹھیک۔“ اس کی نگاہ گیلی سڑک پر دوڑتی  
گاڑیوں پر مرکوز تھی۔

”بابا! کیا آپ اپنی پوتی کی شکل نہیں دیکھیں گے، کہیں ایسا نہ ہو میری آس کے ساتھ ساتھ میری سانس بھی لوٹ جائے۔“

”زہا!“ قہر قہراتے لبوں نے بہت آہستہ پکارا تھا، اس پکار میں وہ شکستھی جو آج آکس برس بعد وہ محسوس کر رہے تھے، کس قہر سے انہوں نے بیٹے کا یہ خط اپنی ان کے بت تلے روند ڈالا تھا، ان کی بیوی اس غم میں چلی بسی، کہ سب کچھ بھلا کر وہ بیٹے بھوکو گھر لے آئیں لیکن نواز علی کا فیصلہ اٹل تھا کہ وہ اب بیٹے سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے، آج آکس برس بعد انہیں بیٹے بھوکے حادثے میں جان بحق ہو جانے کی اطلاع ملی یہ بھی پتا چلا کہ ان کے بیٹے کی اولاد کا اب کوئی وارث نہ خیال میں نہ بچا تھا، صالحہ کی خالہ نے ہی فون پر اس حادثے کی خبر دی اور زہا کی ذمہ داری اٹھانے کی درخواست بھی وہ کسی بھی بات کو رد نہ کر سکے، نہ جانے کیوں، نواز علی نے اپنا دل تمام کر لیا زہا کو فوراً کراچی روانہ ہونے کا حکم دیا، انہیں دل کا دورہ پڑا تھا، وہ کچھ دن ایسے بستر پر بڑے کراٹھنے کی ہمت ان کی کمر توڑ دیتی، یادوں کی دھوپ میں تنہا سفر کرتی ان کی آنکھیں شل ہونے لگیں تھیں، بیٹے کی موت نے ان کی انا کے بت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا، زہا کی شکل میں ان کا فیاض گھر لوٹا تھا وہ اب کسی صورت اسے واپس جانے کی اجازت نہیں دے سکتے ہیں، نواز علی نے خط کو کھپکپاتے ہاتھوں سے اپنی ڈائری میں واپس رکھا تھا۔

☆☆☆

زہا نے جیسے ہی ڈرائیج روم میں قدم رکھا اس کے قدم زمین نے وہیں جکڑ لئے، وہاں پر موجود راشد، بلال کی بات پر بلند قہقہہ لگا رہے تھے، میز پر پھلوں کی ٹوکری اور کیلے سبب کے چھلکے

لڑکی دے دینا تو سخت تو بہن کی بات تھی، میں اپنے دل کا کیا کرتا جو ایک فیصلہ کر کے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا، میں آپ ہی کا بیٹا ہوں نہ بابا۔ آپ کو بھی تو فیصلہ کرنے کی عادت ہے، کسی بھی رد عمل کے اچھے یا برے ہونے کی پرواہ کیے بغیر، میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں بابا، ہے نہ، میں کیسے پیچھے ہٹ جاتا، صالحہ میرے اظہار محبت کے آگے اور اس رشتے کو کوئی نام دینے کے لئے تیار نہ تھی، وہ اپنے والد کے فیصلے کے خلاف نہیں جانا چاہتی تھی، اس کی خالہ یونیورسٹی میں ہی پڑھاتی تھیں اور میرے اطوار سے واقف تھیں، میں نے اپنا عندیہ، ان کے آگے رکھا وہ فوراً مان گئیں، میری ضد کے آگے صالحہ بھی مجبور ہو گئی شاید وہ دل سے تو مجھے پسند کرتی تھی لیکن دنیا کے ڈر سے زبان سے کچھ کہنے سے ڈرتی تھی، اس کی خالہ نے ہماری شادی میں بہت مدد کی، وہ خود خاندان سے باہر رشتے نہ کئے جانے کی رسم کے خلاف تھیں، اس رسم کو توڑنے کی خاطر انہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔

”بابا! ہم نے نکاح کر لیا ہے اور صالحہ خالہ کے دیئے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے ہیں جو انہوں نے شادی کا گفٹ ہمیں دیا ہے بابا! آج میں بہت خوش ہوں، اللہ نے مجھے رحمت سے نواز کر میری زندگی مکمل کر دی ہے، لیکن میں آپ کی شدید کی محسوس کر رہا ہوں، آپ کی پوتی زہا کا نام امی کی پسند سے رکھ رہا ہوں، امی نے اس دنیا سے جاتے ہوئے مجھے معاف کر دیا پلیز آپ بھی مجھے معاف کر دیں، میں نے اپنا ایڈریس اس خط میں آخر میں لکھ دیا ہے اس امید پر میری نگاہ دروازے پر جمی رہے گی کہ آپ میری خاطر نہ سہی اپنی پوتی کی خاطر ضرور مجھ سے ملنے آئیں گے۔“

دقار نے رائے دی۔

”دال کالی پھلی ہو یا پھلی، چڑھتے سورج کی خبر سب کو ہو ہی جانی ہے۔“ راشد نے معنی خیز لہجے میں کہا تو دقار مسکرائے لگا۔

”تمہیں بڑا تجربہ ہے کیا موسمیات کا موضوع پڑھنے لگے ہو۔“ دقار استہزائیہ انداز میں بولا تھا۔

”ہاں تو اور کیا دیکھ لینا علم موسمیات کے مطابق زبان صاحب جوکل پرسوں مکن گرج کے ساتھ برس رہے تھے اب ان کے چہرے کا مطلع صاف ہے ہلکی دھوپ چھاؤں کے واضح آثار نظر آرہے ہیں۔“ راشد باقاعدہ خبرنامہ کے انداز میں بول رہا تھا سب ہی کے تہقہ بلند ہو گئے۔

☆☆☆

”دقار کہاں ہو بجٹی جلدی آؤ۔“ سارہ بیگم نے دور سے آواز دی تو دقار چونک کر اٹھا یقیناً اس سے کوئی کام تھا اس کی طویل قامت اور قوی وجود کی وجہ سے اکثر و بیشتر ہماری بھر کم کام دقار کے سپرد کئے جاتے، رمضان کی آمد میں ایک ماہ باقی تھا اور گھر کی صفائی ستھرائی کی ضروریات ہو چکی تھی اب دقار کی آوازیں ہی آتی تھیں، چیزوں کی ترتیب بھی اسی سے ہی کروائی جاتی تھی، آج سارہ بیگم نے اپنے کمرے کا سامان صبح سے بے ترتیب کر رکھا تھا، انہیں شنگ تبدیل کروانے میں دقار کی مدد درکار تھی، بلال اور راشد دونوں اوپر تلے کے تھے، ان کے قد کاٹھ سارہ بیگم کی طرح ہی نازل اور جسم نحیف سا تھا، بلال تو ایک کرسی اٹھا کر ہلکان ہو جاتا تھا، وہ جھنجھلا کر دقار ہی کی مدد طلب کرتی تھیں۔

”دقار بھائی امی بلار ہی ہیں آج ہمارے کمروں کی شامت آئی ہوئی ہے صبح سے دھول مٹی اور جھاڑ پونچھ کا کام جاری ہے۔“ بلال نے دقار

بکھرے ہوئے تھے، زبان اور دقار قالمیں پر چوڑی مار کر بلا تکلف بیٹھے ہوئے تھے، زوہا کو یوں اچانک داخل ہوتے دیکھ کر چاروں نے ہوتی بن کر اپنی ہنسی کو پرک ماری تھی، وہ حق دق ایسے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے جیسے کمرے میں کوئی انسان نہیں غلامی مخلوق نے قدم رکھ دیا تھا۔

زوہا کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا تھا، اسے ہرگز ان چاروں کی موجودگی کا اندازہ نہ تھا ورنہ وہ یہاں کار خ نہ کرتی۔

”کچھ کتابیں چاہئے ہیں بازار سے اگر کوئی لا دے تو۔“ چاروں کے چہرے اپنی جگہ کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔

”ہائیڈولوجی کی کتابیں ہیں۔“ وہ ہاتھ میں پرچی لئے بولی، چاروں اب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”میں لے آتا ہوں۔“ زبان نے آگے بڑھ کر زوہا کے ہاتھ سے پرچی لے لی۔

”اوکے میں چلتی ہوں۔“ وہ ساٹ لہجے میں بول کر ڈرائیونگ روم سے باہر نکل گئی، اس کے پیچھے اب دبا دبا سا شور اٹھا تھا۔

”بڑا کمینہ نکلا اس کا خیر میں بھی خود ہی آگے بڑھ گیا۔“ بلال جل کر بولا۔

”سہیل Bio Bk ایک لے پھر کار خیر میں حصہ ڈالنے کا سوچتا۔“ زبان نے چیتے لہجے میں کہا تو بلال نے آنکھیں گھما ڈالیں، زبان پرچی جیب میں ڈالے آگے بڑھ گیا۔

”چلو جی کزن سے بات کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا زبان صاحب کے پاس۔“

”یہ دق زبان ہیں جوکل تک موصوفہ کی موجودگی سے ہی ہلکان ہو رہے تھے، مجھے تو دال میں کچھ کا لا نظر آ رہا ہے۔“ بلال کی بات سن کر

کی طرف بے چارگی کی نظر سے دیکھا، بلال کی بات سن کر وہ کندھے اچکا تا باہر کی جانب دوڑا تھا، کیونکہ اب اس کا دی جانے والی آواز اور اونچی سنائی دی تھی، یہ خطرے کا الارم تھا سارہ بیگم کی غصے بھری آواز جو ایک آواز میں نہیں سننے پر دوبارہ اشتعال بھرے انداز میں آئی تھی۔

☆☆☆

زودہانے اپنے کمرے میں رکھی ان کتابوں کو مسکرا کر دیکھا جن کی اسے اپنے اسائنمنٹ کی تیاری میں مدد کے لئے اشد ضرورت تھی، اس نے اپنی مکمل توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کر لی تھی، وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے والدین کا خواب مکمل کرنا چاہتی تھی، جہاں کسی حد تک وہ ایڈجسٹ ہو گئی تھی، ماحول میں رچ بس جانے والی فطرت نے اسے یہاں پریشان نہیں ہونے دیا، دوپہر کا وقت گرمی کی شدت آج کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی سب ہی اپنے اپنے کمروں میں موجود تھے، وہ ٹھنڈا پانی پینے کی غرض سے کمرے سے باہر آئی کچن کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدم رک گئے، کچن سے تیز آوازیں آ رہی تھیں۔

”میں زبیاں کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی ہوں، آپ سے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن آپ نے نال دیا، اب یہ مسئلہ مجھے زبیاں نے بتایا تھا جب آپ نے کراچی جاتے وقت ابا جی سے بات کی تھی، زبیاں کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ اس سے بڑے وقار ہے اور یہ شادی وہ ابھی نہیں کرنا چاہتا پڑھنا چاہتا ہے۔“ بیگم ایاز کا لہجہ تیز ضرور تھا لیکن وہ رसान انداز میں شوہر کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں جو حد درجہ فکرمند اور بے بس تھے۔

”بابا نے فیصلہ نہیں کیا، صرف رائے طلب

کی ہے، وہ زبیاں اور زودہا کی مرضی معلوم کر کے ہی فیصلہ کریں گے، فیاض بھائی کی موت نے انہیں توڑ دیا ہے، وہ پہلے جیسے نہیں رہے، یہ ان کی ذاتی خواہش ہے کہ زودہا اس گھر کی ہی بیوہ بنے، زبیاں کا انتخاب انہوں نے اس لئے کیا ہے کہ وہ وقار اور بانی سب میں زیادہ ذہین اور پڑھنے لکھنے میں تیز ہے، زودہا جیسی قابل ذہین لڑکی کے ساتھ اس کا جوڑ مناسب رہے گا، اگر زبیاں راضی نہیں تو میں بابا سے بات کرتا ہوں، مگر تم پھر سوچ لو۔“ وہ دھیسے لہجے میں بولے ان کے لہجے میں معنوی خفگی بھی تھی جو زبیاں کے انکار کا سن کر ان کے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔

”جی بہتر۔“

اس کے قدم واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئے، وہ منہ پر ہاتھ رکھے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر ڈھسے لگی اور اپنے عینے سے لیٹ کر سوتے لگی، نہ جانے یونہی کتنا ہی وقت گزر گیا، وہ خاموشی سے اپنے بستر پر پڑی چھت کھور رہی تھی، کیا اس کے نصیب میں دھوپ میں جلنا ہی لکھا ہے، کمرے میں اسے اب شدید دھشت ہونے لگی تھی، ٹھن کے احساس تلے اس نے گھڑی کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ پانچ بجنے کا اعلان کر رہی تھی، شدید پیاس سے اس کا حلق اب سوکھ رہا تھا، وہ کچن میں مرے مرے قدموں سے گئی جہاں اب کوئی نہیں تھا، کچھ دیر پہلے ہونے والی سرگوشیاں پھر سے اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

اس نے ٹھنڈے پانی سے حلق کو تر کیا پھر بیرونی دروازہ کھول کر لان کی طرف آگئی، بڑے سے لان پر چھائی دھوپ ڈھل رہی تھی، ہوا بند تھی، درختوں کے پتے سجدے میں گرے ہوئے تھے، جس زدہ ماحول اس کے اندر ہی نہیں باہر بھی

جھایا ہوا تھا، وہ آم کے درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی، کچی کچی کیریاں درخت کی اونچی شاخوں پر لٹکی ہوئی تھیں، وہ سراونچا کر کے دیکھنے لگی کہ اس کے عقب سے آواز آئی۔

”کیا کیری کھانے کا دل چاہ رہا ہے، کہیں تو توڑ دوں۔“ زبان شوخی سے، ہم کلام ہو رہا تھا وہ اسے یہاں ہلکا دھچکے کرا گیا تھا۔

”جی نہیں۔“ وہ سرد لہجے میں بولی۔

”جی نہیں..... جی ہاں..... آپ کو اس کے علاوہ کچھ بولنا نہیں آتا۔“

”شکریہ..... کس بات کا؟“ وہ منہ بگاڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”لوجی، اتنی خواری کے بعد آپ کی مطلوبہ کتابیں لے کر آیا تھا اور آپ ہیں کہ ایک لفظ شکریہ کا نہیں کہا۔“ وہ اب غلے خشوے پر اتر آیا مصنوعی ہنسی سے بولا۔

”او سوری..... شکریہ۔“ اسے یاد آیا تو شرمندہ ہو کر بولی۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ اس کے نرم لہجے پر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

”مجھے وہ کتابیں لائبریری سے نہیں مل رہی تھیں اس لئے آپ کو تکلیف دی۔“

”کوئی بات نہیں آپ آئندہ بھی مجھے بے خوشی یہ تکلیف دے سکتی ہیں چلیں اس درخت کی کہانی سنا تا ہوں آپ کو یہ پورا لان ایک طرف اور یہ آم کا درخت الگ ایک ٹکلی تاریخی ہے۔“

”یہ وہ جگہ ہے جہاں فیاض تایا یعنی آپ کے بابا جان کی بڑے ابا چائی کیا کرتے تھے اس آم کے درخت نے دراصل بچپن میں فیاض تایا کی چائی دیکھی ہے اور جوانی میں تو.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا تھا وہاں کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔

”کیا..... آپ..... میرے بابا کے بارے میں اتنا جانتے ہیں، کیسے؟“ لفظ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، وہ ہلکا رہی مگر بابا کے ذکر پر اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں وہ مسلسل بول رہا تھا، اور وہ دیوانہ وار سن رہی تھی۔

”فیاض تایا کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں لیکن زبان سے ذکر بڑے ابا کی وجہ سے نہیں کرتے ہیں، وہ ان کے ذکر پر خفا ہو جاتے تھے،

میرے بابا اکثر بچپن کی باتیں ان کی سناتے ہیں بابا فیاض تایا سے بہت محبت کرتے ہیں مگر بڑے ابا کی انا ان کے قدم روک لیا کرتے تھے، ورنہ وہ

فیاض تایا سے ملنا چاہتے تھے، لیکن قسمت.....“ وہ کہتے کہتے پھر خاموش ہو گیا، زوہا اس کی باتیں بہت ضبط سے سن رہی تھی، اس کے لہجے میں سربے

نہاوا نہایت تھی وہ وہیں گھاس پر بیٹھتی چلی گئی، یہی گھاس کو چھو کر محسوس کرنے لگی۔

”بڑے ابا کو بابا سے اتنی نفرت۔“ اس نے بے دردی سے مٹی میں آئی گھاس نوچ لی۔

”نفرت نہیں محبت۔“ اس نے سچ کی اور اسی درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔

”یہ کیسی محبت ہے جو انہوں کو انہوں سے دور کرے۔“ وہ سسکی تھی۔

”اس محبت کے پیچھے بہت بڑے بڑے طوفان چھپے ہیں، فیاض تایا کو بچپن سے ہی بڑے ابا نے اپنی بہن کی بیٹی سے منسوب کر رکھا تھا، اس

رشتے سے فیاض تایا انکاری تھے اور اشتعال میں عین نکاح والے دن وہ مگر سے بھاگ گئے پھر

مجبوراً انہیں عزت کی خاطر اپنے چھوٹے بیٹے ایاز سے نکاح کر دیا گیا جس کے لئے ذہنی طور پر ان کی بھانجی ہرگز تیار نہ تھی، سب کی عزت کو یوں

روند کے جانے والے کو وہ معاف نہ کر سکے، خاموش جھمی جھمی سی بھانجی کا درد بھی انہیں عزیز



زبان کی پشت انہیں صاف نظر آ رہی تھی، وہ خاموشی سے یہ منظر آنکھوں میں لئے اندر ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

چائے کی پیالی ایاز چوہدری کے آگے رکھ کر وہ ان کے سامنے بیٹھ گئیں، چائے کا کپ ہاتھ میں لیکر وہ سیپ لیتے ہوئے سامنے خاموش بیٹھی بیگم ایاز کو غور سے دیکھنے لگے، جو غیر مرئی نقطہ پر اپنی نظریں مرکوز کئے ہوئے تھیں یوں بے خبر جھٹکی بانہ کر زمین کو دیکھتے رہتا انہیں عجیب سا لگ رہا تھا، سوچ اور فکر کی بے شمار لکیریں ان کے ہاتھ پر واضح نظر آ رہی تھیں جو کسی فکر مند کی کی غماز تھیں۔

”کیا ہوا کچھ پریشان ہو؟“ ایاز چوہدری کے لہجے میں شہد جیسی مٹھاس تھی، کبھی بھی شکایت زبان پر نہ لانے والی اس عورت کی ایثار اور وفاداری کے وہ دل سے قائل تھے، وہ اپنی طرف سے پورا خیال رکھتے کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو، وہ ان کی شریک حیات تھی ہر دکھ سکھ کی ساتھی جس نے کبھی انہیں یا خاندان کے کسی فرد کی خدمت میں مایوس نہیں کیا تھا۔

”پریشانی..... یہ بھی تو ہماری زندگی کا حصہ ہیں جہاں سکون ہو وہاں پریشانی بھی آتی جاتی ہے۔“ وہ کم مہم لہجے میں بولیں۔

”خیر تو ہے ایسی کیا بات ہے، جو آپ کو پریشان کر رہی ہے؟“ وہ چائے کا سیپ لے کر کپ سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے، بیگم ایاز اپنے شوہر کو دیکھتی رہ گئی، ان کی آنکھوں میں عجیب بے بسی تھی۔

”کبھی کبھی خود غرض ہونے کو دل کرتا ہے، زندگی میں محبت کے سکون کی کھٹک جب بھی اپنی جمولی میں اکٹھے کرنے چاہیے، میری جمولی کے سکے تو کسی اور کی جمولی میں گر جاتے ہیں اور میرا دامن پھر خالی رہ جاتا ہے، میں نے زندگی سکے

تھا، ایاز میرے بابا اور بڑے اما کی بھانجی فیاض تایا کی سابقہ منیجر میری ماں ہیں۔“ وہ انکشاف کر رہا تھا، زبان ٹھہر ٹھہر کر جو بتا رہا تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ حال میں نہیں ماضی میں سفر کر رہی ہے، ماضی کا یہ سفر اس کے دماغ کی پر وہ اسکرین پر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے ایسے جیسے ان مناظر کی وہ خود گواہ ہو، سارے منظر ایک کے بعد ایک کر کے اس کے سامنے چل رہے تھے، پاس کھڑا درخت نہیں انسان ہی تھا جو اسے کڑی نظروں سے دیکھ رہا تھا، ہوا بھی بہت سی سرگوشیاں سناتے لگیں تھیں، پودے پھول پتے سب ہی اس محفل کا حصہ تھے، سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے، وہ ہر کردار کو جانچتی نظروں سے پرکھنے کی کوشش کر رہی تھی، یہ سارے کردار اس کی زندگی میں شامل تھے لیکن وہ لاعلم رہی، اسے لاعلم رکھا گیا اور اب جب وہ ان تمام کرداروں کو جانچ چکی تھی، زوہبانے اپنا شکستہ جھکا سر اٹھایا تو زبان اس کے ڈوبتے ابھرتے چہرے کی لغزشوں کو ہی دیکھ رہا تھا اس نے گہرا کر دوبارہ اپنا سر جھکا لیا۔

نہ جانے کیوں زبان اس وقت اس کی جھک سے محفوظ ہو رہا تھا، وہ غرور اور بہادر بظاہر اپنی شخصیت کو ایک خول میں بند رکھے ہوئے تھی ہمت در پرت کھلتے پر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے کتنی شکستہ اور کمزور ہے، دونوں کے درمیان اب خاموشی تھی وہ دونوں ہی چپ چاپ بیٹھے تھے، جس زدہ ماحول میں یکدم سرشاری سی آنے لگی، ہوا ایسی زور کی چلی کہ چوہوں نے جی بھر کے تالیاں بجائیں پھول مسکرا رہے تھے۔

دور کھڑی بیگم ایاز چائے کا کپ تھامے لڑنے لگیں، ان کے دل نے ڈبکی لگائی تھی، لان میں درخت کے سائے تلے وہ دونوں بیٹھے تھے،

ان کے چہرے سے ہاتھ اٹھا کر آنسو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جن لئے پھر اپنا سر لٹی میں ہلانے لگے، بیگم ایاز نے بھی آنکھوں سے شوہر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا، پھر آنکھیں موندے اپنے شوہر کے مضبوط کندھوں پر اپنا سر رکھ دیا۔

☆☆☆

”زہا!“

”جی۔“ انداز استحقاق پر اس نے چونک کر دیکھا تھا، یہ وہ لہجہ تو نہ تھا جو چند ماہ سے اس نے جھپٹا تھا، ان کے انداز میں تو عجب لافلتی ہوئی تھی، اب اتنے مان سے اپنے کمرے کی طرف جانی زدہا کا بیگم ایاز کو یوں پکار کر روکنا زدہا کو عجب لگ رہا تھا، دل کسی انہوں نے احساس تلے دھڑک رہا تھا، جب سے بڑے ابانے اس سے زبان کے متعلق رائے طلب کی تھی تو اس کے جھکے سر نے بڑے ابانے کو تو مسرور اور مطمئن کر دیا تھا لیکن خود وہ کئی اندیشوں اور خوف میں گر گئی تھی، زبان ہر لحاظ سے اعتماد اور محبت کے لائق تھا، وہ خود کو اس کے قریب جب محسوس کرتی اسے یوں لگتا جیسے وہ دھوپ میں چلتے چلتے یکدم چھاؤں تلے آ گئی ہے، اس اکیلی زندگی میں اس کا ساتھ یقیناً خزاں سے بہا رہا کہ سفر تھا، جو وہ من ہی من میں کر رہی تھی، وہ دل سے اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی، لیکن یہ اس کے اپنے دل کا فیصلہ تھا جو اس نے بغیر کسی ریا کے اباحضور کو اثبات میں دیا تھا ضروری تو نہیں تھا دل کے ہر فیصلے سے ہر شخص متفق ہو، پھر بیگم ایاز کا لیا دیا انداز بھی اس کو خوف میں جھلا کر رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر چلی تھی، اس نے بیگم ایاز کے سفید چہرے کی طرف دیکھا جو سپاٹ تھا، اسے وہاں لفظ دکھائی ہی نہیں دے رہے تھے،

جمع کرنے میں ہی لگا دی ایاز صاحب، کیا میں اتنی بد نصیب ہوں کہ اپنی جمولی کے سکوں کی کھٹک سے اپنی ساعت اور دل کو خوش کرنے سے قاصر رہوں گی، کئی برس پہلے بھی میری جمولی ایسے ہی خالی ہو گئی تھی، اب میں نے جو سکے اتنے برس ایک ایک کر کے جمع کرنا جو شروع کیے تھے ان کی کھٹک سننے کی خوشی حاصل ہونے سے پہلے ہی کوئی اور اپنی جمولی میں میرے سکے ڈال لینا چاہتا ہے، میں کیا کروں، ایاز صاحب، آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟“ ایاز چوہدری سکتے کی کیفیت میں اپنی بیگم کو یوں روتا دیکھ رہے تھے، وہ سوال کرتی نگاہ جواب مانگ رہی تھی، اور اک کے دروازے ان پر کھلتے ہی چلے گئے، شاید آسمانوں سے اس وقت الہام اترنے کا وقت تھا، ان کے دل میں بھی الہام اتر رہے تھے اور وہ زینہ بہ زینہ چڑھنے لگے آسمان کی روشنی کو دیکھنے لگے، پھر ایک فیصلہ ان کے دماغ میں کوندا تھا۔

”نورا!“

”جی۔“

”تم نور ہو، روشنی، تم نے ایک بار پہلے بھی اپنی جمولی کے سکے کسی اور کی جمولی میں الٹ دیئے تھے اب بار بھی اپنی جمولی میں الٹ دو اس یقین کے ساتھ کہ تمہارا کنگھول خالی نہیں بھرا ہوا ہے، یہ ہاتھ اللہ نے تمہیں دینے والا بنایا ہے رب کا بہت شکر ہے کہ ان ہاتھوں نے جب بھی دیا بہت دیا، دینے والا ہاتھ سکون میں رہتا ہے، رب سوچنے کی رضا بھی یہی ہے۔“ بیگم ایاز نے شوہر کی طرف حیران نظروں سے دیکھا تھا، ایک ایک لفظ ان کے دل پر پڑے بوجھ کو کھسکا رہا تھا، دھیرے دھیرے وہ خود کو پرسکون محسوس کرنے لگیں، اپنے دونوں ہاتھ انہوں نے چہرے پر رکھ لئے تھے، ایاز چوہدری بیگم کے برابر بیٹھ گئے اور

جنہیں بڑھ کر کوئی رائے قائم نہ کرتی۔  
 ”کچھ کام خاتم سے اگر فارغ ہو تو چند  
 منٹ بیٹھو میرے پاس۔“  
 ”جی آئی ضرور۔“ وہ جھپکی تھی۔

”آئی نہیں بڑی چچی جان کہو، ہر رشتے کا  
 اپنا ایک مقام ہوتا ہے اسے منسوب ناموں سے  
 پکارنا ہی رشتوں میں حلقہ کو قائم کرنے میں مدد  
 دیتا ہے۔“ ان کے لہجے کی نزاہت ان کی باتوں  
 کی پھوار وہ اپنے دل پر گرتے محسوس کر کے  
 اطمینان سے پھر بولی۔

”سوری، رشتوں سے دوری نے ناموں  
 سے بھی مجھے کورا کر رکھا ہے آہستہ آہستہ رشتے بھی  
 میری زندگی کا حصہ بن رہے ہیں تو ناموں سے  
 بھی واقفیت ہو جائے گی، چچی جان۔“ وہ رسان  
 سے بولی، اس کے لہجے میں بے بسی عود آئی، وہی  
 بے بسی جو اکثر نور کے دل میں اتر جایا کرتی تھی،  
 وہ بن ماں باپ کی بچی کے ممکن زدہ لہجے کو دیکھتی  
 رہ گئی، وہ یقیناً پیار اور محبت کی تسخیر تھی، کشادہ  
 پیشانی پر سیاہ دو آنکھوں نے جیسے اسے اپنے  
 حصار میں لے لیا تھا، وہی دوسرا آنکھیں، وہی  
 کشادہ پیشانی اور مہنگے بال، اف  
 لدا، وہ چلتی پھرتی فیاض کا عکس تھی، بیگم ایاز نے  
 نرم دنداز ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر اسے  
 اپنے ساتھ لاؤنج میں لے آئیں وہاں بچے  
 گاہیں پر وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ گئیں، دوسرے  
 ہاتھ میں پکڑی سیاہ ڈائری انہوں نے زوہا کو پکڑا  
 لی، پھر اپنی کلائی سے سونے کا نگین جس پر نیس  
 گھونٹے چھوٹے وائنٹ جگ جڑے ہوئے تھے  
 ادا کی نازک کلائی میں پہنا دیا، زوہا مہنگ بنی  
 علیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، سونے کا  
 نگین اس کے بھرے بھرے سفید ہاتھوں میں بیچ  
 ادا۔

”یہ ہمارا خاندانی نگین ہے اور تم ہمارے  
 خاندان میں آنے والی سب سے پہلی بہو ہو گی  
 اس لئے میری ساس کے اس نگین پر چہار احق  
 ہے۔“ وہ ہچکے ہچکے لہجے میں بول رہی تھیں، زوہا  
 کی آنکھوں میں بیک وقت حیرانی و خوشی کی ملی جلی  
 کیفیت تھی، وہ سراسیمگی کے عالم میں بیٹھی ہاتھوں  
 کی لڑزش پر بے قابو ہو رہی تھی، اس کی سمجھ میں  
 نہیں آ رہا تھا وہ کیا بولے، وہ اپنی کلائی میں پہنے  
 ہوئے نگین کو دیکھنے لگی جو اس بات کا واضح ثبوت  
 تھا کہ بیگم ایاز اسے دلی طور پر اپنی بہو تسلیم کر چکی  
 ہیں، دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک سے زیادہ تیز  
 اس کا دل دھڑک رہا تھا، اسے محسوس ہونے لگا  
 جیسے گھڑی کی ٹک ٹک ختم ہو گئی ہے وقت رک گیا  
 ہے دل ٹھہر گیا ہے، یہ کیا الوکھا تعلق آج ان  
 دونوں کے درمیان جڑ گیا تھا جس سے پہلے بھی  
 وہ آشنا نہ تھی، دونوں کے بیچ قائم خلا یوں مٹ  
 جائے گا ایسے بھلا اس نے کب سوچا تھا۔

”میری اہی بہت عظیم ہیں انہوں نے اپنے  
 نفس کی قربانی دی تھی، وہ مشکل کام آسانی سے  
 کرنے کا فن جانتی ہیں۔“

زوہا سانسے بیٹھی عظیم عورت کی طرف دیکھنے  
 لگی جس کا برسوں پہلے ارمانوں کا خون ہوا تھا،  
 چادر میں ڈھکا ان کا سفید چہرہ آئینہ کی طرح  
 صاف شفاف تھا۔

”یو آر گرینٹ..... آپ..... بہت.....  
 اچھی ہیں چچی جان۔“ اس نے بیٹھی آنکھوں سے  
 یہ مشکل کہا تھا، نور نے نفی میں سر ہلا کر اس کے  
 ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”بیٹا! یہ اللہ کے کام ہیں اور اوپر والے کی  
 مصلحت کو ہم عام انسان نہیں سمجھ سکتے، میں نہیں  
 جانتی کھونے کا دکھ جو میں نے کبھی محسوس کیا تھا،  
 وہ تم یا زیاں محسوس کرو، اللہ تم دونوں کو خوش

”اور آپ کی ساس..... یعنی میری دادی؟“

”میری شادی کے ایک برس بعد ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں، وہ دلی کی مریضہ تھیں، بچے کے غم کا بوجھ دل پر نہ سہہ سکیں۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولیں۔

”اوہ۔“ اس نے تاسف کا اظہار کیا، زیان کی سناٹی کہانی کے سارے کردار اس کے سامنے کھل کر آ گئے تھے، اسے اپنی جگہ سب ہی کردار درست نظر آ رہے تھے، بڑے ابا کی خشکی جو بعد میں نفرت میں بدل گئی اسے یہ بھی برا نہیں لگ رہا تھا، انا کی زنجیروں میں جکڑے انسانوں کی نفرت یوں ہی ہوا کرتی ہے شاید۔

اتنا کچھ ہو جانے کے بعد خود اس کا وجود بھی باعث نفرت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن یہ محبت ہی تھی جس نے نفرت کو ختم کر کے نئے رشتے استوار کر لئے تھے، وہ زیان کی ماں کی وسعتِ اقلی دیکھ کر جہاں حیران ہو رہی تھی وہاں خود پر بھی رشک آیا کہ قدرت نے اس سے جو رشتے چھین لئے اس کے بدلے نئے رشتے محبتوں کے ساتھ عطا بھی کر دیئے تھے، وہ اب سر ہلا ہلا کر باقی لست کھل کر رہ گئی۔

☆☆☆

وہ اسے سر سے پیر تک گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا، بلیک اینڈ وائٹ چپک والی شرٹ اور بلو جینز میں بے حساب پرفیوم جھڑکا گیا تھا، چمکتے دیکتے جیل سے سیٹ ہوئے بال چہرے کو نیا زاویہ دے رہے تھے۔

”اتنا پرفیوم اور کیا تیاری ہے جناب کی، کہاں جانے کی تیاری ہے؟“ وہ اپنی ناک سیز کر اس سے پوچھ رہا تھا زیان اس کی بات سن کر خنث جھنجھلا رہا تھا، وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا ہی تھا

رکھے، اچھا..... یہ بتاؤ میری کچھ مدد کرو گی، رمضان کی آمد میں پندرہ دن رہ گئے ہیں، میں یہ ڈائری لے کر آئی تھی کہ قلم سنبھالو اور لکھتی جاؤ جو جو سامان میں تمہیں لکھوانی ہوں، ہم رمضان سے پہلے ہی سب تیاری کر لیتے ہیں حتیٰ کہ عید کی تیاری بھی رمضان سے پہلے کر لی جاتی ہے، تاکہ رمضان سکون کے ساتھ اللہ کی عبادت میں گزرے۔“ انہوں نے موضوع بدلا تھا اور پھر ڈائری کھول کر اسے سامان لکھوانے لگیں جو بازار سے انہیں منگوانا تھا، وہ بے جھجک اور بے تکلف ہو کر زد پا کو لست تیار کر داری تھیں۔

”آپ سے ایک بات پوچھوں چچی جان!“ اس نے جھکے سر سے لکھتے لکھتے اچانک ذہن میں آیا سوال کیا۔

”ہاں ہاں ضرور۔“ وہ مسکرائیں۔  
”آپ برا تو نہیں مانیں گی نا۔“ وہ جھجکی تھی۔  
”نہیں۔“

”آپ کو جب اپنی محبت نہ ملی تو کیا زندگی ایاز چچا کے ساتھ..... میرا مطلب ہے کہ..... آپ نے شوہر کے طور پر تو انہیں تسلیم کر لیا ہوگا لیکن دل.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی اور ان کی شکل دیکھنے لگی جہاں سکون ہی سکون تھا۔

”وقت اور تجربے جب انسان پر گزرنے لگتے ہیں تو بہت سی باتیں آتے آتے سمجھ میں آنے ہی لگتی ہیں، دل کو وہ لوگ خود بہ خود اچھے لگنے لگتے ہیں جن کا آپ کی زندگی پر اختیار ہوتا ہے، ایاز بہت اچھے شوہر ہیں، میری چھوٹی سی قربانی رائیگاں نہیں گئی، لیکن یہ بات مجھے دہرے سمجھ میں آئی۔“ وہ غلامیں جیسے کچھ کھوئے لگیں، چند دن پہلے کئی ایاز کی باتیں دماغ میں گونجتی لگیں تھیں۔

کہ وقار سے اس کا کراؤ ہو گیا، اس کا یوں خاص انداز میں دیکھنا اسے کوفت زدہ کر گیا۔

”مطلب کیا ہے اس بات کا، بندہ باہر کہیں جاتا ہے تو عام سے حلے میں تھوڑا نکل جاتا ہے۔“ وہ اب بچ بچ گڑبڑا رہا تھا، وقار کی معنی خیز نگاہیں اسے اندر ہی اندر تپا رہی تھیں، اس سے پہلے بھی کئی معنی خیز جیلے وہ اچھال چکا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ معنی خیز انداز میں گہرا قسم ہونٹوں کے کنارے ٹھہرا تھا۔

”بازار۔“ وہ چڑ کر جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

”کیا واقعی؟“ وہ حیران ہوا تھا وقار اپنا سر کھباتے ہوئے بولا۔

”تو.....!“ وہ جھلایا۔

”اتنی تباہی کے ساتھ بازار جایا جا رہا ہے وہ صاحب جنہیں ہفتہ بھر کپڑے بدلنے کا ہوش نہیں رہتا تھا وہ بازار اس حلے میں۔“ وقار نے اپنا جملہ دانستہ چھوڑا تھا اور ایک بلند قہقہہ لگایا پھر وہ ہنستا ہی چلا گیا جس سے زبان مزید تپا تھا۔

”اکیلا نہیں جا رہا چچی اسی اور زدہا کو ساتھ لے جا رہا ہوں عید کے لئے کپڑے لینے ہیں۔“ وہ اب وقار کو کچا چبا جانے والی نظروں سے گھور کر بولا تھا، انداز غرانے والا تھا جس پر وقار نے اپنی ہمنویں اچکا نئیں۔

”نیری جان میرے سامنے تم کھلی کتاب ہو کیوں خود کو ہم سے چھپا ہو؟ ویسے کیا آج اظہار محبت کا ارادہ ہے۔“ وقار اب اس کے کانوں کے قریب آ کر سرگوشیاں کر رہا تھا۔

”کچھ تو شرم کرو یا رہ۔“ آواز دھیمی اور شکستہ تھی، وقار نے اس کا حال دل بڑی آسانی سے کہہ ڈالا تھا۔

”جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم،

سب کہہ ڈال..... جا..... شاپاٹش بیٹ آف لک۔“ وقار نے اس کی پیٹھ چمکی تھی اور انگوٹھا دکھا کر آگے بڑھ گیا، وہ اتنی ہی دیویوں ہی سہاکت کھڑا رہا، آنے والے لمحے کو سوچتا رہا۔

☆☆☆

شاہجک کرتے کرتے دوپہر ڈھل گئی تھی، بھوک کے مارے برا حال تھا، سب ہی تھک کے چور ہو چکے تھے، زبان انہیں اوپن ایئر فوڈ کورٹ میں لے آیا تھا جہاں باری کی کیو کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس سے بھوک مزید جھپکنے لگی۔

”دیکھو بھئی ہم فالودہ ضرور کھائیں گے بعد تم ہمیں لفٹ کب کراؤ گے، گھومنا پھرنا، میرے سائے بس بیگم کے لئے رہ جائیں گے۔“ سارہ چچی چکن رول بیگم کرتے ہوئے بے تکلف لہجے میں زبان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں جو جمل سا ہو گیا تھا ان کا انداز کسی بھی بات کے لئے یوں ہی ہوا کرتا تھا، ورنہ بڑے ابا کے سامنے تو ان کی آواز دبی دبی سے نکلتی تھی، یوں گھر سے باہر کھانے پینے کا رواج کم ہی تھا جو زبان ہی اکثر سب کا شوق خاص خاص موقعوں پر لے جا کر پوا کرتا تھا۔

”اب ایسی بات بھی نہیں۔“ نور کو دیورانی کا یوں کہنا برا لگا تو فوراً بولیں۔

”تمہارا ایک ہی بیٹا ہے تمہیں کیا معلوم نور بھابھی آج کل لڑکے شادیوں کے بعد بیگموں کو ہی پیارے ہو جاتے ہیں بے چارے ان سے جڑے رشتے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، ہمارے بھائی کی بیگم ضامنہ کے خیر سے تین بیٹے ہیں دو کی شادی کر چکی ہیں ایک بیٹا ساتھ اور ایک الگ رہتا ہے، شادی کو دو ماہ بھی نہ ہوئے اور وہ بیگم کے ہمراہ الگ ہو گئے۔“ سارہ نے زدہا کی طرف دیکھا جو جمل سی بیٹھی تھی۔

نور نے عجیب نظروں سے دیورانی کو دیکھا تھا جن کے پاس سنانے کو کہانیاں تو بے شمار ہوتی تھیں ان میں وہ اکثر ہنک مریج چمڑکنانہ بھولتی تھیں، اس بات کو وہ سمجھتی تھیں، اس لئے ہانے والے انداز میں بولیں۔

”یہ بتاؤ فالودہ کھائیں گی یا آئس کریم۔“  
”کہا تو تھا فالودہ۔“ سارہ پہلو بدلتے ہوئے برا سامنہ بنا کر بولی، زیان اور زوہا کے سامنے جیٹھانی کایوں ٹوکنا اسے برا لگ گیا تھا وہ تو ان کے بھلے کی بات کر رہی تھی۔

”زیان تم زوہا کو ساتھ لے جاؤ وہ شاید فالودہ نہ کھائے تم اس کی پسند سے آئس کریم کا فلیور لانا۔“ وہ زیان کو دیکھ کر بولیں جو اس ساری گفتگو میں ضبط کے ساتھ بیٹھا سرخ ہو رہا تھا، سارہ چچی کی منہ پھٹ طبیعت سے واقف تھا اس لئے کچھ نہ بولا، موڈ کو بہتر اور دونوں کو وقت دینے کی خاطر نور نے زیان کی نگاہیں اپنی جہانگیرہ نظروں سے پڑھ لی تھیں، زیان کے چہرے پر اچانک ہی مسرت کا رنگ چھا گیا وہ سر ہلاتا زوہا کو اٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

”جیسی یہ کیا کیا آپ نے۔“ سارہ حق دق رہ گئی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ نور نے معنوی حیرانگی دکھائی۔

”ایسے کیسے دونوں کو اکیلے بھیج دیا، زمانہ بہت خراب ہے بھابھی آپ بجائے ان پر نظر رکھنے کے ان کو اکیلے بھیج دیا۔“

”زمانہ بدل گیا ہے سارہ اور ہمیں اس وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے ہمیں بچوں کی خوشیوں کے ساتھ رہبر بن کر چلنا پڑا ہے، بوے ابا نے بھی تو یہی ایک غلطی کی تھی

نہ، وہ اپنی اولاد کی خوشی کے بجائے اپنے بنائے اصولوں پر ڈٹ گئے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ ضد اور انا کے طوفان نے سب روند ڈالا، میں یہ غلطی کبھی نہیں دوہراؤں گی۔“ ان کی آنکھوں میں چمک تھی جسے دیکھ کر سارہ چپ سی ہو گئی، یہی وہ اعتماد تھا جو نور کو اپنے بیٹے اور ہونے والی بہو پر مکمل تھا، وہ دونوں کا دست پر کھڑے تھے، زیان فالودہ پیک کر وارہا تھا، گھر میں موجود کزنوں کے لئے، زوہا نے آئس کریم میں اسٹرابیری فلیور پسند کیا تھا، وہ مختلف آئس کریم کے فلیور فریز باکسز میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے ہاتھ میں پکڑے موہاٹل پر بیج کی بیج آئی، اس نے چونک کر اپنا موہاٹل کا ان باکس چیک کیا جہاں بیج آیا ہوا تھا، بیج کسی ان ٹون نمبر سے آیا تھا اس نے حیران نظروں سے بیج کھولا۔

ہاں!!!  
مجھے جانے اچھا لگتا ہے  
کیونکہ ہم

ایک دوسرے کے لئے ہیں  
مسافت ایک سی ہے  
مقدار ایک سا ہے  
چلو آؤ یوں کرتے ہیں  
دونوں باہم چلتے ہیں  
محبت ساتھ کرتے ہیں

زوہا نے شاہر پکڑے زیان کی طرف دیکھا تھا جس کی نظروں میں شرارت ہی شرارت اور ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ دبلی تھی، زوہا نے ابرو اچکائے تو زیان نے مسکرا کر اس کی آنکھوں کے اشاروں پر اپنا سر خم کر دیا تھا، جس پر وہ بے اختیار مسکرانے لگی، دونوں واپس اپنی ٹیبل کی طرف ساتھ چلنے لگے، دونوں کو یوں مسکراتے آتا دیکھ کر نور نے دل ہی دل میں ہزار بلائیں لے

ڈالی تھیں۔

☆☆☆

”میرا خیال ہے عید کے بعد رسم نکاح کر دیا جائے۔“ بوے ابا نے تائید بھری نظروں سے ایاز اور نور کی طرف دیکھا تھا، ان کے برابر ریاض اور سارہ بھی ڈرائنگ روم میں بوے ابا کے بلانے پر بیٹھے تھے، سارہ کی دلچسپی تو ان سارے معاملات میں مشغول تھی، ویسے بھی ان کی موجودگی اور عدم موجودگی سب کے لئے برابر تھی، وہ اپنی ناقص عقل و فہم کی بنا خاموش ہی رہتی تھیں۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں ابا جی، رخصتی بھی ہو جائے، گھر کی بات ہے اور زبان کے پیچھے بھی ہو گئے ہیں اس نے پیچروں سے پہلے کئی جگہوں پر اپلائی کر رکھا تھا، اپنی نیکل کپٹی سے جاب کی اچھی آفر آئی ہے ہانی جو اللہ کو منظور۔“ ایاز نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”تم کب اور ریاض۔“ بوے ابا اب ریاض کی رائے طلب کر رہے تھے۔

”ایاز بھائی صحیح کہہ رہے ہیں ابا جی جیسا اب مناسب سمجھیں، عید کے بعد شادی کرنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں لیکن اتنی جلدی ہال کا انتظام ممکن نہ ہوگا۔“

”نکاح اور رخصتی گھر پر ہوگی، ولیم کے لئے ہوٹل میں بنگ کر والو۔“ بوے ابا کی گتیر آواز گونجی تو سب ہی نے تائید میں اپنا سر ہلا دیا، پھر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے لیٹ گئے، بوے ابا کی آنکھ اناز سے لپٹے ہوئے پھینکنے لگی، دوسری طرف نور بھی اپنی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کرنے لگیں۔

☆☆☆

لاؤنج میں سارے کزن جمع تھے، سب ہی

کے چہرے خوشی سے کھل گئے تھے، خوش کہیوں کا سلسلہ جاری تھا، راشد بلال کے معنی خیز نعروں نے ماحول کو مزید قہقہوں میں بدل دیا تھا، نور سب کے منہ میں مٹھائی ڈال رہی تھی، زبان نے مٹھائی کھاتے ہوئے ایک طائرانہ جائزہ ماحول میں بیٹھے لوگوں کا لیا، سب ہی موجود تھے، زوہا غائب تھی، وہ آہستگی سے اٹھا اور اس کے کمرے کی طرف پڑھ گیا، وہ اپنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، آنکھوں کے کنارے بے تحاشا رونے سے گلابی ہو رہے تھے، ناک سرخ اور چہرہ پر سوز تھا، وہ اس کے مین سامنے چلا آیا اور روتا دیکھ کر تڑپ کر بولا۔

”تم رو رہی ہو؟“ زوہا نے جبک کر پہلو بدلا تھا، پھر سرعت سے بھیگا چہرہ اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی، اس کا دل بھرا ہوا تھا، آنکھیں صاف کرنے پر بھی برے جا رہی تھیں،

اس موسلا دھار برسات پر زبان گھبراہٹ گیا تھا۔

زندگی کے میلے میں، خواہشوں کے ریلے میں

تم سے کیا کہیں جاننا، اس قدر جھیلے میں

وقت کی روانی ہے بخت کی گرانی ہے

سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے

ہجر کے سمندر میں

تخت اور تختی کی ایک ہی کہانی ہے

تم کو جو ستانی ہے

بات کو گزرا سی ہے

بات عمر بھر کی ہے

عمر بھر کی باتیں کب دو گھڑی میں ہوتی ہیں!

درد کے سمندر میں

ان گنت جزیرے ہیں، بے شمار موتی ہیں

آنکھ کے درتے میں تم نے جو سپایا تھا

بات اس دیئے کی ہے

بات اس گلے کی ہے

جولوہ کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے

لفظ کی فصیلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے

زندگی سے لپٹی ہے، بات رت جگے کی ہے

راستے میں کیسے ہوا!

بات پھلنے کی ہے

پھلنے کی باتوں میں گنگواضافی ہے

پیار کرنے والوں کی اک نگاہ کافی ہے

ہو سکے تو سن جاؤ ایک دن اکیلے میں

تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جمیلے میں

برسات کا یہ پانی اس کے دل میں سمندر

بن کر بہنے لگا، وہ واہوں میں گھرا کھڑا تھا، اس

نے سامنے نیچی زدہا کے چہرے پڑھنے کی کوشش

کی جہاں درد ہی درد تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ

شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس کی مرضی تھی بھی یا

نہیں، دل نے سوال کیا تھا۔

”کیا تم خوش نہیں؟“ زبان کے سوال پر

اس نے تڑپ کر دیکھا تھا اور پھر اپنا سر جھکا لیا اور

زیادہ رونے لگی، زبان بچ بچ اب گھبرانے لگا تھا،

اسے روٹی پلکتی اس لڑکی کو چپ گردانے کا ہرگز

سلیقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس کی کوئی بہن نہ تھی،

صنف نازک کی نزاکتوں سے بھی لاعلم تھا، نہ

جانے کیوں وہ اس قدر رو رہی تھی شاید اسے اپنے

ماں باپ یاد آ رہے تھے، اس خیال کے آتے ہی

اس نے اپنا سر جھٹکا تھا وہ کتنا غلط زدہا کو سمجھ رہا

تھا۔

”پلیز خاموش ہو جاؤ۔“ وہ اس کے آگے

گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہہ رہا تھا اس نے اپنی بیگلی

پلکیں دھیرے سے اٹھائیں اور اسے اپنے اتنا

قریب بیٹھا دیکھ کر چپ سی ہو گئی، زبان اب اس

سے کچھ فاصلے پر برابر میں بیٹھ گیا تھا اور پھر یو لا۔

”تایا جان اور تائی جان یاد آ رہے ہیں

”میں نے اپنی زندگی میں خوشیوں کے جتنے

چھوٹے بڑے پل دیکھے ہیں، ان سب میں اپنے

والدین کو ہی دیکھا ہے، کسی اور رشتے کو نہ چاہنے

کی محرومی کا احساس دل میں تو تھا لیکن بابا کی

محبت اس کی کو کچھ پورا کر دیا کرتی تھی، مجھے اپنا

بچپن بہت جزئیات کے ساتھ تو یاد نہیں لیکن اتنا

یاد ہے، ہم عید کے دن بھی گھر میں گزارتے تھے،

بابا ہمیں عید کے موقع پر بھی گھر سے باہر نہیں

لے کر جاتے تھے، کیونکہ وہ میرے سوالات کا

جواب دیتے دیتے تھک جاتے تھے، ماما ایک

اچھی سی کونگ میں عید کے دن مصروف ہو جاتی

تھیں اور بابا ان کی بدد کرتے تھے، میں ڈوٹر کے

ساتھ کھیتی تھی، کبھی لی وی پر کارٹون مودی دیکھ

لی، میری عید کا دن تو بس ایک عام دن کی طرح

گزر جاتا تھا، کبھی یہ دن مجھے خاص محسوس ہی نہ

ہوا۔“ وہ بے اختیار ہو کر بولے جا رہی تھی۔

”جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اپنی زندگی کا

آغاز نئے سرے سے کرنے کی کوشش کرو، اب

وعدہ کرو یوں آنسو کبھی نہیں بہاؤ گی میں وعدہ کرتا

ہوں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“ وہ مضبوط لہجے

میں بول رہا تھا اس کی گرم نگاہوں سے اب زدہا

جھینپ رہی تھی اپنی باتوں پر اسے ایسی شرمندگی

ہونے لگی، چہرے پر پھیلے حیا کے رنگوں کو دیکھ کر

زبان کے ہونٹوں تلے مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”میں آپ کو چاند مبارک کہنے آیا تھا، کل

آپ ہم سب کے ساتھ رمضان کے روزوں کا

لفظ اٹھائیں گی، کل ہی میری انٹرویو کال ہے

دعا کیجئے کہ کامیاب ہو جاؤں۔“

”آپ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔“

اس نے جھینپ کر جواب دیا۔

”اتنا یقین۔“ وہ اس کی آنکھوں میں اتر کر



”نہیں..... آپ مجھے ابھی لگیں اس لئے..... کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔“ وہ کہہ کر رکا نہیں اس پر ایک بھر پور نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا زودہا اس کو یوں جانتا دیکھ کر لمبی سانس کھینچ رہی تھی زودہا کے لبوں پر ایک آسودہ اور پرسکون مسکراہٹ تھی، دل زبان کی محبت بھری سنگت سے سرور ہو رہا تھا، اسے یقین تھا آنے والے زندگی کے لمحے اس کے لئے خوشیاں ہی خوشیاں لائیں گے وہ شکرگزار نظروں سے آسمان کو دیکھنے لگی، اس کی کھڑکی سے وسیع آسمان کے ستارے ٹٹماتے نظر آرہے تھے، چاند کو ڈھونڈتی اس کی نگاہ نے دل سے زبان کے لئے دعا کی تھی، وہ وضو کرنے والی روم کی طرف بڑھنے لگی، اسے اپنے رب کا جبدے میں جا کر شکر ادا کرنا تھا، وہ کھڑکی سے ہٹ کر چلی تو دیکھا دروازے پر اب بھی زبان کھڑا ہے۔

رمضان مبارک اللہ تعالیٰ اس رمضان کو ہمارے لئے رحمت ہی رحمت بنا دے آمین کہہ کر مسکرایا۔

وہ شرابا کر مسکرانے لگی اور جلدی سے واش روم میں گھس گئی، اب اس کو بھی پیاسنگ رمضان گزارنے کا شدت سے انتظار تھا اور ابھی جبدے کا شکر بھی باقی تھا۔

☆☆☆

سوال کر رہا تھا۔  
”جی اتنا ہی یقین ہے۔“ وہ اب خود اعتمادی سے بولی۔

”میرا تو اس بات پر ایمان ہے کہ مستحکم یقین کا صلہ ضرور ملتا ہے، جیسے میرے یقین کا صلہ آپ۔“ اس نے شرارت سے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

”ایک بات سچ کہوں۔“ وہ اچانک اس کی طرف رخ موڑ کر بولی۔  
”ہاں۔“

”اتنا یقین بھی اچھا نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں شرارت نمودار تھی۔

”ایسے تو نہ کہو۔“ اس کا چہرہ اتر گیا، جس پر زودہا ہلکھلانے لگی اور وہ زودہا کی ہنسی کی کھنک کو دیکھتا رہ گیا۔

”بہت کم ہنستی ہیں آپ لیکن ابھی لگتی ہیں ہنستی رہا کر س۔“ زبان نے نظریں پھیر لیں اس کے دل میں ہچکل مچنے لگی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں یونہی بیٹھا رہا تو آپ کے کمرے میں تو آج ہی بڑے اہانے نکاح بڑھا دیتا ہے، چلتا ہوں اب، امی بلا رہی ہیں آپ کو سب باہر بیٹھے ہیں۔“

”سنیں آپ کو میری بات بری لگی۔“ وہ اس کے اچانک بدل جانے والے رویے پر پریشان ہو کر بولی تھی۔

”اعتزاز“

مسی کے شمارے میں شائد کنول کا افسانہ ”اک پل“ حنا اصغر کے نام سے شائع ہو گیا ہے جس کے لئے ہم شائد کنول سے معذرت خواہاں ہیں۔

ہار، صندل ایسی پیشانی پر بندیا لائے بہار، گوری  
کرت سنگھار، گوری کرت سنگھار، ڈیک پر بیچتے  
جواد احمد کے اس گانے کو زیرِ لب گنگتاتے ہوئے  
اور آئینے کے سامنے خود کو سنوارتے ہوئے وہ اس  
گانے کو مکمل طور پر انجوائے کر رہی تھی۔  
آنکھوں میں کاجل کی سلائی لگاتے ہوئے  
اس نے اپنے میک اپ کا آخری مرحلہ مکمل کیا اور  
سبز اور زرد رنگ کے امتزاج والے ہلکے کاڈار اور  
چوڑی دار پاجامے سے ہم آہنگ چڑی کا بڑا سا

آج تو گویا پورے آسمان کے ستارے  
فرش پہ اتر آئے تھے، ہر طرف جگمگ ہو رہی تھی،  
کاشان منزل میں ہر جانب روشنیاں اور رنگ  
برنگے پیراہنوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے،  
اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو سے پورا گھر ہلک رہا  
تھا، دھول کی تھاپ کے ساتھ ساتھ ہی ڈیک کی  
آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔  
جوڑے میں جوہی کی بنی ہانپہ میں ہار  
سنگھار، کان میں جگمگ بالی پتہ، گلے میں بجنو

## ناولٹ

دوپٹہ شانے کے ایک طرف ڈالا اور دوسرے  
شانے پر سیاہ ریشمی گیسوؤں کی چوٹی ڈالی، جس  
کے بلوں کو موسیے کے گجرے کی لڑیوں سے چمپا  
دیا گیا تھا، سفید مرمریں ہاتھوں کی کلائیوں میں  
بیچنگ چڑیاں چڑھا کر اس نے گولڈن سادہ  
لیکن نسبتاً بڑے ہالے کانوں میں ڈالے ہی تھے  
کہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے موبائل کی بجتی رنگ  
ٹون نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔  
”امی کالنگ“ کے جھپکتے نام کو دیکھ کر اس  
نے تیزی سے موبائل اٹھا کر ریسو کا بٹن دھپایا اور  
کانوں سے لگایا تو حسب توقع غصے بھری آواز  
نے اسے منہ بنانے پر مجبور کر دیا اور وہ منہ نہ کر  
بولی۔

”امی صبح سے تو کاموں میں لگی ہوں، اب





”صہیب آپ بھی ناں، باز نہیں آئیں  
مے، لائیں یہ تھال مجھے دیں آپ یہاں کیا  
کرنے آئے ہیں، آپ کے ذمے تو کھانے کا  
انتظام تھا ناں۔“

”لائٹ جانے والی ہے تو ذرا جزیئر میں  
پیٹرول چیک کرنے صحت پر جا رہا تھا، مگر میں  
سارے منصوبے خاک میں ملا دیتی ہو۔“

”کیا مطلب؟“ وریشا نے صہیب کے اس  
جواب میں آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا تو اس نے  
اپنے ہاتھوں میں پکڑے دونوں تھال فرش پر  
دیوار کے کناروں سے لگا کر رکھے اور خود اس کے  
سبز و زرد چڑیوں سے بھری نازک کلائی کو نرمی  
سے تھام لیا اور پھر اس کی کلائی میں بندھے موچیا  
اور گیندے کے سکنٹا کو ذرا سا کھمایا اور سرخ  
مہندی سے رچے ہاتھ کو ناک سے نزدیک لے جا  
کر یوں گہرا سانس لیا گویا وہ ان پھولوں اور حتا  
کی مہک اپنے تن میں رچا بسا لینا چاہتا ہو اور  
ایسا کرتے ہوئے ایک گونا گویا اطمینان اس کے  
گندے چہرے پر پھیل رہا تھا مگر وریشا کے اندر تو  
گویا پچھلے مٹی مٹی مٹی اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے  
گھبرا کر تیزی سے اپنا ہاتھ منہ سے لے لیا تھا۔

”خدا کے لئے صہیب کیا کر رہے ہیں  
آپ؟ کوئی دیکھ لے گا تو بلاوجہ باتیں بنیں گی۔“  
وریشا کو یوں نروس ہوتا دیکھ کر اس نے فرش  
پر سے تھال اٹھا کر واپس اسے تھمائے اور سینے پر  
ہاتھ باندھ کر ایک طرف ہو گیا اور راہداری میں  
بھاگتے ہوئے بچوں کو دیکھنے لگا اور زیر لب  
بوڑوانے لگا۔

”کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ کیا لوگ  
نہیں جانتے کہ ہم مگھیر ہونے کے علاوہ فرسٹ  
کزن بھی ہیں، کیوں زمانے کو بدنام کرتے ہیں  
لوگ جب خود ہی دوری.....“ صہیب نے جان

اتنی دیر تو لگتی ہے تیار ہونے میں، آخر میرے  
اکلوتے بھائی کی شادی ہے، اچھا اب ٹینشن نہ  
لیں، میں بس نیچے آ رہی ہوں، ارے نہیں کسی کو  
نہ سمجھیں، دہی تو تھال میں لے آؤں گی، جی  
جی فکر نہ کریں میں اچھی طرح لاکڈ کر دوں گی  
کمرہ، بس آپ رہیں ٹافون میں آ رہی ہوں۔“  
اس نے ماں کو مطمئن کیا اور پھر موہاں کلائی میں  
بندھے جھوٹے سے پاؤچ میں ڈال کر پاؤچ بند  
کیا، پیروں میں کولہا پوری چپل چڑھا کر اور  
ڈریسنگ ٹیبل پر دھرے ایٹن اور مہندی سے سجے  
تھال دونوں ہاتھوں میں ایک ایک اٹھا کر کمرے  
سے باہر آ گئی، باہر راہداری میں کھیلنے بچوں میں  
سے ایک کو اشارے سے بلوا کر دروازہ لائڈ کر دیا  
اور خود نیچے جانے والے راستے کی طرف قدم  
بڑھا دیئے، اس کے ایک ہاتھ میں ایٹن کا تو  
دوسرے میں مہندی کا تھال تھا، راہداری پر پہنچے  
بھی آنکھ پھولی کھیلنے میں مصروف تھے، وہ ان کو  
دیکھتے ہوئے اور ”ہو بھو“ کا نعرہ لگاتے ہوئے  
خراں خراں قدم بڑھا رہی تھی کہ یکدم اسے لگا  
کہ اس کے دونوں ہاتھوں سے تھال نکل گئے  
ہیں، قریب تھا کہ گھبراہٹ کے مارے اس کی چیخ  
نکل جاتی، اس نے چونک کر سامنے نگاہ کی تو  
دونوں ہاتھوں میں تھال تھامے مد مقابل کو دیکھ کر  
اس نے لب سختی سے سمجھنے لگے اور تھال کو واپس  
اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے آگے بڑھائے تو  
تھالوں کو اور دور کیے جانے پر اس کے چہرے پر  
مصنوعی غصہ ابھر آیا، تب سامنے والے کی لجاجت  
بھری آواز نے وریشا واجد کو مسکرانے پر مجبور کر

دیا۔  
”کیوں اپنے ان نازک ہاتھوں کو تکلیف  
دیتی ہو، کچھ کام ہم خاکساروں کو بھی کہہ دیا کرو  
نا۔“

بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر کن اکھیوں سے اسے دیکھا تو وہ بے چین ہو گئی۔

”آپ میری بات کا غلط نہیں لیں پلیز، ہمارے رشت کی نوعیت میں بدلاؤ آیا ہے تو لوگوں کی نظروں کا زاویہ بھی بدل گیا ہے، یہ بات شاید آپ مرد ہونے کے باعث محسوس نہیں کرتے، پورا گھر بھرا ہے، نیچے مایوں کے پنڈال میں اپنے پرانے سب مہمان جمع ہیں، ایسے میں بے حیائی کے القابات سے نوازنے میں زرا دیر نہیں لگا میں گے لوگ، بے سرو پاتا میں بننے میں زرا دیر نہیں لگتی، ہمارا رشتہ بہت نازک موڑ پر ہے ابھی اور لوگوں کا تو آپ کو پتہ ہے، خود سب کچھ پاس ہو نہ ہو، دوسروں کو پھلتا پھولتا کم ہی دیکھ پاتے ہیں، بس ایسے ہی لوگوں کی سوچ اور رویے سے ڈرتی ہوں میں۔“ دریشانے گویا اپنی صفائی پیش کی تھی، پھر گہرا سانس لے کر وہ قدم بڑھانے کو گئی کہ کسی خیال کے تحت رک کر مڑی اور اس کے زمین کو گھورتے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں البتہ اپنی ایک غلطی تھی آپ دور کر لیں، آپ کا وجود، آپ کا ساتھ یہاں تک کہ آپ کا سایہ مجھے سکون اور عافیت کا احساس دیتا ہے، البتہ آپ کی دوری اور غلط مجھے خوف، وحشت اور سنائے کی کھاٹی میں دھکیل دیتی ہے۔“ دریشا کی زندگی ہوئی آواز پر صہیب چونک کر مڑا اور تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”ارے یاریوں نہ کرو، آئی ایم سوری، غلطی میری ہی تھی، کیا کروں تمہارے اس روپ نے تمہارا دیوانہ بنا دیا تو بس دیوانگی کا اظہار کر بیٹھا، بت آئی پر اس اب ایسا نہیں ہوگا، اچھا سنو ایک مشورہ چاہیے تم سے۔“ وہ اچانک سنجیدہ ہوا تھا۔

”کیا مشورہ؟“ دریشا حیرت سے بولی

تھی۔

”یار میں سوچ رہا تھا کہ بس اب اپنی رخصتی بھی کروا دی لوں، کیا خیال ہے؟“ صہیب سے کہا تو ایک لمبے تو دریشانے اسے گھورا پھر بے ساختہ ہنسی چلی گئی۔

”اف آپ تو واقعی فضول ہیں؟“

”یار میں تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں اور تم ہو کہ مذاق اڑا رہی ہو۔“ صہیب نے منہ بتایا تھا۔

”افوہ، ارے رخصتی لڑکیوں کی ہوتی ہے، لڑکوں کی نہیں۔“

”اودہ اس لئے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو اپنا گھر چھوڑ کر جانا ہوتا ہے۔“ صہیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جی اب آئیے کچھ عقل شریف میں۔“

”ارے یار تمہارے پیار میں اوپر سے اس قاتل روپ نے دل و دماغ سب بیکار کر دیے ہیں، بس اب تم آ جاؤ، میری زندگی میں جلدی سے انہیں قابو میں کرنے کے لئے بولونا، بات کروں امی سے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

”ارے پہلے بھائی کی شادی تو منینے دیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اس میں دن ہی کتنے باقی ہیں، بہانے مت بناؤ، مجھے تو تمہارا موڈ ہی نہیں لگ رہا۔“ وہ نروٹھے پن سے بولا تھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا، اچھا چلیں جو آپ کی مرضی وہی میری خوشی، اب تو جانے دیں، رسم شروع ہونے والی ہے۔“ دریشانے منت بھرے لہجے میں کہا اس نے مسکراتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا، تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”دریثا تم سورہی ہو کیا؟“ عمارہ نے نیم وا دروازہ سے جھانکتے ہوئے کہا تو لحاف میں محسوس نیم دراز دریثا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ارے نہیں مجھے دن میں نیند کہاں آتی ہے، بس ایسے ہی تھکن محسوس ہو رہی تھی تو آنکلیں موند لی تھیں، آ جاؤ تم بھی ادھر ہی۔“ دریثا نے لحاف کھسکا کر عمارہ کے لئے جگہ بنائی، عمارہ اس کی خالہ زاد کزن اور اب اکلوتی بھابھی بھی تھی۔

”ہاں ہار، میں بھی بور ہو رہی تھی، آج سے تمہارے بھائی صاحب نے آفس جوائن کر لیا ہے اور لی وی کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں اسکرین دیکھنے کا میرا اسٹیما بھی نہیں رہا، پتہ ہے تمہیں۔“ ”اچھا جی تو بھابھی جی بور ہو رہی ہیں، یاد آ رہی ہے ناں۔“ دریثا نے شرارتی انداز میں اسے ٹھوکا دیا، وہ دونوں بہت اچھی دوستیں بھی تھیں اس لئے رشتے کے بدلاؤ نے بھی تکلف کی دیوار حائل نہیں کی تھی۔

”بکومت، آپ شاید بھول رہی ہیں میڈم، ہم دونوں پہلے دوستیں ہیں بعد میں مندر بھادج، کتنے دنوں سے تم سے نصیحتی کپ شب ہی نہیں ہو سکی، پہلے شادی کے ہنگامے رہے پھر دونوں نے مصروف کر دیا، تم سناؤ تمہارے ان کے کیا مزاج ہیں، موصوف کی تو موبائل سیکری بھر گئی ہوگی، تمہارے فوٹو لینے، خوب آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔“ اب کی بار عمارہ نے اس کی گھنجائی کی۔

”توبہ ہے یوں الزام تو نہ دھرو، تم نے کہاں دیکھا بھلا، مجھے پوز دیتے ہوئے۔“ دریثا نے ٹکا ہیں چرا نہیں تو عمارہ ہنس پڑی۔

”ارے ڈیرہم تو اوڑنی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں، ویسے دریثا تم واقعی خوش نصیب ہو کہ مصیب اتنا چاہتا ہے تمہیں، بات سنو تم بھی اسی قدر

چاہتی ہونا اسے۔“ عمارہ نے سرگوشی کی کہ۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا، تمہیں پتہ ہے کہ ہم بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ہماری پسند ناپسند، مزاج کس حد تک ملتے ہوئے ہیں، عمارہ میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ ہمارے فیملے کو ہمارے بڑوں نے بھی مان لیا۔“ دریثا نے جذب کے عالم میں کہا۔

”ہاں دریثا، ٹھیک کہہ رہی ہوں، محبتوں کا انجام خوش کو اور نہیں ہو اگر نا، سانج نامی اور انانی دیواریں اکثر دو دلوں کو ملنے نہیں دیتیں، ویسے دریثا تم نے کبھی سوچا ہے کہ اگر تمہارے معاملے میں بھی تمہیں حمایت کے بجائے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تو؟“ عمارہ نے اس کی طرف بخور دیکھتے ہوئے کہا۔

”پہلے سوچا کرتی تھی بہت ڈرتی بھی تھی، مگر مصیب نے ہمیشہ یہی کہا کہ جو بھی ہوگا ہمیں اسے اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرنا ہوگا اور آخر اللہ نے کرم کر دیا، اب تو ماشاء اللہ سب سیٹ ہے، مصیب تو ڈیٹ فکس کروانے کے درپے ہیں۔“ دریثا نے شرمناک کہا تو عمارہ نے اس کے سرخ گالوں پر زور دار چٹکی کاٹی۔

”اچھا جی، یہ بات ہے تو آپ آج اس خوشی میں شام میں مجھے اسٹریپیری آئس کریم کی ٹریٹ دے رہی ہیں۔“

”اف تو بہر مجائے گی کم بخت، اتنی سردی میں آئس کریم کھائے گی تو۔“ دریثا نے اپنے گال سہلاتے ہوئے کہا تو عمارہ نے اس کے انداز کے مزے لیتے ہوئے اس کی کمر پر ایک دھپ بھی رسید کر دی۔

”نمریں تیرے دشمن، سنجوس لڑکی، سیدھی طرح ہاں کر دے، نہیں تو مجھے دوسرے طریقے

بھی آتے ہیں۔“

”اوتی ماں، بس کر دے خالم، سردی میں ایسے کرارے وار نہ کر، کھلا دوں گی ندیدی کہیں کی۔“ دریشا نے گدگدی کے لئے اس کے بڑھے ہاتھوں کو دیکھ کر تیزی سے سر ہلایا تو اس کی حالت دیکھ کر عمارہ کے حلق سے قہقہہ برآمد ہو گیا۔

☆☆☆

”ای بابا کہاں ہیں آپ جلدی آئیں۔“ مصیب نے آس سے آکر لاؤنج میں موجود شو کیس پر بیگ رکھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بچوں کے سامنے کھڑی عفت کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔

”ارے آپا آپ؟ آپ کب آئیں؟ ای کہاں ہیں؟“ اس نے یکے بعد دیگرے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”بس دوپہر میں، بچوں کے ایگزاحر قسم ہوئے تو شور مچا دیا کہ نانا ابو کے گھر چلیں، ہم نے کرکٹ میچ کھیلتا ہے، ابو بچوں کے ساتھ اوپر ہیں، اب یہ بتاؤ، تم کیوں اتنے بے قرار ہو رہے ہو کہ یوں بچوں کی طرح گھر میں داخل ہوتے ہی امی ابو کی رٹ لگا دی اور پھر بہن کو دیکھ کر نہ سلام دعا کی اور نہ مزاج پوچھا بس سوالوں کی عدالت میں لا کھڑا کیا۔“ عفت آپا نے مذموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سر پر دھیرے سے چپت رسید کی تو وہ غجالت سے گردن کھانے لگا۔

”سوری آپا، وہ دراصل بات ہی کچھ ایسی تھی، مگر نہیں یہ بات میں سب سے پہلے امی ابو کو ہی بتاؤں گا، میں سمجھتے پر جا رہا ہوں، آپ بھی چلیں ناں، آپ کیا کر رہی ہیں یہاں۔“

”میں ذرا بابا کی فرمائش پر گلاب جاسن بنا رہی تھی، اب تم بھی آگئے ہو تو چائے پی لے کر اوپر آئی ہوں بلکہ ایسا کرو تم فریٹس ہو کر آؤ، میں

یہ گلاب جاسن پلیٹ میں نکالتی ہوں، چائے بھی تیار ہی ہے، پھر دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔“ عفت آپا نے رخ دوبارہ چولہے کی طرف موڑتے ہوئے کہا تو وہ جی اچھا کہتے ہوئے بچن سے باہر آ گیا، ساتھ ہی کھن میں لگے بیسن پر کھڑے ہو کر ہاتھ منہ دھوئے، پھر عفت آپا کے ساتھ ٹرے اٹھائے سمیت پر چلا آیا، عفت آپا کے چاروں بچے عادل، جواد، فارہ اور ماریہ مصیب کے دیوانے تھے، کیونکہ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا تھا، عفت آپا جب بھی میکے آتیں وہ بچوں کو خوب گھماتا پھراتا، کھلاتا پلاتا اور مختلف کھیل کھیلتا تھا، سب ہی اس کی بچوں سے محبت دیکھ کر بے حد خوش ہوتے تھے اور عفت آپا تو جب یوں ماموں کو بھانجے بھانجیوں کے لاڈ اٹھاتا دیکھتیں تو بھائی پر صدقے داری ہونے لگتیں۔

”کتنا خیال رکھتے ہو تم ان کا، ورنہ وہاں ان کے دو حیاں میں تو سب کے منہ ہی بنے رہتے ہیں۔“ عفت آپا کے سرسالی ذر روکھے پھیکے لوگ تھے، ساس سر صرف دامادوں اور نواسے نواسیوں پر جان چھڑکتے تھے کیونکہ بقول ان کے بیٹیاں تو پرانی ہوئی، ہوئی ہوئی ہیں، پوتے پوتیاں کا کیا ہے سارا دن ہی سر پر سوار رہتے ہیں، بچے بچے تو ہوتے ہیں مگر انتہائی حساس ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں میں جھپی نفرت و محبت خوب پہچانتے ہیں، شاید اسی لئے بعض بچے اجنبیوں کی گود میں جا کر کلکھلاتے رہتے ہیں اور بعض انہوں کی شکل دیکھ کر کرکک روناشروع کر دیتے ہیں، شاید عفت آپا کے بچے بھی جانتے تھے کہ کون انہیں دل سے چاہتا ہے، جب ہی وہ بھی کبھار ملنے آنے کے باوجود، مصیب سے خوب مانوس تھے، ابھی بھی مصیب آتے ہی ان کے ساتھ کھیل میں لگ گیا



گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔“ جمیلہ بیگم نے مصیب کو گھر کا تو وہ بری سی شکل بنا کر چائے کی چشکیاں لیتے ہوئے بولا۔

”لو جی ہماری تو قدر ہی نہیں۔“ اس کی بسورتی شکل دیکھ کر عفت نے مزے لے۔

”دیے امی، ذرا چپکے سے بتائیے یہ باپ بیٹا آپ کا خیال رکھتے ہیں یا نہیں۔“

”ارے مت پوچھو بیٹا، یہ تمہارا بھائی تو موہاں اور کپھوڑ میں گھس رہا ہے اور ہمارے میاں صاحب، یعنی تمہارے چیتے ابا جان نے تو گویائی دی اور اخبار سے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔“ جمیلہ نے گویا دل کے پھپھو لے پھوڑے۔

”تو بے بیگم مبالغہ آرائی کی بھی حد ہوتی ہے اور روزانہ شام کی چائے کے بعد سے لے کر رات کے کھانے تک آپ کا ”خاندان نامہ“ کون سنتا ہے اور رات میں سونے سے پہلے چائے بنا کر کون کمرے میں لاتا ہے۔“ اب کی بار عابد صاحب نے بیگم کو عدالت میں کھینٹا تو مصیب بھی باپ کے کاغذوں سے آگاہ۔

”رہنے دیں بابا، اب بیٹی آگئی تو ہم باپ بیٹوں کی محبتوں کی قدر کون کرے گا۔“

”آپ دونوں کی محبت ایک طرف اور میری بیٹی کی ایک طرف۔“ جمیلہ بیگم ابرو اچکائے ہوئے کہا تو عفت نے ماں کے رخسار چوم ڈالے۔

”بولو اماں۔“

”اچھا چلیں لڑنا چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ ان نواب صاحب کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ لوگوں نے، خیر سے برسر روزگار ہوئے اور منگنی شدہ ہوئے سال سے اوپر ہونے کو ہے۔“

”ارے میری بیٹی، جیسی رہو، سچ تم نے

تھا، ایسے میں عفت آپا کو اپنے بھائی پر ڈھیروں پیار آ رہا تھا، کیونکہ وہ ماں تھیں اور ماں بچوں کی زندگی میں موجود کسی بھی طرح کی محرومی کو برداشت نہیں کر پاتی، ابھی بھی وہ دل ہی دل میں رب باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے، بھائی کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں، پھر کسی خیال کے تحت انہوں نے اسے آواز دی۔

”مصیب بیٹا چائے تو پی لو، ٹھنڈی ہو رہی ہے اور بچوں تم لوگ بھی آ کر کچھ کھا لو۔“ عفت نے بلایا تو مصیب اور بچوں دونوں ہی صاف سٹہری چھت پر بھیجی درہی پر آ بیٹھے، موسم آج معمول سے کم سرد تھا، تو عابد اور جمیلہ بھی جوزوں کا درد بھلا کر اوپر آ گئے، البتہ دونوں نے خود کو خوب اوڑھ لپیٹ رکھا تھا اور اب کرسیوں پر بیٹھے گھر بیٹی کے ہاتھ کی گرما گرم چائے پیتے ہوئے نواسے نواسیوں کی شرارتیں ابجوائے کر رہے تھے۔

”سچ میں عفت، تمہارے جانے کے بعد تو گھر میں بالکل ہی سناٹا ہو گیا ہے، اب تو جب تم اور بچے آتے ہو تب ہی گھر میں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔“ جمیلہ نے اگلی بیٹی کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو عفت نے آ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”ارے میری اماں، اگر میرا بس چلے تو میں یہیں پڑاؤ ڈال دوں۔“

”اللہ نہ کرے، تم اپنے گھر میں خوش آباد رہو۔“ جمیلہ بیگم ایک دم ہی ہولانی بنیں تو مصیب کو ہنسی آگئی۔

”لو ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، بیٹی کے بغیر دل نہیں لگتا، اور اب ان کے مستقل یہاں رہنے کے خیال سے ہی ڈر رہی ہیں۔“

”ارے تم چپ رہو، بیانی بیٹیاں اپنے



کر دیں، وہ جیلہ کے قدموں میں آ بیٹھا۔

”جیتے رہو میرے بیٹے، اللہ تمہیں یونہی خوش و خرم اور پھلتا پھوٹا رکھے۔“ انہوں نے چھوٹے بیٹے کی طرح اس کے لیے چوڑے وجود کو اپنی آغوش میں بھر لیا تو لمبے بھر کو اسے ان کی مٹاکی تپش پا کر یونہی لگا کہ گویا وہ واقعی ایک چھوٹا سا بچہ ہو، مٹا میں اور ماں کے کس میں واقعی جادو بھرا ہوتا ہے، بندہ لمحوں میں خود کو آسمانوں پر محسوس کرنے لگتا ہے، دنیا کے رنج و غم اور مصائب سے دور، وہ بھی تم آنکھوں سے یہی محسوس کیے جا رہا تھا، ایسے لمبے نصیب والوں کی زندگیوں میں آتے ہیں، اس لئے عفت نے خاموشی سے بڑے بیٹے کو مٹاکی لانے بھیج دیا، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ دعاؤں کی قبولیت کے لمبے سرکتے درختوں سے اور بعض اوقات تو غافل انسان خود ان لمحوں کو ضائع کر دیتا ہے اور وہ غافل نہیں رہتا چاہتی تھیں اس لئے خود بھی ماں کے پہلو میں آ بیٹھی تھیں، عابد صاحب مسکراتے ہوئے ماں اور بچوں کی محبت کو دیکھ رہے تھے، آسودگی ان کے چہرے پر عیاں تھی۔

☆☆☆

”بہت بہت مبارک ہو آپ کو، سچ میں بہت خوش ہوں آپ کی پردوشن پر۔“ رات دس بجے کھانے سے فارغ ہو کر مصیب نے اپنی پردوشن کی نیند دینے کے لئے بیٹج کیا تو اس نے فوراً ہی کال کر کے اسے دس کیا تھا، خوشی کی ترنگ اس کی آواز سے بھی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی، مگر مصیب اپنے لئے اس کے چہرے اور آنکھوں میں اترتے رنگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے بے چین ہو اٹھا تھا اور اپنی اس خواہش کا اس نے فوراً ہی دریشا سے اظہار بھی کر دیا جیسے وہ یہ موقع ضائع نہ کرنا چاہتا ہو۔

میرے منہ کی بات چھین لی، میں یہی سوچ رہا تھا اسی بہانے گھر میں رونق بھی لگ جائے گی۔“ عابد صاحب سچ میں خوش ہو گئے، انہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔

”ہاں، بھئی میں بھی سوچ رہی ہوں، وہ بچی ایسی پیاری اور خوش مزاج کہ کم از کم اس سے ہی دل لگا رہے گا میرا۔“ جیلہ کے لہجے میں بھی دریشا کے لئے محبت تھی۔

”جی جناب نوشے میاں آپ کی کیا رائے ہے اس بارے میں۔“ اب کہ عفت کا رخ مصیب کی جانب تھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، جیسے آپ بڑوں کی مرضی۔“ مصیب نے معصوم سی شکل بنا کر نظریں جھکا کر کہا تو جیلہ نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کی کنی بلا میں لے ڈالیں۔

”کیسا فرما کر دار بچہ ہے میرا۔“

”اماں آپ اس کی شکل پر نہ جائیں، ایسے ہی شرما حضوری کی ایکٹنگ کر رہا ہے آپ کے سامنے، ورنہ مجھ سے پوچھیں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں میں، دل میں تو اس کے لڈو پھوٹ رہے ہیں اس وقت۔“ عفت آیا کا شرارتی لہجہ پر اس نے حیرت سے انہیں چونک کر دیکھا۔

”دھت تیرے کی، لڈو سے یاد آیا، میں مٹھا تو نیچے ہی بھول آیا۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”کیسی مٹھا کی؟“ اب کی بار عفت چونکی تھی۔

”ارے میری پردوشن کی مٹھا کی۔“

”ارے واہ مبارک ہو بہت بہت۔“ عفت کلکلا اٹھیں۔

عابد نے اس کا ماتھا چوما تو ماں نے بانہیں دا

”دریشا میں اپنی یہ خوشی تمہارے ساتھ بھی  
 سلیم ریٹ کرنا چاہتا ہوں، بولو آؤ گی نا؟“  
 ”لو جی کر لوکل، یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات  
 ہے، ویسے بھی میں آپ کو یوں خالی خالی مٹھائی پر  
 بچنے والی ہوں نہیں، ٹھیک ٹھاک ٹریٹ لوں گی  
 آپ سے چائنا ٹاؤن میں، بولیں منظور۔“ اس کی  
 شرارتی آواز ابھری تو مصیب تو مجموعہ ہی اٹھا۔  
 ”بالکل جناب منظور۔“

”مگر مصیب ایک مسئلہ ہے؟“ وہ ایک دم  
 سنجیدہ ہو گئی تو وہ چونک اٹھا۔  
 ”کیا ہوا خیریت؟“

”آپ کو اپنی درخواست پہلے اقوام متحدہ  
 میں جمع کرائی پڑے گی، یوں تو آپ کی چچی جان کی  
 منگنی کے بعد یوں گھومنا پھرنا، ملنا ملنا کچھ پسند  
 نہیں۔“ وہ انفرادی سے بولی تو مصیب نے اسے  
 تسلی دی۔

”ڈونٹ وری یار، عفت آپا ہے ناں، ہمارا  
 سفارتی سفیر، منٹوں میں مسئلہ حل ہو جائے گا، سو  
 چل اینڈ ریڈی فارن۔“ اسے گلنٹہ لہجے سے  
 دریشا کے لہجے میں پھر ریاست پیدا ہو گئی۔

”اوکے باس، آپ بھی تیار رہیے اپنا  
 والٹ خالی کرنے کے لئے۔“ وہ ہنسی تو مصیب  
 بھی کھلکھلا اٹھا تھا۔

عفت آپا نے واقعی اجازت نامہ حاصل کر  
 لیا تھا اور وہ اپنے وعدے کے مطابق اسے چائنا  
 ٹاؤن لے آیا تھا، جہاں آرڈر دینے کے بعد اب  
 وہ آنے والے سامنے بیٹھے تھے، میرون مگر کاسوٹ پہنے  
 اور شانوں کے گرد میرون اور سیکل کلر کا دوپٹہ  
 لپیٹے، لائٹ میک اپ اور ڈھیلے ڈھالے انداز  
 میں ہانڈی مگنی پونی ٹیل کے ساتھ وہ سیدھا  
 مصیب کے دل میں اترے جا رہی تھی، اس کی  
 گلابی رنگت اور گلابی ہو گئی تھی، چہرے پر بکھرے

شریلے رنگ مصیب کو ایسا دیوانہ بنا رہے تھے کہ  
 وہ چاہا کر بھی اس کے چہرے سے نظر نہیں اٹھا پا  
 رہا تھا اور دریشا جو بظاہر ارد گرد دیکھنے کے باوجود  
 خود پر اس کی نگاہیں واضح طور پر محسوس کر رہی  
 تھی پرل ہوئے گی تھی، آخر اس سے رہانہ کیا اور  
 وہ بول ہی اٹھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں، کیا پہلی بار دیکھا  
 ہے، لوگ کیا کہیں گے۔“

”اوپنہ، ڈونٹ ڈسٹرب می، اب جانے  
 سب ملاقات ہو، میں تمہارا ہر نقش دل و دماغ  
 میں محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے کی  
 گنبدیتا ہر حجاب کے مارے اس کی تھیلیاں بھیک  
 نکلتی۔

”اچھا باتیں بنانا چھوڑیں یہ بتائیں پر موشن  
 اور اپ گریڈیشن کے بعد آپ کے کام کی نوعیت  
 وغیرہ کیا ہوگی۔“ اسے سنجیدہ ہوتا دیکھ کر مصیب  
 بھی سنجیدہ ہو گیا، ویسے بھی وہ خود بھی اس سے یہ  
 سب سیر کرنا چاہتا تھا، وہ اس کی منگیتر ہونے کے  
 ساتھ اس کی ہم مزاج ہونے کے باعث دوست  
 بھی تھی، اس لئے وہ اسے مکمل تفصیلات سے آگاہ  
 کرنے لگ گیا۔

”بس بارہوا ڈائریکٹر آیا کہنی میں تو شاید  
 اپنی ویلو بڑھانے کے لئے اس نے کچھ مثبت  
 تبدیلیاں کیں، کچھ لوگوں کی تنخواہیں بڑھا دیں،  
 کچھ کی رکی ہوئی پروموشن کر دائیں، بس انہی خوش  
 نصیبوں میں میرا نام بھی آ گیا۔“

”پہلیں یعنی آپ کے آفس میں آئی تبدیلی  
 خوش آئندہ ثابت ہوگی۔“ دریشا نے مسکراتے  
 ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے، مگر پروموشن کے ساتھ ذمہ  
 داریاں بھی بہت بڑھ گئی ہیں، ظاہر ہے زیادہ  
 تنخواہ دیں گے تو کام بھی تو لیں، ورکنگ آور بھی

بڑھ جائیں گے۔“ مصیب نے مزید تفصیل بتائی تو اس بار وہ خوش ہونے کے بجائے تقریباً چیخ اٹھی۔

”بارہ گھنٹے، آپ نے کیوں ایکسپٹ کی ان شرائط پر پردوشن۔“

”دریٹا بچوں جیسی باتیں مت کرو، یہ تو ناشکری ہوئی اور محنت کریں گے تو ہی صلہ ملے گا، کمپنی نے ہم پر اعتبار کیا، ہمیں اس قابل سمجھا، ہمیں پردوشٹ کیا تو کیا اب ہماری ذمہ داری نہیں کہ ہم بھی اپنی وفا داری اور اہلیت ثابت کریں مالکان۔“ اس نے رمان سے کہا تو وہ نسبتاً دھیمے لہجے میں بولی۔

”بٹ آئی ایم ورڈ، اتنی محنت کر کے خدا خواستہ آپ بیمار نہ ہو جائیں۔“

”یاریجی تو عمر ہے کام کرنے کی، آج محنت کریں گے تو کل بیٹہ کرکھائیں گے نا، ویسے بھی اب پریکٹیکل لائف شروع ہونے والی ہے، تم میری زندگی میں آنے والی ہو تو میری ذمہ داریاں بھی بڑھ جائیں گی۔“ مصیب نے اس کا نرم گلایا غروڈی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام کر اس کی آنکھوں میں جماتے ہوئے کہا۔

”آپ میری فکر میں ہلکان نہ کریں خود کو، میرے لئے سب سے اہم آپ کا وجود ہے، اللہ کے کرم سے نہ میں ایسی خواہشوں کی ماری اور چیزوں کی ترسی ہوئی ہوں کہ میری تمنائیں اور آرزو میں پوری کرنے کے لئے آپ خود کو خوار کریں اور نہ ہی ایسی آسائشوں کی عادی ہوں کہ میرے اسٹیٹس کے شایان شان زندگی فراہم کرنے کے چکر میں آپ اپنی زندگی اجیرن کر ڈالیں، پلیز میں جیسی ہوں ویسی ہی خوش ہوں، میری خاطر خود کو ہلکان نہ کریں۔“ وہ اب روہاسی ہونے لگی تھی، وہ مصیب کو بے پناہ چاہتی تھی اور

محبت کرنے والے محبوب کی ذرا سی بے گہرائی پر بھی تڑپ اٹھتے ہیں۔

”میری جان تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے تو میں اس قدر مطمئن ہوں تمہیں پا کر، کیونکہ تم حال میں اور حقیقت میں زندہ رہنے والی ہو، لیکن بنگی کچھ پانے کے لئے کچھ کھانا تو پڑتا ہی ہے، دیکھو لی پریکٹیکل میرے اوپر ای بابا کی ذمہ داریاں بھی ہیں، پھر آگے کل کو ہمارے بچے ہو جائیں گے ان کے بہتر مستقبل کے لئے بھی تو کچھ پلان کرنا ہے یا نہیں۔“ وہ اب دھیرے دھیرے اس کی پیٹنی کی پشت سہلا رہا تھا، بچوں کے ذکر پر وہ ہلش ہو گئی، تو وہ ہنس پڑا۔

”پاکل لڑکی، ہم متوسط طبقے کے لوگوں کا بھی تو مسئلہ ہے کہ نہ ہم گھر کے دروازے پر کاشن کا پردہ ڈال کر اپنا احوال بیان کر سکتے ہیں نہ غروڈ غروڈ سے، گردن تان کر خود کو براڈ کاش کی لائن میں کھڑا کر سکتے ہیں، یعنی صاف کھلتے نہیں، سامنے آتے بھی نہیں کہ مصداق، گویا ایک طرح سے منافقوں والی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“ اس مرتبہ مصیب کے لہجے میں کئی در آئی تھی، جسے دریشانے بہت گہرائی سے محسوس کیا تھا، وہ اس وقت ایک فرسٹڈ لو جوان لگ رہا تھا، جو کرنا کچھ چاہتا ہیں اور کرتے کچھ ہیں، بے بس اور مجبور، وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا موڈ کیسے بدلے، خدا شکر دیکر کھانا لے آیا چائیز رائس اور بھاپ اڑتے پنچورین نے ٹیکل پر آتے ہی رونق لگا دی، من پسند مینو سامنے دیکھ کر دونوں کا موڈ بھی خود ہی بدل گیا، دونوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو شروع ہو جانے کا اشارہ کیا اور اپنی پلیٹوں میں کھانا ڈالنے لگے۔

☆☆☆

”پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟“ نزہت نے

تہوہ کی پیالی میاں کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا تو واجد جونی دی کا ٹاک شہود دیکھنے میں لگن تھے چونک اٹھے۔

”ہونہہ، کس بارے میں بھی؟“ انہوں نے پیالی تھامتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے کیا بالکل ہی یادداشت چلی گئی ہے آپ کی اور پہلے ذرا یہ نی دی بند کریں، تاکہ میری بات دھپان سے سن سکیں۔“ نزہت میاں کا رخ واپس نی دی کی طرف مڑتے دیکھ کر چڑھ گئیں۔

”انہوہ کیا مصیبت ہے بھی، ایک تو تمہارے سارے مسئلے اسی وقت کھڑے ہوتے ہیں بندہ سکون سے نی دی بھی نہیں دیکھ سکتا، بولو کیا بات ہے، کیا آفت آن پڑی ہے۔“ واجد کو یوں بیوی کا بولنا سخت برا لگا تھا، وہ یوں بھی اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف بات کیے جانے پر برہم ہو جاتے تھے، نزہت نے میاں کا پارہ پانی ہوتے دیکھا تو مجبوراً اپنا لہجہ مدہم کر لیا، کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ اگر واجد ایک بار پھر گئے تو ایک طرف تو انہیں ٹھنڈا کرنا مشکل ہو جائے گا اور دوسری طرف ان کی بات بھی ادھوری رہ جائے گی، اس لئے اب کی بار وہ مدہم لہجے میں صفائیاں دیتے ہوئے میاں سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”آپ مصروف ہوتے ہیں، اب گھر کے مسئلے مسائل تو گھر میں ہی ڈسکس کیے جاتے ہیں، پھر آپ کو پتہ ہے میں جب تک دل کی بات آپ سے نہ کر لوں اطمینان نہیں ہوتا مجھے۔“

”ہونہہ ٹھیک ہے، اب بول بھی دو۔“ واجد کا لہجہ ہنوز گہرا ہوا تھا۔

”آپ کو بتایا تھا، آج مغرب کے بعد

عابد بھائی جیلہ بھابھی عفت کے ساتھ آئے تھے، بتا رہے تھے کہ مصیبت کی پروموشن ہو گئی ہے، مٹھائی بھی لائے تھے اور چاہ رہے تھے کہ اب ہم وریشا اور مصیبت کی ڈیٹ فکس کر دیں، دبسر میں ڈھائی سال ہو جائیں گے خیر سے میٹنگی کو، میں نے کہا آپ سے بات کر کے بتاؤں گی کہ کون سی ڈیٹ مناسب رہے گی؟“

”اچھا تو یہ اہمیت رہ گئی ہے میری، تم سے کس نے کہا کہ میں وریشا کی شادی کرونگا ابھی، اور عابد بھائی کو تو تین نہیں ہوئی کہ میں وریشا کا باپ ہوں سربراہ ہوں، میرے سامنے بات کرتے۔“ واجد نے خالی پیالی باقاعدہ مڑے میں پٹختے ہوئے کہا تو نزہت میاں کے بدلے تئور دیکھ کر بری طرح چونک پڑیں، انہیں لگا تھا بیٹی کی شادی کی بات سن کر ان کا موڈ بہتر ہو جائے گا، مگر یہ ان کی خام خیالی نکلی، پھر بھی انہوں نے حتی الامکان خود پر قابو پاتے ہوئے ایک بار پھر میاں کو صفائی دینے کی کوشش کی۔

”آپ دس بجے تک نہیں آئے تو عابد بھائی نے جانے کا کہا کیونکہ سردی بڑھ رہی تھی، عفت آئی ہوئی تھی اس لئے وہ لوگ چلے آئے آپ کو پتہ ہے عفت سسرال کی وجہ سے جھمشکل ہی لکل پانی ہے، آپ ذرا ٹھنڈے مزاج سے سوچئے، اچھا ہے ہم بیٹی کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو جائیں گے ڈھائی سال معمولی عرصہ تو نہیں، اتنے طویل عرصے منگنیاں رہنا مناسب نہیں، میں تو صرف اسی لئے کہہ رہی تھی کہ اسی سال کی ڈیٹ فکس ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”ڈھائی سال ہو گئے مصیبت پانچ سالوں سے نوکری کر رہا ہے اور پہلی دفعہ پروموشن سننے میں آئی ہے، کتنی خواہ ہو گئی ہوگی صاحبزادے کی جو شادی کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو گئے

زندگی کی حیثیت ایک کاروبار جیسی رہ گئی تھی، مگر مصیب اپنی زندگی کے لئے، اپنی وریشا کے لئے، اپنی زندگی کے سب سے مشکل موڑ پر کھڑا تھا، ناخدا کے آگے جھکنا، ایمان والے کے لئے بڑا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے، مگر وہ سب بھلا کر سراپا سوال تھا۔

”چچا جان! یہ امیری اور غریبی کی دیواریں انہوں کے درمیان کھڑی نہیں کی جاتیں، ہم آج آپ کا اسٹیشن بھلے ہی کم کیوں نہ ہو مگر کیا ہمارے درمیان موجود رشتہ، خونی رشتہ ناپید ہو گیا ہے جو یوں یکا یک آپ نے انہوں کو بھلا دیا ہے، کیا واقعی دولت میں اپنی طاقت ہوتی ہے کہ محبت کا دم توڑ دے اور احساس کو فنا کر دے؟“

”تم ہوتے کون ہو مجھے حج غلط کا فرق بتانے والے؟ مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟ میں اپنی اولاد کا اچھا براتم سے زیادہ سمجھتا ہوں، تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم وریشا کے راستے سے ہٹنے کا کیا لوگے، میں خوب جانتا ہوں تم جیسے مونیج پرسن کو، تم وریشا کے ذریعے میری دولت تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ میں دو جمع دو کرنے کا عادی، دو میں دو نکالنے کا نہیں، سوئٹل سی پور آفر اینڈ اسٹاپ دس آل ڈرامہ۔“ الفاظ تھے کہ بر چھیاں، مصیب کو لگا کہ واجد نیازی نے بے در پے وار کر کے اس کا وجود لہو لہان کر دیا ہے مگر وہ مرد مومن تھا، سوتن کر کھڑا تھا، زخموں کو چھپا کر دیدہ دلیری سے مسکراتے ہوئے دشمن کو زیر کرنے کے لئے اس نے اپنا کاری وار چلایا تو واجد نیازی درد سے ہلکا اٹھے۔

”ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی مسٹر واجد نیازی اور مصیب کا ایمان تو ہرگز بکاؤ نہیں، ویسے اگر کوئی حلال کمائی کا ایک آنہ دے کر مجھے خریدنا چاہے تو میں سوچ سکتا ہوں مگر افسوس، صد افسوس آپ

ہیں، بات سنو زہمت بیگم میری بیٹی مجھ پر بھاری نہیں ہے اور میں یوں اس کے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتا، سمجھ نہیں تم۔“ واجد کی طعنائی آواز نے زہمت کے اندر تھلکے مچا دیا تھا، انہوں نے بے یقینی سے شوہر کی طرف دیکھا اور ڈوبے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں واجد صاحب، میں بالکل نہیں سمجھی، کیونکہ یہ رشتہ آپ کی نشا پر ہوا تھا، بچوں کی پسند میں آپ بھی راضی تھے، مصیب آپ کا جیتجا آپ کو بہت عزیز تھا، اس کی کردار اور شرافت کے گن گایا کرتے تھے آپ، اب یہ یکا یک وہ آپ کی بیٹی کے لئے نا اہل کیسے ثابت ہو گیا ہے، میں نہیں سمجھی واجد صاحب۔“

”تم سمجھ بھی نہیں سکتیں، کیونکہ تم ایک بے وقوف عورت ہو، میں بھی تمہارے ساتھ رہ رہا حق ہو گیا تھا، آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی میرے، بھلے بچے اپنا اچھا برا کیا چاہیں اور زندگی گزارنے کے لئے محض شرافت کافی نہیں، ماضی میں، میں نے ایک غلط فیصلہ کر دیا تو اب وقت آ گیا ہے کہ میں اسے سدھاروں، وریشا کی شادی اب مصیب سے نہیں ہوگی، صاف کہہ دو ان سے میری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔“ واجد صاحب تنفر سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لاؤنچ سے چلے گئے اور کمرے سمیت زہمت کے وجود میں سناٹا سا گیا۔

☆☆☆

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ واجد نیازی کے آگے کھڑا تھا، محبت یونہی مجبور کر دیا کرتی ہے، وریشا کی محبت نے اسے یہ عدالت لگانے پر مجبور کر دیا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ تمام کارروائی بے معنی ٹھہرے گی کیونکہ آج وہ اپنے چچا کے نہیں بلکہ ایک بزنس مین کے آگے کھڑا تھا، جس کے لئے

یاسر اب چسکایا لے رہا تھا مگر اس کی نظریں بدستوری دی اسکرین پر تھیں۔

”ویسے یاسر اگر انہوں میں احساس کا رشتہ ختم ہو جائے تو اپنائیت بھی ختم ہو جائے گی بلکہ سرے سے رشتوں کا ہی وجود نہیں رہے گا ہے نا؟“ عمارہ بھی اب کافی کے کھونٹ کھونٹ حلق میں اتار رہی تھی۔

”کیا بات ہے فلسفہ بول رہی ہیں ہماری ٹیکس صاحبہ آج تو، ویسے بجا فرمایا آپ نے۔“ اب کہ یاسر نے عمارہ کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور نگاہوں کا رخ دوبارہ فی دی کی طرف کر دیا۔

”میں زندگی کی حقیقت بیان کر رہی ہوں یاسر، ویسے مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اقرار کیا ہے کہ آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں، یعنی آپ اتنے بے تجربہ نہیں، جتنا میں سمجھ رہی تھی۔“ عمارہ کے لہجے کی سنجیدگی اور مبہم لفظوں کی گردان نے یاسر کو اپنی توجہ فی دی کی طرف سے ہٹا کر عمارہ کی طرف کرنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا ہو گیا ہے؟ آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ خیریت تو ہے؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ ”مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کرنے کے بجائے اگر آپ اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالیں تو خود سے بس ایک سوال پوچھ لیتے کہ آپ اس قدر بے حس کیسے ہو گئے تو زیادہ بہتر ہوتا یاسر۔“

”یاد تھا رادماغ خراب ہو گیا ہے یا تم میرا دماغ خراب کرنے پر تلی ہوئی ہو یہ بے معنی دے رہے ہو یا باتیں کر کے، سیدھی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ جاؤ یہاں سے۔“ عمارہ کا دل تو چاہا کہ وہ واقعی چلی جائے کیونکہ وہ خود کوئی دن سے بہت کچھ برداشت کر رہی تھی، انہوں کی تکلیف، اپنی تکلیف

کے پاس تو وہ بھی نہیں اور آپ کیا ہم سے لائقیتی کا اعلان کریں گے، آج میں خود آپ کو عزت کے اس منصب سے دستبردار کر رہا ہوں، جو بڑوں کو دیا جاتا ہے کیونکہ آپ آپ بڑے نہیں رہے بہت چھوٹے ہو گئے ہیں۔“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ زہر خند لہجہ واجد نیازی کے رگ و پے میں سرایت ہو رہا تھا۔

”اپنی عزت اپنا آپ سب کو پیارا ہوتا ہے اور ہم ہمیشہ اپنے آپ کو الگ اور دوسروں کو الگ نظر سے دیکھتے ہیں واجد نیازی نے بھی جب ہنگ کے پتھر صہیب پر برسائے تو انہیں اس کے لہو لہان ہوتے وجود کی اذیت محسوس نہیں ہوئی مگر جب بے عزتی کا یہی زہر انہیں خود پینا پڑا تو وہ اندر تک جھلس گئے، زہر بھی آگ کی طرح ہی تو ہوتا ہے، فرق بس اتنا ہے کہ آگ اوپر سے جھلساتی اور زہر اندر سے جھلسا کر سب گلا دیتا ہے، تکلیف وہی تو نہیں ہوتی جس کا زخم دنیا کو دکھائی دے بعض اوقات نہ دکھائی دینے والا ناسور زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔“

☆☆☆

عمارہ کافی کام لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو اسپورٹس چینل میں مکن یاسر دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک اٹھا، پھر مسکراتے ہوئے اپنی طرف بڑھایا ہوا کافی کام عمارہ کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں میں منتقل کر لیا۔

”جھٹکس یار، واقعی بڑی طلب ہو رہی تھی۔“

”کوئی بات نہیں، میں آپ کی اپنی ہوں کوئی غیر تو نہیں۔“ عمارہ نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے برابر میں بیڈ کی دوسری جانب آکر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک کہا، ویسے کافی مزیدار بنی ہے۔“

اپنے ہونٹ سختی سے میچنے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور پھر اپنے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے بولا۔

”جہیں، میں بھی نہیں دیکھ سکتا یہ سب، کون اپنوں کو ڈوہتا ہوا دیکھ سکتا ہے، میں بھی اس اذیت سے گزرنا نہیں چاہتا اس لئے میں بلکہ ہم چارہ ہیں اس طوفان سے دور، تاکہ ہم اس سونامی کی لہروں سے محفوظ رہ سکیں، میں نے آسٹریلیا میں مستقل سکونت کا سوچ لیا ہے، مجھے اب یہاں واپس آنا ہی نہیں ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یاسر، ہم فرار ہو جائیں گے۔“ وہ ڈنپ۔

”جہیں، ہم صرف اپنی حفاظت کی خاطر یہ مقام چھوڑ جائیں گے یہ ہمارا بنیادی حق ہے۔“ یاسر کا لہجہ اہل تھا۔

”اور ہمارا فرض؟ ہمارا فرض کیا ہے یاسر، بطور بھائی، بطور انسان یوں اپنوں کو منہ ہار میں چھوڑ جانا، نہیں میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی، یہ خود غرض کر کے ہم انسانوں کی فہرست سے نکل جائیں گے، واجد اکل کے پائزر کا بیٹا بھلے کتابی اچھا کیوں نہ ہو، وریشا بھی! اسے مصیبت کی جگہ نہیں دے پائی گی پلیز۔“ وہ رد ہانسی ہوئی۔

”ہڈ ہائی ہاتھ مت کرو، میں نے فیصلہ کر لیا ہے، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس میں شامل ہو یا نہ ہو، چاہو تو میرے ساتھ چلو، چاہو تو ساتھ چھوڑ دو، میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا، میری اپنی بھی زندگی ہے۔“ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

”میں آپ کی ہم سفر ہوں، ہمیشہ آپ کے ساتھ چلوں گی، آپ کی ہمدردی رہوں گی، مگر کیا آپ میرا اتنا سامان رکھ سکتے، میری خاطر، وریشا کی خاطر، اپنا بھرم نہیں توڑ سکتے، پلیز یاسر آپ

سے کم اذیت ناک تو نہیں ہوتی، وریشا اسے جان سے زیادہ عزیز تھی، مگر وریشا کو لے کر جس قدر حلال کم گھر میں پر پاتھا اسی قدر یاسر نے چشم پوشی اختیار کی ہوئی تھی اور یہی چیز یہی رو یہ عمار کو اس بچ پر لے آیا تھا کہ واقعی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے، یا اسے کیا بولنا چاہیے مگر اس وقت اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اگر اس وقت اس نے ہوش کے بجائے جوش سے کام لیا تو معاملہ شاید اس کی توقع سے زیادہ الجھ جائے گا، اس لئے اس نے بدقت تمام خود پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے یاسر کے عین مقابل آکر بیٹھ گئی۔

”آئی ایم سوری اصل میں یاسر میں اتنی اپ سیٹ ہوں کہ.....“ اس کا گلہ رندہ منہ لگا تو یاسر کا لہجہ یکسر دم ہو گیا۔

”اٹس اوکے مگر دیکھو عمارہ بات کو صاف اور واضح طریقے سے کرنے کی عادت ڈالو ورنہ یہ مبہم الفاظ بلاوجہ کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، ناڈبلی ریٹیکس اور کھو کیا ہوا ہے۔“

”یاسر وریشا ٹوٹ رہی ہے اس کا وجود لمحہ لمحہ بکھر رہا ہے، پلیز یاسر میری دوست اور اپنی بہن کو کھونے سے بچائیں پلیز۔“ عمارہ اب بری طرح سکھنے لگی تھی، یاسر نے ایک گہرا سانس لے کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور دیرے دیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

”عمارہ وریشا مجھے بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں، لیکن اس معاملے میں، میں کچھ نہیں کر سکتا اور جب مجھے پتہ ہے کہ میرا ہر عمل لا حاصل ٹھہرے گا تو کیا فائدہ ایسی کوشش کا۔“

”تو کیا آپ یہ سب خاموش تماشا ہی بنے دیکھتے رہیں گے؟“ اس نے نم آنکھوں سے یاسر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو یاسر نے

جسم و جاں کو ڈھیلا چھوڑ دیا کبھی کبھی ہار جانے میں کبھی لذت سی ہوتی ہے، مگر کوئی تھا جسے اس کی بار منظور نہ تھی، نرم گرم ہاتھوں نے اس کی کلائی کو پکڑ کر بلایا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہوش میں آنا پڑا۔

ایک تو وہ زبردستی چگائے جانے پر سخت بد مزہ ہوا تھا پھر مقابل کو دیکھ کر تو وہ یوں ہلبلایا گویا شیر پر کسی شکاری سے وار کر دیا ہو، وہ غرا اٹھا تھا۔

”تم کیوں آئی ہو یہاں۔“ اتنے کشور پن کا تو دریشا نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا، شدت تو ہیں سے اس کی آنکھیں بھیک گئی تھیں، مدد شکر کہ ایسا اور عمارہ ساتھ تھیں۔

”میں نے بلایا ہے اسے۔“ عفت ایسا کا لہجہ اس سے بھی کرخت تھا۔

”مگر کیوں؟“ وہ ہنوز سارے لحاظ بھولا ہوا تھا۔

”اس لئے کہ مجھے صرف تمہاری ہی نہیں اس کی مدد بھی کرنی تھی اور ویسے بھی میں اب تم دونوں کے درمیان ”پل“ کا کردار ادا نہیں کر سکتی، تم لوگوں کو جو کچھ کہنا سننا ہے کہہ لو، بس خیال رکھنا کہ رشتوں کا یان قائم رہے۔“ ایسا بظاہر دونوں سے مخاطب تھیں مگر ان کی نظریں مصیب کے چہرے کی نشی ہوئی رنگوں کی جانب تھیں۔

”ایسا ٹھیک کہہ رہی ہیں، آپ دونوں کے لئے اور ہم سب کے لئے یہی بہتر ہے کہ آج آپ لوگ کوئی فیصلہ کر کر ہی انھیں۔“ عمارہ نے دھیرے سے دریشا کا ہاتھ ہوا ہاتھ چھوڑا اور عفت ایسا کے ساتھ کولڈرکس کے اسٹال کی طرف قدم بڑھا دیئے، ان دونوں کے چاروں جانب جتنا شور تھا، درمیان میں اتنی ہی خاموشی تھی، چند

ہماری آخری امید ہیں، صرف ایک بار بات کر کے تو دیکھیں۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ ڈالے تو یاسر کے ارادے ڈھسے سے گئے، اس نے گہری سانس لے کر عمارہ کے ہاتھ تمام لئے۔

”ٹھیک ہے صرف پہلی اور آخری، تم دونوں کی خاطر میں اس چٹان سے ٹکراؤں گا مگر سوچ لو اگر شکست میری ہوئی تو زخم خوردہ بھی میں ہی ہوں اور پھر ساری عمر میں اسی شکستگی میں گزاردوں گا، یہ جنگ لا حاصل ٹھہرے گی، آئی نو۔“ یاسر کے لہجے میں شکستگی اور بے چارگی تھی۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے نایا سر، لڑائی میں خون تو بہتا ہے، زخم تو لگتا ہے مگر جب فتح باطل کے بجائے حق کی ہو جائے تو تاریخیں رُم ہوئی ہیں اور آنے والی لسٹوں کے لئے روائی چین ہی چین لکھتا ہے۔“ اس کے لہجے کی مضبوطی نے یاسر کو بھی مضبوط کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسکولوں میں موسم سرما کی تعطیلات ہوئیں تو عفت بچوں کو لے کر میکے آگئیں، پھر بچوں کے ہی اصرار پر مصیب کو پکڑ کر جانے کے لئے تیار کیا اور بچوں کے معاملے میں تو اس نے ویسے ہی کبھی انکار نہیں کیا تھا سو عفت اور بچوں کو لے کر وہ الہ دین آگیا، دن کا وقت تھا لیکن موسم کے معتدل ہونے کے باعث الہ دین میں خاصا رش تھا، بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر مصیب تھک کر گھاس پر آ بیٹھا، مگر بچے کہاں تھکنے والے تھے، انہوں نے جموں پر سواری کے لئے شور مچا دیا تو عفت مصیب کو دبائیں ٹھہرنے کا کہہ کر خود بچوں کو رائیڈس ایریا کی طرف لے گئیں، مصیب نے پشت ایک درخت کے تنے سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں، ہلکی خشکی لئے نرم لطف گوشے اسے نیند کی آغوش میں سینٹے کو کمر بستہ ہو گئے اس نے بھی



کیا تھا میں نے جو تم سے  
وہ وعدہ کر دیا پورا  
مگر ایک بات ہے پیارے  
کبھی جو وقت مل جائے  
تو میری شاعری پڑھنا  
کہیں نئی بھرا جملہ  
کہیں یہ سردالہجہ  
کہیں لہجے کی کڑواہٹ  
سنو.....!

میں خوش تو ہوں لیکن  
لہو ہر لفظ روتا ہے

لہجہ کے آخر میں ”سالگرہ مبارک“ کے  
الفاظ پڑھ کر اس نے ایک گہری سانس لیتے  
ہوئے کارڈ آؤسٹی سے گھاس پر رکھ دیا، آج  
چھبیس دسمبر تھی، اس کی سالگرہ بھی، مگر اسے تو اپنا  
دھیان ہی کب تھا، مگر وہ خود اب تک وریشا کے  
دھیان میں تھا۔

”یہ کیا بچکانہ حرکت ہے وریشا؟ آخر تمہیں  
کس طرح سمجھانا پڑے گا؟“ اب کی بار بھی  
صہیب کا لہجہ دھیانہ تھا۔  
”میرے جذباتوں کو بچکانہ حرکت کہہ کر بے  
مول تو نہ کریں۔“

وریشا جو اس سے مسکراہٹ بھرے شکرے  
کی توقع کر رہی تھی، اس کا اکھڑا لہجہ دیکھ کر سسک  
اٹھی۔

”یہ بات تم کو مجھ سے نہیں، ان سے کہنی  
چاہیے جو محبت خلوص و وفا داری اور وضع داری کو  
ڈھونگ کہتے ہیں، جو رشتوں کو ان کی قدروں کو  
تجارت سمجھ کر قطع نقصان کے پلاؤں میں تولتے  
ہیں۔“ اس کا لہجہ ہنوز تلخ تھا، وریشا کے آنسوؤں  
کا اس پر چنداں اثر نہیں ہوا تھا۔  
”آپ کی تنہی بجا ہے، لیکن اس سارے

لہجے میں ہی چپ چاپ سرک گئے، بڑھی ہوئی  
شیوہ اور کھلائی ہوئی رنگت کے ساتھ وہ جتنا بے نیاز  
دکھائی دے رہا تھا دراصل تھا نہیں، بیٹکی پگلوں  
میں گہری اداس آنکھیں اس سے پوشیدہ نہ تھیں  
مگر اگر وہ خود کمزور پڑ جاتا تو اسے مضبوط کیسے  
بناتا، خود ساختہ انا کے خول میں خود کو جکڑ کر وہ کس  
مشکل سے سانس لے رہا تھا، وہ چاہا کہ بھی وریشا  
کو بتا نہیں سکتا تھا اور وریشا جو بمشکل خود پر قابو  
رکھے ہوئے تھی آخر کار ضبط کی لگا میں تمام کر اس  
چتر کو مخاطب کر ہی بیٹھی کہ کسی تو پہل کرنی ہی تھی  
اور پھر محبت تو ہر دم محبوب کے سامنے سرنگوں  
رہنے کو تیار رہتی ہے، سو اس نے بھی بڑی امید  
سے سرخ گلابوں سے سجا کارڈ اس کی جانب  
بڑھایا تھا۔

”یہ آپ کے لئے۔“  
”یہ کیا ہے؟“ صہیب نے بھی مجبوراً کارڈ  
تھا تھا۔

”آپ خود دیکھ لیں۔“ وہ زرب لب مسکرائی تو  
صہیب نے اچنبھے کے ساتھ کارڈ کھول کر اندر لکھی  
تحریر پڑھنا شروع کر دی جو اسے ہی مخاطب  
کر کے لکھی گئی تھی۔

لیا تھا ایک وعدہ تم نے مجھ سے  
ہمیشہ خوش ہی رہنا ہے

تو دیکھ لو

میری آنکھوں کو دیکھو تم

یہ کتنی شوخ لگتی ہیں

میرے ہونٹوں کو دیکھو تم

کوئی بھی غم اگر آیا

اسے ہنس کر سہا میں نے

میرے چہرے کو دیکھو تم

ہمیشہ پرسکون ہوگا

تو سوچو گے

معاملے میں میرا کیا قصور ہے بھلا؟“ دریشا نے  
نٹو سے اپنے ٹیلی رسکار شک کرتے ہوئے کہا۔  
”تو کیا میرا قصور ہے؟“ اس کا لہجہ اور کڑوا  
ہو گیا تھا۔

”صہب پلیر یوں راستہ تو نہ بدلیں، میں  
آپ کی اس قدر بے رخی اتنی بے اعتنائی نہیں سہ  
سکتی اور آپ مجھے ٹھکانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں  
تو مجھے میری خطا تو بتا دیں پلیر۔“ دریشا کا سارا  
وجود ہنسی ہو چلا تھا مگر وہ تو گویا پتھر ہو چلا تھا۔

”دریشا تم اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو،  
ان تمام باتوں کا اب کوئی مقصد نہیں جو ہو رہا ہے  
اسے تقدیر کا لکھا نسخہ کر قبول کر لو، میرے اور  
تمہارے راستے اب الگ الگ ہیں، تم اس  
حقیقت کو جتنا جلدی تسلیم کر لو، اتنا ہی تمہارے حق  
میں بہتر ہے، کیونکہ حقیقت کا وجود کڑوی گولی کی  
مانند ہوتا ہے جسے لٹکانا مشکل ضرور ہوتا ہے مگر اس  
امر میں اس کا فائدہ چمپا ہوتا ہے، اپنے درد کو  
ٹھکست دینا اب تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔“

”چلیں شکر آپ نے میرا درد محسوس تو کیا  
دور نہ میں تو سمجھی تھی کہ آپ بالکل ہی اجنبی ہو چلے  
ہیں۔“ دریشا نے زخمی لہجے میں کہا تو صہب نے  
اپنا ٹچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبایا، اور پھر  
شرٹ کے گریبان میں انکے سن گلاسز آنکھوں پر  
چڑھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میرے خیال میں بہت دیر ہو گئی ہے،  
میں ایسا اور بچوں کو بلا کر لارہا ہوں۔“ وہ سپاٹ  
لہجے میں کہتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا دریشا کی  
نظروں سے اوچھل سا ہو گیا اور دریشا کو لگا کہ اس  
کی زندگی میں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

☆☆☆

بایر باہر چلا گیا تھا، باہر جاتے ہی اس نے  
سر توڑ کوشش کر کے فقط چھ ماہ میں عمارہ کا دیزہ بھی

لگوا لیا تھا، عمارہ اپنی پینٹنگ کر رہی تھی، دوسری  
صبح اس کی فلائٹ تھی اس کے اور اپنے لئے کالی  
بنا کر اس کی مدد کی غرض سے اس کے کمرے میں  
ہی چلی آئی تھی۔

”عمارہ تم بیٹھ جاؤ اب، ویسے بھی تمہاری  
کنڈیشن ایسی نہیں کہ تم یوں متواتر لگی رہو، دیکھو  
بہر کتنے سوچ رہے ہیں تمہارے، اپنا نہیں تو  
میرے آنے والے بیٹے کی پر ہی رحم کر دو، ابھی  
اتنا لاس سفر بھی کرنا ہے تمہیں۔“ دریشا نے زبردستی  
سوٹ کیس اپنی طرف کھینچ لیا تو وہ مسکراتے  
ہوئے بیڈ کراؤن کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

”ارے ہاں یہ گاجر کا حلوہ ضرور کھا لو، امی  
نے خاص طور پر تمہارے لئے بنایا ہے۔“ دریشا  
نے ٹرے میں رکھی حلوے کی پلیٹ اٹھا کر عمارہ کو  
دی تو وہ ایک دم رونے لگ گئی، دریشا گڑبڑا گئی  
اور تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔

”عمارہ کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے،  
امی کو بلاؤں یا ڈاکٹر کے پاس چلیں۔“ دریشا اس  
کے ہال سنوارتے ہوئے بولی تو اس نے ٹہنی میں  
سر ہلاتے ہوئے اپنی نم آنکھیں ہتھیلیوں کی پشت  
سے خشک کیں اور دریشا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں  
لے لیا۔

”دریشا بعض دفعہ ہمیں نہ چاہتے ہوئے  
بھی، وہ سب کرنا پڑتا ہے جو ہم سے زندگی کے  
بہت سے رنگیں لئے، خوشیاں اور محبتیں چھین لیتا  
ہے، میں تم کو کوئی کو تم کو لوگوں کی محبتوں کو چھوڑ کر  
نہیں جانا چاہتی تھی مگر باسرا، وہ بہت دلبرداشتہ ہو  
گئے تھے اور پلیر تم ان کی طرف سے بھی کوئی میل  
دل میں نہ لانا، ان کے بس میں ہوتا تو وہ تمہیں  
بھی یہاں سے بہت دور لے جاتے، مجھے بھی  
معاف کر دینا کہ میں ایسے حالات میں تمہیں اکیلا  
چھوڑ کر جا رہی ہوں، کاش حالات کو اپنی مرضی

کے مطابق ڈھالنا ہمارے بس میں ہوتا وریشا تو.....“ وہ سسکنے لگی تھی، اس کی حالت دیکھ کر وریشا کا دل بھی بھر آیا تھا، مگر موجودہ حالت کے پیش نظر اس نے نمکین پانی کے گولے کو حلق سے اتارا اور عمارہ کو گلے لگایا، پٹنہ سہلائی پھر شانوں سے تمام کر اسے دوبارہ ٹیک لگوا دی۔

”بے وقوف لڑکی، میں نہ تم سے ناراض ہوں نہ بھائی سے، بس میری قسمت میں ہی لکھا تھا یہ دکھ اور تم ایسی منفی باتیں مت سوچو، اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچو، تم نے وہی کیا اور کر رہی ہو جو ایک اچھی بیوی کو کرنا چاہیے، ویسے بھی عمارہ فاصلے بے شک راستوں میں آ جائیں مگر دلوں میں نہیں آنے چاہئیں، تم پلیر خود کو یوں بلکان نہ کرو، خیال رکھو اپنا نہیں تو بھائی تمہاری یہ اجڑی شکل دیکھ کر تبھیں گے کہ ہم نے ان کی بیوی کا خیال نہیں رکھا۔“ وریشا نے شرارت سے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا تو عمارہ پھر فٹس دی، لیکن اگلے لمحے وہ پھر متشکر نظر آنے لگی۔

”وریشا تم بھی تو اپنا خیال رکھو، آٹنی کو بھی جھپس ہی دیکھنا ہے، کیسے ملتے پڑ گئے ہیں تمہاری آنکھوں میں، تم کتنی اب ٹو ڈیٹ رہتی تھیں اور اب تو جانے کب سے تم نے بارر کی شکل نہیں دیکھی، اپنے لئے نئے جوڑے نہیں بنائے، اس ایک شخص کے پیچھے تم نے گویا اپنی زندگی ہی تیاگ دی ہے، جب وہ تمہاری پروا نہیں کر رہا تو تم کیوں بے وجہ جوگ لئے بیٹھی ہو اس کی خاطر؟“

”مجھے معلوم ہے عمارہ، یہ سب لا حاصل ہے لیکن بلیوی میں یہ سب جان بوجھ کر نہیں کر رہی، مجھے اب اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں لگتا، زندگی بے رنگ و بے کیف ہو گئی ہے، میں خود

چاہتی ہوں کہ صہیب کو بھلا دوں اس کو اپنے من کے سنگھاسن پر اس دھڑلے سے برا بھلا نہ رہنے دوں مگر میں کر ہی نہیں پا رہی عمارہ، میں اس بے خودی کے ہاتھوں خود بہت مجبور و بے بس ہوں، اپنی لا چاری پر مجھے غصہ بھی آتا ہے لیکن عمارہ وہ جس کو اپنا سب کچھ مان لیا، اپنے جینے کی وجہ بنائی، اپنی دعاؤں کو مرکز بنالیا اب تم ہی بتاؤ کہ کیا ہے سب ممکن ہے، کیا یہ اتنا آسان ہے کہ صہیب کی جگہ میں کسی اور کو دے سکوں، محبت تو شاید بار بار ہو جاتی ہے مگر عشق یہ مواتو قبر تک بھی جان نہیں چھوڑتا، تم نے دیکھا ہے نا حزاروں پر دیوانہ در رقص کرتے عشق کے پجاریوں کو، ان کا جینا مرنا وہ ہی واحد مقام وجہ ہوتی ہے تم مجھے بھی ایسی پجاریں سمجھ لو، اندھ کی کوئی بہری جسے اپنا دیوتا کے آگے کچھ بھائی نہیں دیتا پھر بے شک وہ پھر ہی کیوں نہ ہو؟ تم حلوہ کھاؤ شخشا ہو رہا ہے، کافی تو شخشا ہو ہی گئی ہے میں گرم کر کے لانی ہوں اور پھر پینک نکشائی ہوں، تم خبردار کسی کام کو ہاتھ نہیں لگنا، میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“

وریشا اس کے گل چھپتائی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور عمارہ اس کی پشت کو دھیمکتی سوئے گی۔

”کیا واقعی عشق ایمان کو بھی متزلزل کر دیتا ہے؟“

☆☆☆

بعض اوقات زندگی انسان پر پے در پے ایسے وار کرتی ہے کہ اسے سمجھنے لگتا، اپنی زخموں پر پھائے رکھے اور مرہم لگانے کا بھی موقع نہیں مل پاتا، وریشا کی زندگی میں بھی ایسا ہی ہو رہا تھا، ایک جانب تو اس کے دل پر گلے باپ کی سنگدلی اور اگلوتے بھائی اور عزیز سہیلی کی دوری کے زخم ہی نہ بھر پائے تھے کہ دوسری طرف سے اسے یہ روح فرسا خبر ملی کہ صہیب نے اپنا ٹرانسفر کراچی

عمارہ خاموشی سے اس کا درد بانٹتی رہی، دوست اور نمکسار کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ بے شک دکھ شتم نہیں کر سکتے مگر اس کی اذیت کم ضرور کر دیتے ہیں، اچھا دوست روشن دیا بن کر تاریکی کے احساس کو کم کر دیتا ہے، عمارہ نے بھی یہی کیا۔

”مجھے اپنانے سب بتا دیا ہے اور وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں دریشا کہ تمہیں اب کوئی فیصلہ کرنا ہے کیونکہ جب تک زندگی چلتی رہتی ہے قدم اٹھانا پڑتے ہیں ورنہ روندے جانے کا خدشہ ہوتا ہے اور جو خود کو روندے جانے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں وہ دراصل خودکشی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ خودکشی حرام ہے، میری جان اپنے ایمان کو بار بار داؤ پر نہ لگاؤ، تم نے پہلی غلطی یہی کی کہ تم نے ایک شخص کو ایک انسان کو سب کچھ سب کچھ مان لیا، سب کچھ تو صرف خدا ہے نا دریشا اور اب تمہاری دوسری غلطی یہ ہو گئی کہ تم نے اوپر والے کی دی ہوئی زندگی کو بے مول کر دو گی، اپنی زندگی میں صحیح سمت کا تعین کرو، تم پر اور بھی لوگوں کا حق ہے، تم پر کچھ فرائض بھی ہیں، تمہیں اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے اور سب سے بڑھ کر تمہیں راضی رہنا ہے کیونکہ ہم بشر ہیں اور یہی ہماری بندگی کا تقاضا ہے، مجھے امید ہے کہ اب تم حذر کوئی حماقت نہیں کرو گی اور اگر تم نے ایسی فاش غلطی کی تو ساری زندگی دورا ہے پر کھڑی رہ جاؤ گی، یا سر آفس سے آگئے ہیں، میں چائے بنانے جا رہی ہوں ٹیک کیر۔“ عمارہ کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ دریشا نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے خشک کر لیں، عمارہ ہی کے کہنے پر اس نے ایک قرعہ پرائیویٹ اسکول میں جا ب کر لی، جہاں عمارہ کے کہنے کے مطابق آدھا دن بچوں کی معصوم باتوں اور شرارتوں میں گزر جاتا تو بانی بچا

سے اسلام آباد کر دیا لیا ہے اور اس سے بھی گھرا گھاؤ اسے جب لگا جب اسے غمت اپنانے فون پر یہ کہا کہ ”درشا اب بہتر ہو گا کہ تم بھی ہوش کے ناخن لو، سب کچھ بھول کر اسی طرح اپنی زندگی کا نیا آغاز کرو، جیسے مصیب نے کر دیا ہے، اب کسی کو بھی تصور وار ٹھہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا، زندگی میں ٹونے والی ان تمام انہونیوں کو نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو، ہم نے لمبی ایسا ہی کیا ہے، وہ میرا اکلوتا بھائی اور امی ابو کا اکلوتا بیٹا ہے، ہمیں بھی بڑے ارمان تھے کہ ہم دھوم دھام سے اس کی شادی کرتے مگر اب جب کہ اس نے اپنی آس کو لیک ورنہ کو اپنی زندگی کا سا بھی بنالیا تو ہم سب نے بھی اس کے فیصلے کو مان لیا ہے، اب جو کچھ بھی ہو چکا ہے، اس پر رونے پینے، ماتم کرنے سے وہ بدل تو نہیں جائے گا، البتہ زندگی گزارنا مزید دشوار اور تکلیف ہو جائے گا، اس لئے بہتر ہو گا کہ تم بھی اب کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لو۔“ اپنا نے تو یہ کہہ کر فون بند کر دیا مگر وہ سہکتے جیسے موبائل کی تاریک ہوتی اسکرین کو دیکھتی چلی گئی اسے لگا کہ اس کی زندگی میں موجود امید کی واحد شمع جو مصیب کے مان جانے اور لوٹ آنے کی باقی تھی، وہ بھی بجھ چکی ہے اور اس کی زندگی بھی موبائل اسکرین کی طرح تاریک اور سیاہ ہو گئی ہے جس میں کچھ دکھائی اور بھائی نہیں دیتا، قریب تھا کہ صدے سے اس کی اپنی دھڑکیں بھی یونہی غائب ہو جاتیں روشن ہوتے موبائل اسکرین کی زور دار رنگ ٹون نے اسے جھجھوڑ دیا۔

”عمارہ کا لنگ“ کے الفاظ سے گویا اس میں زندگی کی لہریں دوڑا دیں ایسے پر اس کی کال تھی، اس نے فوراً اوکے کا بٹن پریس کر دیا اور پھر سسکیوں کی آواز سے اس کا پورا کمرہ گونج اٹھا،

آدھا دن پرائیوٹ اسکولز کی تھکا دینے والی سرگرمیوں میں نکل جاتا ہے، اس نے اب کسی قسم کی پلاننگ کرنا چھوڑ دی تھی، نہ خود دن بھر کی تھکا دینے والی روٹین کے بعد اس کا دل و دماغ کچھ سوچنے کی سہی کر پاتے لیکن ابھی اس کی زندگی کے شیب و فراز باقی تھے۔

☆☆☆

قدرت کے کھیل بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں، وہ کب کس کے وقت نصیب کے لیے کھڑا ہوگا، کب بلند یوں پر پہنچا دے یا نشیبوں کی نظر کر دے، کچھ بتا نہیں چلتا، کسی کو خبر نہیں ہوتی، واجد نیازی کو بھی خبر ہی نہیں ہوئی اور وہ عرش سے لا کر فرش پر پٹ دیئے گئے اور اور کی ہوس میں جلا ہو کر فراڈ جیسا سنگین جرم کر بیٹھے، گو کہ مصیب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انہیں ضمانت پر رہا کر لیا تاہم ان کے حصے میں آئی بے عزتی اور بدنامی نے ان کے غرور کو اور ذات کو ایسا چکنا چور کیا کہ وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئے، لیکن ابھی ان کے لئے قدرت نے راہ آسان نہیں کی تھی کہ وہ دنیا کی قہر بردستی نظروں اور زبانوں سے چھٹکارا پا لیتا، اس لئے صرف ایک ہونے کے باعث وہ زمانے کی قہر توہینے کے لئے بچ گئے۔

بچ کیا گئے بس اس فانی دنیا سے فرار حاصل کرنے میں ناکام رہے بیوی جو ان کی شریک حیات تھی، بظاہر ان کے ساتھ کھڑی تھی مگر ان کے خاموش لب اور بولتی آنکھیں گویا واجد نیازی کے اندر تک گڑے جانی تھیں، بیٹے نے آنے سے انکار کر دیا، بیٹی تو پہلے ہی بد دل تھی اور ان کا پارٹنر عبید اور اس کا اکلوتا بیٹا، واجد نیازی کا ہونے والا داماد انہیں پھنسا کر اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے انہیں سچ منہ حمار میں چھوڑ کر باہر نکل گئے، ویرانے تو پہلے ہی اس نام نہاد رشتے کو دل

سے قبول نہیں کیا، وہ مگنی کی تقریب میں ہی نزہت کے ہاتھ جوڑنے کے باعث ایک بت کی طرح شریک ہوئی تھی اور آج جسے اسے دیو کی قید سے رہائی ملی اس نے انگوٹھی اتار کر واجد نیازی کے سامنے ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

”اب کم از کم آپ اور مجھے نافرمان ہونے کا طعنہ تو نہیں دے سکیں گے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر پلٹ گئی، اسے ہسپتال کے بیڈ پر پڑے اس وجود سے اب کوئی لگاؤ نہیں تھا، شاید وقت نے اسے پتہ بنا دیا تھا، بس ایک مصیب تھا جو پتھر کے جواب میں پتھر مارنے کا قائل نہیں تھا، وہ آج اس واجد نیازی کے لئے فرشتہ بن گیا تھا جس کے لئے وہ بھی فرعون بن گئے تھے۔

”آپ بالکل پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا، میرے لائق کوئی بھی خدمت اور کام ہو تو بلا جھجک کہیے گا، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔“ وہ آج کئی راتوں سے ان کے ساتھ رکا ہوا تھا، واجد نیازی نے بہت سارے دن اپنی ہمت باندھنے میں لگائی پھر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میں اس قابل تو نہیں مگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو، تم ان سب کو بھی کہو کہ مجھے معاف کر دیں، جن کا نہ میں اچھا بھائی بن سکا نہ باپ نہ شوہر، خدا کے لئے مجھے اس سولی کے تختے سے اتار لو، میرا دم گھٹنے لگا ہے، میں اس اذیت سے لکنا چاہتا ہوں، میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں، سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہے تھے، مصیب نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہتھیلیوں کی سچ میں دبا لیا، ان کی سسکیاں مدھم پڑنے لگی تھیں، انہوں نے ہونے کا احساس ایسا ہی اثر پذیر ہوا کرتا ہے۔

”دریثا پلیز جو گیا اسے بھول جاؤ، ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔“

”مجبوری..... ہاہ..... مصیب صاحب، ہمارے معاشرے میں مرد نہیں، عورت مجبور ہوتی ہے اور آپ نے اس امر کو صادق ثابت کیا ہے، پہلے مجھے پسند کیا، مگنی کی پھر جب آپ کو یہ سب نامناسب لگنے لگا آپ کی انا آڑے آنے لگی تو آپ نے اپنی ”میں“ کے آگے میرے وجود کی سراسر نفی کر دی، اپنی عزت نفس کی خاطر، میری عزت اپنی نظروں میں اس حد تک گرا دی کہ میرے احساسات و جذبات آپ کو ڈرامہ لگنے لگے اور آج پھر آپ اپنی محبت کا دعویٰ کرنے آن پہنچے ہیں، کیوں کیا میں آپ کو موم کی کڑیا دکھائی دیتی ہوں جسے آپ جو مرضی چاہیں کہ شہیپ دے دیں گے یو آر رنک آئی ایم ناٹ اے ڈول مسٹر مصیب میں انسان ہوں، جیتی جاگتی سانس لیتی، جسے تکلیف ہوتی ہے، درد ہوتا ہے، ٹیس لگتی ہے۔“ وہ سسکنے لگی تھی، مصیب نے چاہا کہ اس کے رخساروں کی کمی اپنی انگلیوں کی پوروں میں چھپالے تو اس نے نفرت سے مصیب کا ہاتھ جھٹک ڈالا۔

”تم اس تمام روپے کے ساتھ بالکل صحیح ہو دریثا، مگر پلیز مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا حق ہے، وہ میری انا نہیں تھی، جس کی وجہ سے میں پیچھے ہٹاؤد تہماری عزت تھی جس کا میں نے تحفظ چاہا، میں تمہیں ہمکا کر نہیں لے جانا چاہتا تھا، یہ جو گلی محبت کے تماشے دیکھتی ہوں نا تم جس میں محبت سرراہ بدنام ہوتی ہے، یہ محبت نہیں ہوتی دریثا، تم سے کورٹ میرج کرنا کیا مشکل تھا مگر مجھے منظور نہیں تھا کہ میری دریثا پر میری محبت پر عمر بھر کے لئے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا الزام لگ جائے، صرف اس لئے تم سے فرار حاصل

مج ہمیشہ خوبصورتی اور خوش امید سے بھرپور ہوتی ہے، نرم لطیف صاف ستھری ہوائیں اور تازہ تازہ جھنگالی کرشمیں تو چہرہ پرند کو بھی نٹائے رہی پر مجبور کر دیتی ہیں، انسان تو پھر انسان ہے، آج کی صبح تو اسے دیے بھی اپنی زندگی میں آئی کئی صبحوں سے زیادہ حسین لگ رہی تھی، کیونکہ آج اسے بڑے عرصے بعد اس کی اپنی زندگی میں اجالے بکھیرنے کی نوید ملی تھی، وہ آسکی سے چلتا ہوا محسوس طریقے سے اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا، وہ گیندے کی پھولوں کی باڑ کے پاس ان کی خوبصورتی میں کھوئی ہوئی تھی، دھانی ٹکر کی پلین لیسن شرٹ اور اسی رنگ کے پرعڈ وہ پشاور اور ٹراؤز پہنے وہ خود اس سبزے کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی، شوخ ہوانے اس کی چٹیا سے نقلی ٹوں سے اٹھکیلیاں کیں تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور نرمی سے اس کے صبیح رخساروں کو تنگ کرتی ٹوں کو اپنی انگلیوں کی مدد سے ان کی شرارت سے باز رکھنا چاہا تو دریثا چونک کر پہلے تو پلٹی پھر مصیب کو مد مقابل دیکھ کر وہ یوں بدک کر پیچھے ہٹی جیسے اسے کسی مفریت کو دیکھ لیا ہو، اس کی آنکھوں میں پھیلی اجنبیت اور چہرے پر چھائی رکھائی نے لمبے بھر کو مصیب کے حوصلے پست کیے مگر پھر اس نے اپنی تو توں کو یہ سوچ کر کنبھا کیا کہ دریثا کے اس رد عمل کا ذمہ دار بھی تو وہ خود ہی ہے، اس نے خود ہی تو اپنے ناشائستہ روپے اور سنگ دلی سے اسے خود سے اتار دیا تھا، یہاں تک کہ اس کی اس نفرت کو بانے کے لئے اسلام آباد میں شادی کرنے کی جھوٹی افواہ بھی اس نے خود ہی اڑائی تھی، صرف اسی لئے کہ وہ اس سے دور ہو جائے مگر اس وقت مصیب کو خود یہ علم نہیں تھا کہ حالات یوں رخ بدل جائیں گے۔

سلائیڈنگ ڈور کی طرف اشارہ کیا تو سب ہی کی نظروں کا رخ اس طرف ہو گیا، عفت ایسا مسکراتی ہوئی راہداری عبور کر رہی تھی اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دریشا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں، دریشا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ہنسے یا روئے، وہ چپ چپ سب کو باری باری دیکھنے لگی، کہ اچانک قلعاری مارتے دو نغھے گل گوتھوں نے اسے ٹیک وقت ہنسنے اور روہنے پر مجبور کر دیا اور اس نے پر ام میں لیٹے جھنجھکیاں کی گود میں سر رکھ دیا، ہر چہرہ پھول کی مانند مسکرا اٹھا، سب نے تالیاں بجا دیں، گلاس ڈور کے اس پار وہیل چیز پر بیٹھے واجد نیازی بھی غم آنکھوں سے مسکرا دیئے، تو نزہت نے ان کے شانوں پر رکھے اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر دی اور دوسرے ہاتھ میں کپڑے موبائل پر جیٹانی کو کال ملائے لگیں۔

دریشا اور مصیب کھلے ہوئے گیندے کے پھول کو ایک ساتھ دیکھا اور کھل کر مسکرا دیئے۔

وصل اور جگر کی ساتھوں کے بغیر محبت کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، محبت میں سچائی اعتبار، خلوص، وفا اور احترام میں سے کسی ایک جذبے کا بھی احساس نہ ہو تو محبت کا وجود نا پائیدار رہتا ہے۔

☆☆☆

کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا میں، اب اگر تم ابھی بھی مجھے مرا کا حق دار سمجھتی ہو تو تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔“ مصیب کو لگا کہ شاید اب وہ پھسل جائے گی مگر اس نے ٹھیک کہا تھا وہ موم نہیں تھی اس لئے مصیب کی محبت کی آغ بھی اسے پھسلا نہیں باری تھی، وہ ہنوز رخ موڑے کھڑی تھی، مصیب بھی مایوسی کے عالم میں قدم پیچھے ہٹانے کو تھا کہ عمارہ کی آواز نے اسے کے قدم روک لئے اور دریشا کو رخ موڑنے پر مجبور کر دیا۔

”رک جائیں مصیب بھائی، اس بے وقوف لڑکی سے تو میں منشی ہوں۔“ دریشا عمارہ کو یوں اچانک دیکھ کر ویسے ہی ہکا بکا تھی، اس کے اندازے گویا اسے حق دتی ہی کر دیا۔

”تم مجھتی کیا ہو خود کو ہر بار تمہاری مرضی چلے گی، پہلے تم ہر بات ہر کثرت بھلا کر اس پر مصر تھی کہ مصیب بھائی کوئی انتہائی اسٹیپ لیں جبکہ اگر وہ خود بھی تمہاری طرح نادانی میں کوئی جذباتی اسٹیپ لے لیتے تو سوچو آج تم دونوں نہ صرف زمانے سے بلکہ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے ہوتے دریشا محبت تو قدم قدم پر پڑی ہے، مگر اصل محبت وہی ہے جو محبوب کی ذات کی قدر و منزلت کو پہچانے، محبت رسوا کرنے کا نام نہیں لڑکی، سمجھ جاؤ، چھوڑ دو اپنی ضد اور بے جا من مانی۔“

”عمارہ تم بھی، تم میری دوست ہو کہ میری ہی سائیڈ نہیں لے رہی ہو؟“ دریشا نے شاکی نظروں سے عمارہ کو دیکھا تھا مگر اس سے پہلے کہ عمارہ کوئی جواب دیتی یا سر نے آ کر اسے لوک دیا۔

”رہنے دو عمارہ، ہمارے سمجھانے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہونے والا اسے اب یہی منا سکتے ہیں۔“ یا سر نے لاؤنج اور لان کے درمیان بنے

”اور بابا پتہ ہے انہوں نے مسز خان کو اتنی سناٹی اتنی سناٹی کہ پوچھیں مت۔“ عمار بالکل اسی کے انداز میں اگلا جملہ بول دیتا، عمار کو یوں اپنی نقل اتارتے دیکھ کر اس کی آنکھیں ماتھے پر پہنچ جاتیں، سامنے جو بڑا نظر آتا عمار کو دے ماری۔

”صبح سے دس بار سنا چکی ہو یہ بات، مجھے حفظ ہو چکی ہے کہو تو اگلا جملہ بھی بتا دوں؟“ عمار شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھتا۔

”عمار.....“ وقار صاحب عمار کو محسوس کرتے جنہوں نے اس کی لاڈلی کی بات کاٹ کر اس کی نقل اتار کر اسے خفا کر دیا تھا۔

”بابا یہ سارا دن بولتی رہتی ہے یہ جو واقعہ آپ کو سنا رہی ہے یہ صبح سے چھ بار سن چکا ہوں، ایک بار مجھے الگ سے سنایا، ابھی کو سنا یا بابا مجھے آپ کو سنا رہی ہے۔“

”دیکھا بابا کتنا جھوٹ بولتا ہے یہ، ابھی صرف چار بار ہوا ہے اور کہہ رہا ہے چھ بار سن چکا ہوں۔“ عینا فوراً اس کا جھوٹ پکڑ لی بابا بڑی مشکلوں سے اپنی ہنسی چھپاتے۔

”ہاں یاد آیا پانچویں بار جب فون پر اپنی دوست سحرش کو یہ واقعہ سنا رہی تھی تب بھی میں لاؤنج میں ہی بیٹھا تھا اور ابھی سمیا اور آبا تو رچے ہیں، سمیا آفس سے آئیں گے تو دوبارہ شروع ہو جائے گی اور آبا کا فون آئے گا تو پھر ایک بار اور یہ قصہ سننا پڑے گا۔“

”خبردار جو آئندہ تم نے عینا کے بولنے پر اعتراض کیا، یہی تو میرے گھر کی رونق ہے۔“ عینا

وہ جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے گھر کے درود پوار بھی اسے جتنے دیکھ کر خوش ہیں بولنا اور بے تحاشا بولنا اس کی عادت تھی اسے اگر گھر کی رونق کہا جاتا تو غلط نہ تھا سارا دن امی، بھابھی اور عمار کے کان کھانا اور بابا کے آفس سے آنے کے بعد سارے دین کی روداد ان کے گوش گزار کرنا اس کی عادت تھی عمار کبھی کبھی کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیتا ”تو یہ عینا کتنا بولتی ہو تم؟“

یہ جملہ سنتے ہی عینا صاحبہ منہ پھلا لیتی اور پھر سارا دن عمار سے ہانپکٹا رہتا وہ پتلا رامنٹا مانتا تھک جاتا اور پھر آفس کریم اور ہیزا جیسی رشوت دے کر اسے مٹانے میں کامیاب ہوتا، عینا کو مٹانا اس لئے بھی ضروری تھا اگر بابا کے کانوں تک یہ خبر پہنچ جاتی کہ ان کی لاڈلی کو کچھ کہا گیا ہے تو بس پھر عمار کی خیر نہیں تھی اور عینا تو شکایت لگانے میں ماہر تھی دو کی چار اور چار کی آٹھ بتانے کی اس کا کوئی ٹانی نہیں تھا شام کی چائے بابا اپنی لاڈلی کے ساتھ پیتے تھے اس دوران عینا کوئی قصہ نہ سنائے یہ وہی نہیں سکتا تھا۔

”بابا آج مسز نیازی اور مسز خان میں اتنی لڑائی ہوئی اتنی لڑائی ہوئی کہ پوچھیں مت۔“

”کون مسز نیازی؟“ بابا کا خیال تھا کہ کوئی آس پڑوس کی خاتون ہوں گی۔

”ہماری اکٹائکس کی لیچمر۔“ عینا ان کے سوال پر بد مزہ سی ہو جاتی آخر اتنی بار انہیں مسز نیازی اور مسز خان کا بتا چکی ہے پھر بھی بھول جاتے ہیں۔



”آپ میری بات نہیں سن رہی نا؟“  
 ”سن تو رہی ہوں اور کیسے سنتے ہیں۔“  
 ”اچھا پھر یہ بتائیں میوند کون ہے؟“ وہ  
 فوراً ان کا امتحان لیتی ای سیٹھا جاتیں۔  
 ”تمہاری دوست ہی ہوگی؟“

”جی نہیں، وہ میری دوست نہیں ہے بلکہ  
 میری دوست کی بہن ہے جس کی میں آپ کو بات  
 بتا رہی تھی۔“

”تو دوست کی بہن بھی تو دوست ہوگی  
 نا؟“

کونہ پھلاتے دیکھ کر بابا فوراً عمار کو نوکتے، بیٹا فخر  
 سے نادیدہ کار اگڑاتے ہوئے عمار کو چڑائی اور  
 پھر آپا کو فون آجاتا تو دو گھنٹے فون پر قبضہ کیے  
 رکھتی، ای اس انتظار میں بیٹھی رہتی کہ کب اس کی  
 باتیں ختم ہوں تو وہ کچھ دیر بڑی بیٹی سے دکھ سکھ کی  
 بات کر لیں پر ایسی نوبت کم ہی آتی تھی تب تک  
 آبا کے سوئے ہوئے بچے جاگ جاتے یا پھر  
 افضل بھائی آفس سے آجاتے۔

بھابھی سے اس کی ابھی خاصی بنتی تھی بابا  
 کے بعد بھابھی واحد ہستی تھی جو بغیر ٹوکے بڑی  
 دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی تھیں ای تو سنتے سنتے  
 جانے کس جوتوڑ میں کم ہو جاتی تھیں اور اسے  
 فوراً اندازہ ہو جاتا کہ اس کی بات دھیان سے  
 نہیں سنی جا رہی، وہ غلطی سے انہیں دیکھتے ہوئے  
 پوچھتی۔



”بالکل نہیں، بیوہ نہ تو میری ایک منٹ نہیں بنتی، بہت بری لگتی ہے مجھے۔“  
 ”کیوں؟“ امی حیرت سے پوچھتیں۔  
 ”ابھی وجہ بتائی تو تھی آپ کو۔“ اور امی ذہن پر جتنا بھی زور ڈالیں پر انہیں کچھ یاد نہ آتا، وہ تو اس کی بات سننے جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ اکیسویں سال میں لگی تھی کراچی کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی ان کا خیال تھا کہ اگر ابھی اس کی شادی نہ کی تو اس کی عمر نکل جائے گی، پھر بابا کی پھوپھو زاد بہن کے توسط سے عاصم کا رشتہ آگیا، پڑھا لکھا، سلجھا ہوا عاصم سب ہی کو پسند آگیا تھا عاصم کی امی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ جدہ میں رہتی تھی انہیں چھ ماہ بعد واپس جدہ جانا تھا، وہ عاصم کی شادی کر کے جانا چاہتی تھیں، چھ ماہ کا سن کراچی کے ہاتھ پاؤں پھولے جو پھولے پر عینا کی شامت آگئی، بھابھی امی کے حکم پر اسے یہ کچن میں لئے پہنچی کھانے پکوانی رہتی اس کے رونے کا منتوں کا ناراضگی کا کوئی نوٹس نہ لیا جاتا۔

”شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔“ بھابھی اسے سمجھاتیں۔  
 ”اتنا پیچیدہ راستہ کیوں ہے، بھابھی کوئی شارٹ کٹ راستہ نہیں ہے کیا؟“ وہ چہرے پر معصومیت سجائے ان سے پوچھتی، تو وہ مسکراتے ہوئے لگی میں سر ہلا دیتیں۔

عمار سارا دن دو ہائیاں دیتا رہتا ”عینا خدا کا واسطہ ہمارے معدوں پر رحم کرو تمہارے ہاتھ کا پلاؤ کھا کر ابھی تک پیٹ میں درد ہے اس کے ہاتھ میں جو آتا وہ عمار کو دے ماری عمار کمال مہارت سے کچل کر لیتا۔

چھ ماہ گزرتے دیر نہ لگی وہ آنکھوں میں سہانے سننے سجائے عینا وقار سے عینا عاصم بن گئی، شادی کے ایک ہفتے بعد اس کی ساس اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے ساتھ واپس جدہ چلی گئیں۔  
 ”کتنا فضول پولتی ہو تم۔“ وہ عاصم کو کوئی قصہ سنار ہی تھی یہ دیکھے بغیر کے وہ کتنی بے دلی سے سن رہا تھا اس نے جیسے ہی لوکا تھا وہ حیرت سے اسے دیکھے مگر کتنی ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے دیر نہیں لگی تھی پر دوسری طرف اس کی خاموشی کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تھا عاصم کی ساری توجہ بیوی کی طرف تھی۔

وہ عمار نہیں تھا جسے وہ سامنے پڑا کشن دے ماری یا پھر منہ پھلا کر کہتی کہ آئندہ مجھ سے بات مت کرنا، وہ آنسو چھائی وہاں سے اٹھ گئی۔  
 ”یہ کیا جاہلوں کی طرح منہ بھاڑ کر ہنستی ہو تمیز نہیں ہے تمہیں۔“ وہ عمار سے فون پر بات کر کے ہٹی تھی جب عاصم کے اتنے سخت الفاظ پر حق دق سے اسے دیکھے گئی تھی۔

اس دن کے بعد عینا نے یوں بے تحاشا ہنسنا چھوڑ دیا تھا اسے چپیلیوں سے خوف آتا تھا انہیں دیکھتے ہی اس کی چپٹیں بلند ہو جاتی تھیں عاصم کو اس کا یوں چیخا چلانا بہت برا لگتا تھا۔

”یہ کیا بچوں کی طرح چیخنا شروع کر دیتی ہو یہ تمہیں کھا نہیں جائیں گی اپنا اور ان کا سائز دیکھو۔“ عاصم کی ڈانٹ کا یہ اثر ہوا کہ پھر اس نے ان چھوٹے موٹے کپڑوں سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا اب کبھی چوہے یا چھپکلی دیکھ بھی لیتی تو ڈھیت بنی اپنا کام کرتی رہتی، اسے بے ساختہ عمار یاد آتا جو اس کی ایک جگہ پر جھاڑ ڈٹا اٹھائے پہنچ جاتا اور چوہے اور چھپکلی کی ڈیل ہاڈی سمیت کمرے سے برآمد ہوتا۔

”کتنا بڑا ذائقہ کھانا پکاتی ہو تم، کیا سکھایا ہے

تک عامم کی پسند میں ڈھل گئی بھی آپایا بھابھی کا فون آ جاتا تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ بات کرتی، وہ نان اسٹاپ بولنے والی عینا کو اب وہ سارے قصے کہانیاں بھول گئی تھیں۔  
 عمار اپنی بیوی کو عینا کی پرانی باتیں بتاتا تو وہ یقین نہ کرتی۔

”مجھے تو عینا بہت سنجیدہ ہی لگتی ہیں۔“  
 ”ارے تم بھابھی سے پوچھو یہ کتنی سنجیدہ تھی اب تو یہ جعلی دانشور بن گئی ہے۔“ عمار اس کو تنگ کرتا تا کہ وہ اس سے لڑے اسے کچھ کہے پر وہ چہرے پر ہنسی کی مسکراہٹ سجائے خاموش چلی رہتی۔

اسے فاسٹ میوزک پسند تھا پر اب وہ صرف فیض احمد فیض کی غزل سنتی تھی۔

میرا	درد	نغمہ	بے	صدا
میری	ذات	ذرا	بے	نشاں
میرے	درد	کو	جو	زباں
مجھے	اپنا	نام	و	نشاں
میری	ذات	کا	جو	نشاں
مجھے	راز	لغیم	جہاں	طے
جو	مجھے	یہ	راز	نہاں
میری	خاشی	کو	بیاں	طے
مجھے	کائنات	کی	سروری	طے
مجھے	دولت	دو	جہاں	طے

☆☆☆

وہ گھر کے کام سے فارغ ہوئی تھی کہ عامم کا فون آ گیا تھا آج اس کے کسی کو لیک کی شادی تھی اسے تیار رہنے کا آڈر دے کر اس نے فون بند کر دیا تھا وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسے صبح سے مسلسل چکر آ رہے ہیں پر عامم نے اس کی سننے بغیر ہی کال کاٹ دی تھی۔

تمہاری ماں نے تمہیں..... گھر سے بھی کچھ سیکھ کر آئی ہو یا نہیں۔“ وہ سوچ میں پڑ جاتی واقعی اس کے گھر والوں نے اسے کچھ نہیں سکھایا اسے اتنے لاڈ پیار سے کیوں پالا؟ کہ اس کے لئے اب عامم کی جھڑپیاں اور گالیاں سننے کی عادت ڈالنے میں مشکل ہو رہی تھیں، عامم کے جانے کے بعد وہ گھٹنوں روٹی رہتی، گھر میں کبھی کسی نے یوں بات بے بات نہ جھڑکا تھا کسی نے بھی اتنا سخت لہجہ استعمال نہیں کیا تھا۔

عمار کی شادی نزدیک آئی تو اس نے بہت دل لگا کر شاپنگ کی تھی۔

”اتنے شوخ کلرز، تم کسی اسٹیج شو کی اداکارہ نہیں ہو تو تھوڑے سوپر کلرز پہنا کر دو۔“ عامم کے الفاظ اور اس کا اعتراض سن کر اس نے پھر کبھی کوئی شوخ رنگ کا سوٹ نہ لیا، اس کی وارڈ روب سوپر بلک جوت بھابھی پھیکے رنگوں سے بھری گئی، پھر اس کی گود میں علی آ گیا وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے کی تک و دو میں جت گئی، اسے اپنا ہوش نہ رہا۔

پھر امی اور بابا دونوں دنیا سے چلے گئے، سب نے کتنا کہا کہ وہ کچھ دن رک جانے پر عامم اسے سوئم ہوتے ہی لے آیا اور وہ چہلم پر مہمانوں کی طرح دن کے دن گئی اور واپس آ گئی، وہ اپنے ماں باپ کی وفات پر جی بھر کے رو بھی نہ سکی تھی۔

کبھی امی بابا کی یاد سے آنکھوں میں آنسو آ بھی جاتے اور عامم کی نظر اس پر پڑ جاتی تو وہ ناگواری سے کہتا۔

”تم نے میرے گھر میں غصہ پھیلا دی ہے۔“

اس نے عامم کی ناراضگی کے ڈر سے ماں باپ کو یاد کر کے رونا بھی چھوڑ دیا، وہ سر سے حیر

”زبان ہے منہ میں، کچھ بولو بھی، یہ کیا ہر وقت سوگ طاری کیے رکھتی ہو۔“

اس کی آنکھوں میں نمی لہرائی تھی اس نے عامم کا چہرہ دیکھنا چاہا پر وہ..... وہ دھندلا سا گیا تھا وہ اتنا لباس فرک کے یہاں پہنچی تھی جب اسے گمان ہوا کہ وہ منزل پر پہنچ گئی اس نے اپنے آپ کو عامم کی پسند کے مطابق ڈھال لیا ہے تو آج عامم کی پسند بدل گئی تھی، اب جب شوخ رنگ اس کی آنکھوں میں جیسے لگ گئے تھے تیز آواز میں بولتی تو گلاب بیٹہ جانتا تھا تو اب اس کی پسند بدل گئی تھی اس کی قربانیوں پر کوئی ایوارڈ نہیں تھا بلکہ ایک تعریفی جملہ تک نہیں تھا۔

اس نے تھک کر سیٹ کی پشت سے ٹپک لگا لی تھی اسے اب پھر سے واپسی کا سفر کرنا تھا۔ بے معنی حیات کی بامعنی باتیں بے زار دن بے کیف راتیں

میرے لئے میرے پاس وقت نہیں یہ دکھ صدیوں سے کاٹ رہا ہے میری رگ و جان میں نہ مانگوں تو میرے لئے محبت نہیں میں تمام دن کی محسن

اپنی روح پاتا رہتی ہوں مجھ سے وابستہ ہیں جو ان کے لئے زندگی بھل کرنے کی تمنا میں اپنے لئے سانس بھی

انہی سے مستعار لیتی ہوں مگر کبھی جب آئینہ مجھے میرا چہرہ دکھائے گھر کے کاموں سے جی اٹھ جائے تو میری خالی خالی آنکھیں

بے ساختہ آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور میرے اندر کوئی کہتا ہے

جو کہتا ہے، خدا یا! میری حیات کو بھی جیل کر دے یا پھر میری زندگی کے معنی تبدیل کر دے

☆☆☆

وہ عامم کے دوستوں کی بیگمات کے جبرمٹ میں کھڑی کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی وہاں موجود تمام خواتین زرق برق لباس پہنے تھیں بکیر رہی تھیں، اسے اپنا آپ وہاں مس لٹ لگ رہا تھا کچھ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی اس نے عامم کی تلاش میں ارد گرد نظر دوڑائی، اسے تھوڑی دور کھڑا عامم نظر آ گیا تھا جو بڑی دلچسپی کے ساتھ ان زرق برق لباس پہنے کھڑی خواتین سے لٹکھو کر رہا تھا وہ بات ہے بات نتیجہ لگا رہی تھیں۔

عینا نے اپنی اور ان خواتین کی عمر کا حساب لگانا چاہا وہ کبھی تقریباً عمر میں اس سے بڑی تھیں بس فرق اتنا تھا وہ سب زندہ دل تھیں، جبکہ عینا کے حراج میں اپنی عمر سے کئی گناہ زیادہ سنجیدگی آ گئی تھی وہ سترائیس سال کی عمر میں سینتالیس سال کی لگ رہی تھی۔

ان سات سالوں میں اس نے خود کو بڑی مشکلوں سے بدلا تھا اس میں اب عینا وقار والی ایک عادت بھی نہیں تھی وہ سر سے پاؤں تک عامم کی پسند میں ڈھل گئی تھی، سو برنگ پہننے والی خاموش طبع اور ہلکا سنجیدہ عینا عامم۔

اس نے حیرت سے عامم کو دیکھا تھا جسے شوخ رنگ پہننے والی بے تحاشا ہستی بولتی لڑکیاں بالکل پسند نہیں تھیں، اسے تو سنجیدہ اور میچور لڑکیاں پسند تھیں، اسے آج کل عامم کے حراج میں واضح تبدیلی نظر آ رہی تھی پر وہ اسے اپنا وہم سمجھ رہی تھی پر آج اس کے وہم پر یقین کی مہر ثبت ہو گئی تھی۔

”تمہیں اسی سے بہتر کوئی سوٹ نہیں ملا تھا پہننے کو، میں نے تمہیں بتایا تھا ہم شادی میں جا رہے ہیں فونک پر نہیں۔“ عامم نے اسے گھورتے ہوئے کہا تھا، وہ لب لعلتی خاموشی سے بیٹھی رہی۔

چلنا۔

”تین چیزوں کی دوستی مضر ہے۔“

نفس، بری صحبت، مال۔

”تین چیزیں محبت بڑھاتی ہیں۔“

سلام کرنا، دوسروں کے لئے جگہ دینا،

دوسروں کو ہدیہ دینا۔

”آدنی کے تین دوست ہیں۔“

مال، رشتے دار، محلِ صالح۔

فرح اسد علی پور

اقتباس

عشق اگر ”عین“ کے لفظ سے آغاز پا کر سر اٹھاتا ہے تو انہما ”قاف“ پر جا کر ختم کرتا ہے، مگر درحقیقت اس اختتام کے ساتھ ہی حقیقی عشق کا آغاز ہوتا ہے، جس میں ”میں“ سے ”ہم“ کا سفر طے کرنے کے بعد ”انا، ضد، فہم اور بے نیازی“ جیسی تمام میزجیوں کو روند کر بالآخر وہ منزل مقدر بن جاتی ہے جس کے آگے پھر کسی منزل کی ”چاہ“ باقی نہیں رہتی اور اس آخری مقام پر انسان خود کو فنا کرنا بالآخر ”امر“ ہو جاتا ہے۔

فرح طاہر، سرگودھا

محبت کا آدھا ذرہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک باغ سے گزرے، وہاں ایک نوجوان باغ کو پانی دے رہا تھا، اس نے آپ علیہ السلام سے کہا۔

”آپ اللہ سے عشق کا ایک ذرہ مجھے عطا کر دیجئے۔“ انہوں نے فرمایا۔

”وہ بہت زیادہ ہے تم اس کے متحمل نہیں ہو

القرآن

○ ”اگر ہم تم پر کاغذوں پر لکھی کتاب نازل

کرتے اور یہ اسے اپنے ہاتھوں سے بھی

ٹٹول لیتے تو جو کافر ہیں، وہ بھی کہہ دیتے

کہ یہ جادو ہے۔“ (سورہ انعام)

○ ”وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا،

پھر (مرنے کا) ایک وقت مقرر کر دیا اور

ایک مدت اس کے ہاں مقرر ہے پھر بھی تم

اے کافرو! (خدا کے بارے میں) شک

کرتے ہو۔“ (سورہ انعام)

○ ”اے محمد! تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے

ساتھ تسخیر ہوتے رہے ہیں، سو جو لوگ ان

میں سے تسخیر کرتے تھے ان کو تسخیر کی سزا نے

آگیرا۔“ (سورہ انعام)

○ ”اور دنیا کی زندگی تو کھیل ہے اور تمنا ہے

اور سب سے اچھا کھر تو آخرت کا گھر ہے،

یعنی ان کے لئے جو (خدا سے) ڈرتے

ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں۔“ (سورہ انعام)

○ ”اور کاش تم اس وقت (کی کیفیت) دیکھو

جب فرشتے کافروں کی جانیں نکالتے ہیں،

ان کے کندھوں اور پیشوں پر (کوڑے اور

بھٹوڑے) مارتے ہیں، (اور کہتے ہیں کہ

اب عذابِ آتش کا مزہ چکھو۔“

علینہ طاریق، لاہور

فرمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

”تین چیزیں ایمان کی نشانی ہیں۔“

آہستہ بولو، پتلی نگاہ رکھنا، میانہ روی سے

”میں دو یا تین قاصد بھیج دوں گا۔“ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا تو ملک الموت آموجد ہوا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا۔

”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آمد سے قبل قاصد بھیج دوں گا۔“ عزرائیل نے کہا۔

”میں نے ایسا ہی تو کیا ہے، پہلے آپ کے سیاہ بال سفید ہوئے، یہ پہلا قاصد تھا، پھر بدن کی چستی و توانائی ختم ہوئی یہ میرا دوسرا قاصد تھا، بعد ازاں آپ کا بدن جھک گیا یہ میرا تیسرا قاصد تھا، کیا خیال ہے یہ میرے تین قاصد نہیں آئے۔“

رابعہ حیدر، قصور

لفظ باتیں کر رہی  
☆ وقت اور نصیب کسی لمحے بھی کسی کو زیر کر سکتا ہے، کسی کو بھی نہیں معلوم، اس کا اگلا شکار کون ہوگا۔

☆ جس پودے کی جڑیں جہاں ہوں وہیں رنگ دکھاتا ہے۔

☆ جاہت نہ ہو تو ایک ذرہ بھی گراں گزرتا ہے، اگر ہو تو ایک کوہ کا بوجھ بھی ندامت سے سہارا جاتا ہے۔

☆ جب آپ پہلا قدم اٹھالتے ہیں تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر واپسی نہیں ہوتی، کھڑا بے شک کچا ہو پھر بھی پار جانا ہے۔

☆ کوئی بھی شہر، قصبہ، بلندی، راستہ یا عورت ہر ملاقات پر ایک الگ شخصیت کی حامل ہوتی ہے آپ کی عمر، مطالعہ اور موسم ہر بار اسے ایک نئے رنگ میں دیکھتے ہیں۔

☆ موت ایک بہت بڑے صبر کی مالک ہے اور وہ کبھی بے صبری نہیں ہوتی۔

☆ وقت ہر تصویر کو بدل دیتا ہے، اس کے کونے

کھینکتے۔“ نوجوان نے کہا۔  
”اچھا آدھا ہی سمجھی۔“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی اور اللہ نے عطا کر دیا۔

آپ وہاں سے روانہ ہو گئے، ایک مدت کے بعد پھر وہاں آئے تو دیکھا کہ جوان غائب ہے، آپ نے دعا کی۔

”اے اللہ! اس نوجوان سے میری ملاقات کرا دے۔“ وہ نوجوان آیا اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا، آپ کے سلام کا جواب نہ دیا، نہ گفتگو کی، مگر خاموش رہا، اس پر وحی الہی آئی۔

”اے عیسیٰ علیہ السلام! جس کے دل میں میری محبت کا آدھا ذرہ موجود ہو وہ لوگوں کو کیسے سنے گا، اگر اسے آری سے دو ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو اسے کوئی تکلیف میرے عشق کے سبب محسوس ہی نہ ہوگی۔“

فریال امین، لاڑکانہ

موت کے پیامبر  
حضرت یعقوب علیہ السلام کا فرشتہ اجل سے گہرا یار نہ تھا، ایک دن ملک الموت آیا تو پوچھا۔

”کیسے آتا ہوا؟ ملاقات یا قبض روح؟“ عزرائیل نے کہا۔

”صرف ملاقات۔“ آپ علیہ السلام نے فرمایا۔

”مجھے آپ سے ایک خاص بات کہنی ہے۔“ ملک الموت نے کہا۔

”فرمائیے۔“ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا۔

”جب میری موت قریب ہو تو روح قبض کرنے سے آنے سے پہلے قاصد بھیج دیتا۔“

ملک الموت نے کہا۔  
”ایسا ہی ہوگا۔“

مڑ جاتے ہیں اور رنگ بھورے ہونے لگتے ہیں، وقت ڈھلوان پہ لوہکتی جیب کی طرح اتنی تیزی سے گزرتا ہے کہ نظروں اور چہروں کے رنگ بدل جاتے ہیں۔

(مستنصر حسین تارڑ)

لالہ گل، پشاور

آمریت

ایک بے روزگار نو جوان ایک ریاست کے نواب کے رو برو پیش ہوا اور سات بار جھک کر فرشی سلام کرنے کے بعد ملازمت کی درخواست پیش کی، نواب صاحب نے عرضی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا پوچھتے ہو؟“

نو جوان نے ایک دفعہ پھر جھک کر سلام کیا اور کہا۔

”جہاں پناہ! بے کار ہوں، لو کر لی جاہتا ہوں۔“

”کتنا بڑھے ہوئے ہو۔“ پوچھا گیا۔

”حضور گر بچو بیٹ ہوں۔“

”مگر بچو بیٹ کا بچہ!“ نواب صاحب اسے خشکیں لگاہ سے دیکھتے ہوئے غرائے۔

”صاف صاف کہو، کتنی جماعتیں پاس ہو۔“

”حضور چودہ جماعتیں۔“

”اونہ!“ نواب صاحب منہ بگاڑ کر بولے۔

”ساری عمر پڑھتے ہی رہے ہو۔“ پھر

دیوان صاحب سے بولے۔

”اسے سول سرجن بنا دو۔“

”حضور پہلے والے سول سرجن کا کیا کیا

جائے؟“ دیوان صاحب نے ادب سے پوچھا۔

”اسے سیشن جج بنا دو۔“

”اور حضور پہلے والے سیشن جج کو؟“

”اس کو دو سال کے لئے جیل بھیج دو۔“

فریال امین، کراچی

واصف علی واصف کہتے ہیں

☆ اللہ کریم جب چاہے، جس وقت چاہے اور جہاں چاہے اس کا فضل نمودار ہو جائے، آپ اللہ کے فضل کا انتظار کرتے کرتے ہزار دفعہ مر جائیں اور کروڑ دفعہ زندہ ہو جائیں، پھر بھی اس کا فضل ایک وقت رکھتا ہے۔

☆ جب تک اندر سے صفات نہ بدلیں اس وقت تک ذکر آپ کو کچھ نہیں دے گا۔

ثناء حیدر، سرگودھا

حسن

محبت کو پالینا تو آسان ہے، لیکن اسے کسی معمولی سی بات پر کھودینا اذیت ناک ہوتا ہے، یہ محبت کا بد صورت ترین انجام ہوتا ہے کہ کوشش کرنا کہ ہم محبت کے حسن کو قائم رکھیں۔

بہار

محبت کے سبز جزیرے میں  
بہار صرف جدائی کے پھولوں سے آتی ہے  
ملاپ کی کلیاں تو  
کھلتے ہی مرجھا جاتی ہیں

ساز احمد، میاں چنوں

تحفہ

مشہور مصنفہ اگتا کرشی نے ایک بار اخباری نمائندوں کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میری شادی کے دو سال بعد تک میری ایک عزیز از جان سہیلی نے مجھے شادی کا تحفہ نہیں دیا، دو سال بعد جب وہ تحفہ لے کر آئی تو اس نے دیر سے تحفہ دینے کی وجہ یہ بتائی۔“

”میں تحفہ دینے سے پہلے یہ یقین کر لینا چاہتی تھی کہ تمہاری شادی باقی رہے گی۔“

نبیہ آصف، سکمر

☆☆☆



ہمارے ----- کراچی  
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست  
تمام رات سلگتے ہیں دل کے دیرانے

.....  
یہ دل کی راہ میں اڑتا غبار کس کا ہے  
وہ جا چکا ہے تو پھر انتظار کس کا ہے  
نہیں وہ اپنا گھر اس کی راہ بھی دیکھوں  
دل و نظر پہ بھلا اختیار کس کا ہے

.....  
قبل اس کے کہ ہو فیصلہ خیر و شر  
جینے کا ثبوت دے زمانے کو بشر  
بے حس کردار سے یک ہے موت بجلی  
نامراد اخلاق ..... جرائم بہتر  
نبیہ آصف ----- سکھر

ایک ایک یاد عمر کا حاصل کہیں جسے  
وہ خلوت خیال کہ محفل کہیں جسے  
ملتی ہو تو خرید دو عالم کو چ کر  
وہ کائنات درد نہاں دل کہیں جسے

.....  
نہ جانے کتنے ستارے یہ کہہ کے ڈوب گئے  
سحر کا رنگ پریشاں ہے دیکھیے کیا ہو  
کلی اداس چنن سوگوار گل خاموش  
یہ انتظار بہاراں ہے دیکھیے کیا ہو

.....  
فنا کے زمرے رنج و محن کے افسانے  
بھی ملے ہیں نئی زندگی کو نذرانے  
تیری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں

میری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے  
شمسہ رفیق ----- بہاول نگر  
کسی سے ہاتھ کسی سے نظر ملاتے ہوئے  
میں بچہ رہی ہوں روا داریاں بھاتے ہوئے  
عجیب خوف ہے اندر کی خاموشی کا مجھے  
کہ راستوں سے گزرتی ہوں گنگناتے ہوئے

.....  
جسے میں دیکھتی ہوں آئینے میں  
وہ میرا عکس ہے چہرہ نہیں ہے  
میں رستہ ہوں کسی منزل کا ایسا  
کسی نے آج تک جسے ڈھونڈا نہیں ہے

.....  
مجھے کسی سے محبت نہیں کسی کے سوا  
میں ہر کسی سے محبت کروں کسی کے لئے  
فرح اسد ----- علی پور

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں  
کون پھرتا ہے در بدر مجھ میں  
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی  
تو ہے موجود اس قدر مجھ میں

.....  
چپ گلیاں بند دروازے آدمی رات اور میں  
سرد ہیں جمونکے لمبا رستہ آدمی رات اور میں  
پچھے ساتھ گزارنے والے موسم کی صدائیں  
سامنے ہے ایک درد کا صحرا آدمی رات اور میں

.....  
کس طرح لوگ چلے جاتے ہیں اٹھ کر چپ چاپ  
ہم تو یہ دھیمان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں



ان کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے  
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں  
عاصم سرور ----- دھاڑی  
طوفان ہے تو کیا غم آپ آواز تو دیجئے  
کیا بھول گئے میرے کچے گھڑے وہ

رکے تو چاند چلے تو ہواؤں جیسا ہے  
وہ فغص دھوپ میں دیکھو تو چھاؤں جیسا ہے

عکس دھوکا دے رہے ہیں اب سر محفل ہمیں  
آئینوں میں اب یہاں پر آنکھ ہونا چاہیے  
راجہ ارشد ----- فیصل آباد  
ہوس کی چہرہ دتی کا نشانہ بن گئی ہے  
میری دنیا سمٹ کر ایک قریہ بن گئی ہے

ہمیں جو رزق دیا اس میں دستیں لکھ دیں  
مگر حصول میں صحرا کی شدتیں لکھ دیں  
میرے نصیب کے خانے میں لوٹا لکھ کر  
پھر اس کے ساتھ کے خانے میں مدتیں لکھ دیں

رات اک ٹوٹے ہوئے چاند کو گھر لایا تھا  
جوڑنے بیٹھا تو خورشید نکل آیا تھا  
سرت مصباح ----- لاڑکانہ  
تم بھلا کیا نئی منزل کی بشارت دو گے  
تم تو رستہ نہیں دیتے ہمیں چلنے کے لئے

چوڑ و عہد وفا کی باتیں کیوں جموٹے اقرار کریں  
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا، کل تم بھی بچتا آؤ گے

جتنے بھی مراسم تھے تیری ذات سے پہلے  
سب ٹوٹ گئے ڈھلتی ہوئی رات سے پہلے  
وہ میرا پتا مانگے تو اتنا ہی بتاتا

اک جمپوزی آتی ہے مکانات سے پہلے  
عالیہ فیصل ----- ملتان  
ایک دنیا کا قصیدہ تھا گرچہ میرے نام  
لفظ آتا تھا ایک فغص کی فہمائش میں

رہتا ہے شوق اس سے ملاقات کا مجھے  
کچھ میرے انتظار کی عادت اسے بھی ہے

ماتا کہ یہ فریب ہے وعدہ ترا مگر  
کرتے ہیں انتظار بڑے اعتبار سے  
عفت سعید ----- رحیم یار خان  
آنکھوں نے جس کو یاد کیا اور رو پڑیں  
وہ چہرہ دیکھتا تھا مجھے آنسوؤں کے چچ  
عادل اب ایک شہر میں رہ کر نہ مل سکیں  
سمنی تھیں قرینیں بھی کبھی فاصلوں کے چچ

جب آفتاب محبت غروب ہونے کو تھا  
تو اک فغص بڑے پیار سے بلانے لگا

منیر جنہیں اپنے دوستوں کی دیدہ ہوتی ہے  
سچ پوچھو تو ان ہی کی عید ہوتی ہے  
لالہ گل ----- پشاور  
کسی پہ ترک تعلق کا مجید کھل نہ سکا  
تیری نگاہ سے ہم یوں اتر گئے چپ چاپ  
ہماری جان پہ ہماری تھا غم کا افسانہ  
سنی نہ بات کسی نے تو مر گئے چپ چاپ

فطرتا دل کا تقاضہ ہے کہ تو ساتھ رہے  
لیکن اے دوست یہ دنیا کو گوارا تو نہیں

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چمٹی ہوئی  
منقبوط کشیوں کو کنارہ نہ مل سکا

اس کے لکھے ہوئے خطوط آج جلا ڈالتے ہیں  
روگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ بکیر  
رہ جاتے ہیں دو دن میں بھلا ڈالتے ہیں

ہم جو روئے تو انہیں کہنا پڑا  
اس طرح کرتی ہے برسات سفر

تھی میری تباہی میں کچھ درختوں کی بھی سازش  
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا  
آمنہ خان  
محبت تو ازل سے ہے محبت تا ابد ہوگی  
اسے میں عصر حاضر کا عقیدہ کہہ نہیں سکتا  
کتاب زندگی میں ہے رقم باب محبت بھی  
مگر کتنی ہیں سطریں خط کشیدہ کہہ نہیں سکتا

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی  
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں  
میرا تو جرم تذکرہ عام ہے مگر  
کچھ دجیاں ہیں میری زلیخا کے ہاتھ میں

پر اک بار یہ سوچ کے دل بھر آیا ہے  
اپنی عمر میں کیا کھویا کیا پالیا ہے  
صابرہ سلطان مرستی بھی آگ سے بجاتے ہیں  
اب تو ٹوٹی مرستی بھی آگ سے بجاتے ہیں  
ہاں بھی تھا نام اپنا بخت آزادوں میں  
صرف اس تکبر میں اسی نے مجھ کو جیتا ہے  
ذکر نہ ہو اس کا بھی گل کو نارساؤں میں

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن  
یہ الگ بات کہ دنیا میں گے اعزاز کے ساتھ

اپنی اپنی انا کے قیدی تھے  
ہمارے سچ کوئی دوسرا نہ تھا  
جناشاہین  
حیدرآباد

وہ تعلق توڑ کر مہربانی کر گیا  
رہا جو فانی تھا اس کو غیر فانی کر گیا  
میں سمجھا تھا کہ مل کر داستان پوری ہوئی  
وہ تو پھنکر کر پھر بڑی لمبی کہانی کر گیا

تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ  
میں تیری عافیت کی مبارک لکیر ہوں

چکانے ہیں وہ ترے سطر پر ہیں کہیں زیر زمین ہیں  
ابھی اس خاک میں میں تم بھی زندہ میرے ہم بھی نہیں ہیں  
ابھی میدان میں ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں ہار کی  
ابھی تو کھیل کا آغاز ہے تم بھی نہیں ہم بھی نہیں ہیں  
سدرہ خانم  
ایک مہینے بعد ملا تو نام بھی میرا بھول گیا  
جس نے چلنے وقت کہا تھا یاد بہت تم آؤ گی

مل گئی جو محبت یازاں غنیمت جانیے  
پھر نہیں آتے پلٹ کر جب چلے جاتے ہیں دن  
وقت اس کے ساتھ کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں  
جانے کس بل میں نہ جانے کب گزر جاتے ہیں دن

شہر طلب کرے اگر تم سے علاج تیرگی  
صاحب اختیار ہو آگ لگا دیا کرو  
آسہ فرمگزر جائے گی بہر صورت  
تو کوئی شرط زندگی تو نہیں

ہم اپنے آپ میں یوں گم ہوئے ہیں عرصے سے  
ہمیں تو جیسے کسی کا بھی انتظار نہیں  
کسی کو ٹوٹ کے چاہیں کہ چاہ کر ٹوٹیں  
ہمارے پاس تو اتنا بھی اختیار نہیں

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے  
یہ یورش حالات ٹلے یا نہ ٹلے

نازیہ کمال ----- حیدر آباد  
کہاں سے لایے دل اہتمام کرنے کو  
خوشی چاہیے اس سے کلام کرنے کو  
بہت بھوم سکی تیرے آس پاس مگر  
کھڑے ہیں گوشے میں ہم بھی سلام کرنے کو

.....  
تہتیں مجھ پہ آتی رہیں ہیں کئی ایک سے ایک نئی  
خوبصورت مگر جو ایک الزام تھا وہ تیرا نام تھا  
دوست جتنے تھے آشنا ہو گئے پارسا ہو گئے  
ساتھ میرے رسوا جو سرعام تھا وہ تیرا نام تھا

.....  
اک اور برس بیت گیا اٹک رواں کے ساتھ  
اب کے برس خدا کرے کوئی خوشی ملے  
رہا باب احمد ----- ساہیوال  
گو کہ تم بہت دور بس رہے ہو مگر  
ان ہواؤں پہ اعتبار مگر لینا  
نئے سال کی ابتدا ہے جان جاناں  
تھوڑی دیر ہم کو بھی یاد کر لینا

.....  
نیا سفر ہے نئی منزلیں نئے حالات  
نہ ڈھونڈ کر رہے ہوئے کارواں کے نقش قدم

.....  
چلتے رہتے ہیں بہت لوگ تمہارے جیسے  
یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہی میں کیا ہے  
میں نے یہ سوچ کے روکا نہیں جانے سے اسے  
بعد میں بھی یہی ہو گا تو ابھی سے کیا ہے  
ام خدیجہ ----- فیصل آباد

.....  
ہر سال تیری یاد کی چاہت کے نام تھا  
ہر سال تیری دید کی چاہت ہمیں رہی

.....  
میں کس حساب میں لکھوں وہ ہجر کے لمحے  
کہ جن میں تو نہ ملا اور نہ تیری یاد آئی

.....  
ہمیں یہ سوچنا ہے کہ زندگی اپنی  
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے  
ہم اہل مشرق ہیں سورج تراشنے والے  
شنا حیدر ----- سرگودھا  
جو ہو سکے تو ہانچے اپنی سرستیں  
یہ سوچنا غلط کہ ہمیں زمانے سے کیا ملا

.....  
ہم نے شکست کھا کے بھی ذکر وفا نہیں کیا  
خود کو ہلاک کر لیا، خود کو خدا نہیں کیا  
جو بھی ہم تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو  
آپ بہت شریف ہیں آپ نے کیا نہیں کیا

.....  
جشن وصال کی لاکھ سیلیں اور خجوں ہزار  
مجھے اک بس تو نہیں ملا، دیے لوگ ہزار  
ہمیں بدل کے جوگی والا گا تا پھرے فرحت  
عشق میں روگ ہزار سائیں عشق میں روگ ہزار  
راہ حیدر ----- قصور

.....  
حسن مری آنکھوں کا دھوکا  
عشق مرے دل کی سچائی  
چلتے چلتے عمر بتا دی  
منزل پھر بھی پاس نہ آئی

.....  
کوئی تو جہانک کے دیکھے شکستگی ان کی  
جو دیکھنے میں ہیں اونچی عمارتوں کی طرح

.....  
فرح طاہر ----- سرگودھا  
مگر یہ جدائی کی گھڑی ہے تو میرا تم حوصلہ دیکھو  
نہ تو پٹوں کی نہ پکاروں کی نہ ہی لوٹ کہ آؤں گی

☆☆☆



طاہرہ بشیر ----- ساہیوال

س: السلام وعلیکم! جناب کیا کر رہے ہیں؟

ج: آپ کے سوال پڑھ رہا ہوں۔

س: ہمیں تو حنا کی محفل سے محبت ہے اور آپ کو؟

ج: محفل والوں سے۔

س: کبھی غصہ آیا؟

ج: بے شک سوال پڑھ کر۔

س: کس بات پر زیادہ غصہ آیا؟

ج: جس بات پر بھی غصہ آیا۔

س: زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

ج: برامان جاؤ گی پڑھ کر۔

س: کیا دوستی پیار ہے؟

ج: نہیں۔

س: کیا زندگی گزارنے کے لئے لومیرج ضروری ہے؟

ج: اچھے بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔

س: میرے لی اے کے پیچہ ز ہونے والے ہیں۔ دعا کریں گے۔

ج: کس کے لئے؟ تمہارے لئے یا معین کے لئے۔

س: فریال امین ----- کراچی

س: آداب میں غنیمت جی کیسے مزاج ہیں؟

ج: اللہ کا شکر ہے۔

س: میرے بغیر کیسا رہا؟

ج: سچ بتائیں۔ برا تو نہیں مانوں گی۔

س: میں غنیمت جی کو ناسٹڈ بتائیں؟

ج: بہت سکون رہا۔

ساراحید ----- ساہیوال

س: باہر کا موسم اندر کے موسم سے کب ملتا ہے؟

ج: دل کی مراد بھرا آنے پر۔

س: اگلے موسم بہار میں بھلا ہم کہاں ہوں گے؟

ج: ”ایک شخص کی لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔ دوسرے دن وہ افسوس کرنے والے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ایک بات ہے کہ میری وہ لڑکی بڑی اللہ والی تھی بھاگنے سے ایک رات پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ ابا دو دن بعد ہمارے ہاں ایک شخص کم ہو جائے گا۔“ اب تم؟

س: ہر شوہر کو بیوی اچھی لگتی ہے مگر دوسرے کی کیوں؟

ج: اسی کو تو کہتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔

س: آپ کو کبھی کسی نے دن میں تارے دکھائے؟

ج: کیوں تمہارا ادارہ ہے۔

س: اگر انسان ریوٹ کنٹرول سے چلے لگیں تو؟

ج: لگیں تو کیا مطلب؟ ابھی بھی چلتے ہیں یقین نہیں آتا تو کسی بھی شوہر کو دکھ لو۔

س: نفرت کی زمین پر بھی پیار لکھنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟

ج: اس دور میں تو پاگل ہی ہوتے ہیں۔

س: کس موسم کا جادو سچہ کر بوتا ہے؟

ج: جس میں اندر اور باہر کا موسم یکساں خوشگوار ہو۔

نامعلوم -----  
 س: میں بھی خریدار ہوں میں بھی خریدوں گی؟  
 ج: بک سال رہے۔  
 س: آپ کی محفل میں سر کے بل آؤں یا پاؤں  
 گئے؟

ج: جس طرح دل چاہے آؤ۔  
 بیٹھے ہیں ہم دیدہ دل فراش راہ کیے  
 س: اس کی آنکھیں بتاؤ کیسی ہیں؟  
 ج: کس کی؟  
 س: وہ لڑکی بہت یاد آتی ہے۔ بھلا کیوں؟  
 ج: کون سی لڑکی؟

حتا زناز ----- پنڈواڈخان  
 س: مری انگلیاں بھی جلا گیا لکھا جو ترا نام  
 بھلا سوچو تو کیا ہوگا حال مرے دل کا  
 ج: غم بھی کمر طرف ملا طرف کا گم کیا کرنا  
 مستقل زخم کی ٹیسوں کو رگم کیا کرنا  
 س: کبھی دکھوں کے سائے میں بیٹھ کر سوچتا  
 ہم غمزدہ دل کے بارے میں بھی کبھی تم  
 خوشیوں کی چھاؤں میں بھلا کہاں پتہ چلتا ہے  
 درد سینے میں کہاں تک اتر جاتا ہے  
 ج: عشق وہ کس کام کا جس کا نشان امتیاز  
 داغ دل زخم جگر اور آبلہ پائی نہ ہو  
 شیا صابریت ----- ادا کاڑھشی  
 س: شاعر لوگ اتنے حساس کیوں ہوتے ہیں؟  
 ج: شاعری حساس لوگوں کا کام ہے۔  
 س: حسین لوگ مفرد کیوں ہوتے ہیں؟  
 ج: خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی  
 ہے۔

س: انسان اتنا ہوس پرست کیوں ہے؟  
 ج: کتنا ہوس پرست؟  
 س: دنیا والے اتنے بے مروت کیوں ہیں؟  
 ج: کتنے بے مروت؟ اپنے تجربے سے بتاؤ۔  
 س: دنیا کی سب سے بڑی آبی طاقت کون سی  
 ہے؟

ج: آب۔

س: نظر اور نذر میں کیا فرق ہے؟  
 ج: جب نظر لگ جائے تو اکثر لوگ نذر مانتے  
 ہیں۔

علی ناصر ----- حافظ آباد  
 س: عین غمیں تھوڑی سی غیر حاضری کے بعد حاضر  
 خدمت ہوں کیسے ہو؟  
 ج: تھوڑی سی غیر حاضری؟  
 س: شامے تم گرمی سے بچنے کے لیے برف کے  
 گولے کھاتے ہو کیا واقعی؟  
 ج: شامہاں سے برف کے گولے تم ہی تو بیچتے  
 ہو۔

س: دیکھو اتنی شدید گرمی میں گرما گرم جواب نہ  
 دیا کرو میری بات مان لو ناں؟  
 ج: اب تم غیر حاضر تھے اور برف کے گولے مل  
 نہیں رہے تھے تو جواب تو گرم سے لگیں گے

نا۔  
 س: تم نے کبھی خود بھی کچھ لکھا ہے یا؟  
 ج: تمہارے سوال کا جواب۔  
 س: کوئی مقابلے کا رقیب نہ ملے تو کیا کرنا  
 چاہیے؟ تجربے کی روشنی میں بتانا؟  
 ج: ڈھونڈ لو۔

س: وہ تو صدیوں کا سفر کے یہاں پہنچا تھا  
 تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں  
 ج: واہ صدیوں کے ربط سے تم تو  
 ایک ہل میں مکر گئے جاناں  
 س: گرمی بہت ہے مجلس جاؤ گے اپنا خیال بھی  
 رکھتے ہو کہ نہیں؟

ج: اتنی گرمی نہیں ہے یہ لاہور ہے حافظ آباد  
 نہیں۔

س: اگر کوئی چھوڑ دینے کا کہے تو کیا کرنا چاہیے؟  
 پلیر بتا دو ناں؟

ج: کیا چھوڑنے کو کہے؟ ذرا وضاحت کرو۔

☆☆☆

س: کیا کہہ رہے ہیں ادھر دیکھیں؟

ج: دیکھ تو رہا ہوں۔ میں ناک پر رومال رکھ لوں۔

نازیہ سجاد ----- سکھر

س: محبت کیا صرف ایک بار ہوتی ہے؟

ج: جی ہاں بعد میں عادت بن جاتی ہے۔

س: مکمل تنہائی کسے اچھی لگتی ہے؟

ج: جسے محبت ہوگئی ہو۔

س: حسن کو چاند کیوں کہتے ہیں؟

ج: اس تک رسائی جو مشکل ہے۔

س: عام طور پر تو شادیاں ہوتی ہیں؟

ج: شادیاں عام طور پر ہی ہوتی ہیں۔

س: محبت کیا ہے؟

ج: کیا تمہیں نہیں معلوم؟

س: روشنی کیا ہے؟

ج: لویہ بھی بتانا پڑے گا۔

س: محبت میں کامیابی کا راز؟

ج: محبت کیا ہے تمہیں معلوم نہیں اور کامیابی کا

راز پوچھنے لگے ہو۔

س: کسی سے پیار ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: علاج اپنے ماں باپ کے پاس جا کر۔

رہاب احمد ----- ملتان

س: میری آنکھوں میں دیکھو؟

ج: تمہیں نیند آرہی ہے۔

س: انہوں کی جدائی کیوں برداشت نہیں ہوتی؟

ج: ان کی عادت سی جو ہو جاتی ہے۔

س: زندگی میں انسان کی ہار کب ہوتی ہے؟

ج: جب اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو۔

س: انسان اپنی بے عزتی کب برداشت کر لیتا ہے؟

ج: جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

س: ایک عورت کے لئے زندگی کا سب سے

بھاری بوجھ کون سا ہوتا ہے؟

ج: جب تمہارے جیسے نکلے خاوند کا بوجھ اٹھانا

پڑے۔

س: محبت کرنے کے لئے کیا چیز چاہیے؟

ج: دل۔

س: دنیا کی خوبصورت کیا چیز ہے؟

ج: دنیا خود بہت خوبصورت ہے۔

س: زندگی کی اداس راہوں میں؟

ج: خوشیاں بکھیر دو۔

ام خدیجہ ----- فیصل آباد

س: آداب عین جی! تو پھر کیا انتہار ویلنٹائن پر؟

کیا تو کیا ملا؟

ج: روز۔

س: یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی..... اب

وہ سچ راہ میں کہہ رہا ہے ہمیشہ کے لئے ”مگنڈ

ہائے“ اب میں کیا کروں؟

ج: راہ بدل لو۔

س: ”گھٹیا“ لفظ کا معنی تو لکھ دیں کہ کیا ہے؟

ج: لعنت سے استفادہ کر لو۔

س: کیا اپنی محبت کو گھٹیا کہنے والے محبت کر سکتے

ہیں کسی سے؟

ج: محبت بھی گھٹیا نہیں ہوتی۔

س: کیا آپ نے کبھی کسی کی محبت کی تو ہیں کی

ہے؟

ج: نہیں۔

س: جب کوئی پیار سے بلائے گا..... تم کو.....؟

ج: ایک شخص بہت یاد آئے گا۔

☆☆☆



”بہتر ہو گا کہ تم کسی ٹریکٹر کا بندوبست کرو،  
کیونکہ میں اپنے اونٹ پر سوار ہوں۔“  
کل لالہ، پشاور

یقین

ایک عائب دماغ پروفیسر ارباز سے ان  
کے دوست احتشام نے کہا۔  
”میں نے پروفیسر ارباز تمہاری بیوی کو  
دیکھا تھا، وہ فلاں بندے کے ساتھ گاڑی میں جا  
رہی تھی۔“

پروفیسر ارباز کو بہت غصہ آیا، وہ ساری  
رات ڈنڈا لے کر دروازے کے پیچھے بیٹھے رہے،  
صبح انہیں یاد آیا کہ ابھی تو ان کی شادی بھی نہیں  
ہوئی۔

ام خدیجہ، فیصل آباد

ماہر نفسیات

ایک بڑے ہوٹل میں ماہر نفسیات کا کنونشن  
منعقد ہو رہا تھا، کنونشن کے دوران ایک روز دو  
ماہرین نفسیات راہداری میں ایک دوسرے کے  
پاس سے گزرے، دونوں ایک دوسرے کو جانتے  
تھے، ایک نے مسکرا کر دوسرے کو۔

”ہیلو!“ کہا دوسرے نے کوئی جواب نہ دیا  
اور کافی آگے جا کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے  
ہو کر سر کھاتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔

”آخر اس ”ہیلو“ کہنے کا مقصد کیا تھا؟“

دو گھنٹے وہ وہیں کھڑا اس سوال پر غور کرتا  
رہا، تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ دوسرے  
نفسیات دان کے ہیلو کہنے کا مقصد ہیلو کہنا ہی

فون

میجر تمیز صاحب نے کسی کام سے چہرہ اسی  
کو بلایا، لیکن بات ادھوری چھوڑ کر واش روم میں  
چلے گئے، ابھی وہ وہیں تھے کہ فون کی گھنٹی بج  
اٹھی، چہرہ اسی نے فون ریسپونڈ کر لیا۔

اسی اثنا میں میجر تمیز صاحب واپس آ گئے،  
چہرہ اسی نے پوچھا ہوتے انداز میں ریسپونڈ  
کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سرا میرا خیال ہے کوئی آپ سے بات  
کرنا چاہتا ہے۔“

”خیال ہے، کیا مطلب؟ تم یقین سے  
کیوں نہیں کہہ رہے ہو، یہ میرا فون ہے؟“ میجر  
تمیز صاحب نے ریسپونڈ تھانے سے پہلے جرح  
کی۔

”سرا وہ دراصل، جیسے ہی میں نے ریسپونڈ  
اٹھایا دوسری طرف سے کوئی بولا۔

”گلدھے! ذرا غور سے میری بات سنو۔“

عافیہ رفتی، لاہور

بندوبست

ایک صحرا سے ایک آدمی کا گزر ہوا تو اس  
نے ایک شخص کو ریت میں دبا ہوا دیکھا، اس کا  
چہرہ ریت سے باہر تھا اور وہ مدد کے لئے پکار رہا  
تھا، وہ شخص کہنے لگا۔

”تم غمزدہ میں کہیں سے بچنے لے کر تمہیں  
باہر نکالتا ہوں۔“

ریت میں دبے ہوئے آدمی نے مسکین سی  
صورت بنا کر کہا۔

تھا۔

رہا اب احمد، سکھر

چوری

عامر نے اپنے دوست شہزاد سے کہا۔

”میں نے شہر میں چوری کی بڑھتی ہوئی وارداتوں سے تنگ آ کر پولیس حکام کو ایک درخواست بھیجی تھی۔“

”پھر کیا ہوا، کیا کوئی کارروائی ہوئی؟“ شہزاد نے تجسس سے پوچھا۔

”جواب آیا کہ آپ کی درخواست فائل سے چوری ہو گئی ہے؟ دوسری درخواست بھیجئے۔“ عامر نے منہ بنا کر جواب دیا۔

عافیز رفتی، لاہور

بادشاہ

ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔

”میری زندگی میں کبھی کبھی ایسا وقت آتا ہے جب میں خود کو گھر کا بادشاہ محسوس کرتا ہوں۔“

”کس وقت؟“ دوست نے پوچھا۔  
”جب میری بیوی گھر پہ نہیں ہوتی۔“ ان صاحب نے جواب دیا۔

ہمارائے، کراچی

کیفیت

ڈاکٹر وارڈ کا چکر لگا رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔

”ابھی اس سرے کا کیا بنا جو ہر وقت کچھ نہ کچھ بکارتا ہے، کیا اس کی یہ کیفیت ختم ہو گئی۔“ ماتحت نے جواب دیا۔

”جناب! اس کی یہ کیفیت برقرار ہے، آپ کے آنے سے پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ، عزرائیل آ رہا ہے وہ دیکھو عزرائیل آ رہا ہے۔“

نہیہ آصف، سکھر

معانی

ایک آدمی۔ ”تم کون ہو۔“

دوسرا۔ ”میں وہ ہوں جس سے سب معافی مانگتے ہیں۔“

پہلا۔ ”کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟“

دوسرا۔ ”میں بھکاری ہوں۔“

شہباز رفتی، کورنگی کراچی  
اور حاجی بھی

ایک صاحب نہایت پابندی سے مسجد میں باجماعت کی حاضری دیا کرتے تھے، لوگ ان کے تعویٰ سے بہت متاثر تھے، ایک شخص نے جب انہیں نہایت انہماک سے نماز ادا کرتے دیکھا تو اپنے ساتھی سے بولا۔

”یہ جو شخص نماز ادا کر رہا ہے، نہایت متقی اور پرہیزگار ہے۔“ اس پر وہ صاحب نماز توڑ کر بولے۔

”اور جناب میں حاجی بھی ہوں۔“

حمیرا فاطمہ، کورنگی کراچی

بیگم کا دسترخوان

وہ بچی کھجڑی رکھی ہے شوق فرمائیں گے کیا توبہ خالی پیٹ ہی دفتر طے جائیں گے کیا جائے میں لہسن کی بد بو آگئی تو کیا ہوا

اللہ اللہ ماں، بہن پر آپ اترا میں گے کیا دودھ میں کبھی تھی چوہا تو نہ تھا اے حضور

ہاتھ دھو کر اب پیچھے ہی پڑ جائیں گے کیا پیاز کا حلوہ بنا دوں اے زرارک چائیں

بھوکے رہ کر آپ میری ناک کنوا میں گے کیا

عاصمہ سرور، بورے والا

گوشہ عافیت

ایک گوالے کا لڑکا فوج میں بھرتی ہو گیا، ٹریننگ کے دوران جب اس کی طرف سے خیر خیریت کا کوئی خط نہ آیا تو ماں نے محلے کے کسی آدمی کو بلا کر اسے خط لکھوایا، پھر ماں کو اس نے



جواب میں لکھا۔

بھی ڈلیش اور فل اسٹاپ نہیں لگائے، جب اسے یاد آیا تو جلدی جلدی انداز سے فل اسٹاپ لگا دیے، جس کی وجہ سے ای میل کچھ یوں ہو گئی۔

پیارے رولہ جی!

آپ نے کئی دنوں سے پیار بھرا خط نہیں لکھا میری سہیلی پوجا کو، تو کمری سے نکال دیا ہے ہماری گائے نے، پھنڑا دیا ہے انکل جی نے، سگریٹ پینی شروع کر دی ہے میں نے، بہت خط لکھے پر تم نہیں آئے کیوٹر کے بچے، ملی کھا گئی ہے کھی، چھٹی سے آتے وقت لے آنا ایک خوبصورت عورت، میری سہیلی بن گئی ہے، شریا بھوپالی، اس وقت ٹی، دی پر ڈانس کر رہی ہے ہماری مرضی، سچ دی ہے تمہاری ماں، جہیں یاد کرتی ہے پڑوسن، مجھے تنگ کرتی ہے زمین، سرسوں اک آتی ہے چچی جی کے سر پر، پھوڑا ہو گیا ہے، میرے پاؤں میں، چوٹ لگ گئی ہے تمہاری چھٹی کو، ہر وقت تڑپتی ہوں، بھیا سے ضرور مل کر آنا، آپ کی چٹی، ”کلپنا“

فرح اسد علی پور

ہری مرچیں

ایک صاحب بوریا بستر سمیت ایک ٹی وی چینل کے دفتر میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے، سیکورٹی والے نے رد کا تو بولے۔  
”بڑیک ختم ہوا یا نہیں۔“ سیکورٹی والوں نے پوچھا۔

”کیوں؟“ جواب ملا۔

”ہم اس بی بی کے ساتھ رہنے آئے ہیں جو کہہ رہی تھی کہ ہمارے ساتھ رہے گا، ملتے ہیں بڑیک کے بعد۔“

عفت سعید، رحیم یار خان

”اماں یہاں میں بہت خوش ہوں اور میٹھ کر رہا ہوں، کیونکہ گھر میں تو اماں دو بچے مجھے زیر دستی اٹھا دیتے تھے، یہاں میں اپنی مرضی سے صبح کم از کم چار بجے اٹھتا ہوں۔“  
راجہ ارشد فیصل آباد

نجات

ایک بے حد موٹی عورت کے گھر میں چور گھس آیا، جب وہ چوری کر کے جانے لگا تو عورت اسے دیکھ کے اس کے پیچھے لگی، چور گھبراہٹ کے مارے گر پڑا، موٹی عورت چور کی کمر پر کھڑی ہو گئی اور شوہر کو تھانے کی طرف دوڑنے کو کہا، شوہر کافی دیر چپل تلاش کرنے کے بعد بولا۔

”پیغم میری چپل نہیں مل رہی۔“

”اللہ کے بندے میری چپل پہن کر جلد سے جاؤ۔“ چور بلبلاتے ہوئے بولا۔

سمرت مصباح، دیپالپور

آزمائش

”رات، میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک نئی قسم کا ناشتا ایجاد کیا ہے، میں اس وقت آزمائشی طور پر اسے کھا کر دیکھ رہا تھا، جب میری آنکھ کھل گئی۔“ کمال نے ایک روز عمران کو بتایا۔

”اچھا..... تو پھر کیا ہوا؟“ عمران نے

دلچسپی سے پوچھا۔

”میں نے دیکھا کہ میرے نوم کے گدے کا ایک کونا غائب تھا۔“ کمال نے ذرا مایوسی سے جواب دیا۔

راجہ حیدر قصور

جلدی میں

ایک بیوی نے شوہر کو ای میل کی، لیکن کہیں

☆☆☆

عفت سعید: کی ڈائری سے امن انشاء کی غزل  
 اس دل کے جھروکے میں اک روپ کی رانی ہے  
 اس روپ کی رانی کی تصویر بتاتی ہے  
 ہم اہل محبت کی وحشت کا وہ دریاں ہے  
 ہم اہل محبت کو آزاد جوانی ہے  
 یاں جانے کے داغوں کو سینے میں بساتے ہیں  
 دنیا کبھے دیوانا ، یہ دنیا دیوانی ہے  
 اک بات مگر ہم بھی پوچھیں جو اجازت ہو  
 کیوں تم نے یہ غم دے کر پردیس کی ٹھانی ہے  
 سکھ لے کے چلے جانا ، دکھ دے کر چلے جانا  
 کیوں حسن کے ماتوں کی یہ ریت پرانی ہے  
 بدیہ دل مفلس کا ، چہ شعر غزل کے ہیں  
 قیمت میں تو جیکے ہیں انشاء کی نشانی ہے  
 رباب احمد: کی ڈائری سے فیض احمد فیض کی  
 غزل  
 ہمت التجا نہیں باقی  
 ضبط کا حوصلہ نہیں باقی  
 اک تیری دید چمن مگنی مجھ سے  
 ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی  
 اپنی مشق ستم سے ہاتھ نہ کھینچ  
 میں نہیں یا وفا نہیں باقی  
 تیری چشم الم نواز کی خبر  
 دل میں کوئی گلہ نہیں باقی  
 ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال  
 زندگی میں مرا نہیں باقی  
 شہوار احمد: کی ڈائری سے خوبصورت نظم  
 ”تہائی، وہ اور میں“  
 وہ کہتا ہے  
 اس کے پاس چھپانے کو  
 کوئی راز نہیں ہے  
 کہنے کو  
 کوئی بات نہیں ہے  
 کوئی کام نہیں ہے  
 اسی لئے تو اس کا، کوئی دوست نہیں ہے  
 میں کہتا ہوں  
 میرے پاس چھپانے کو بھی راز بہت ہیں  
 کہنے کو ہاں میں ڈھیر ہوں ہیں  
 پھر بھی کوئی دوست نہیں ہے  
 یہاں کسی سے میری عمر کا کوئی لمحہ چھپا نہیں ہے  
 اوروں کی بات الگ ہے  
 میرے جاننے والوں کو بھی میرے دکھوں کا پتا  
 نہیں ہے  
 ثناء حیدر: کی ڈائری سے امجد سلام امجد کی نظم  
 جن لو اپنے اپنے خواب  
 اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا  
 گلابوں کا اور مہتابوں کا  
 ہر آنکھ طلب سے بوجھل ہے  
 ہر خواب کسی کی منزل ہے  
 یہ شام سے کا دھندلا ہے  
 اس وقت یہاں پر مندا ہے  
 ایمان کی قیمت دو آنے  
 احسان کی قیمت دو آنے  
 تشہد کی قیمت دو آنے  
 ہر خواب کی قیمت دو آنے

”جن لو اپنے اپنے خواب

اپ ڈیر لگا ہے خوابوں کا

درمکن کی ڈائری سے منیر نیازی کی غزل

یہ کیا نشہ ہے میں کس مجب خمار میں ہوں

تو آ کے جا بھی چکا ہے میں انتظار میں ہوں

مکاں سے قبر جسے لوگ خود بتاتے ہیں

میں اپنے گھر میں یا میں کسی مزار میں ہوں

در فصیل کلا یا پہاڑ سر سے ہٹا

میں اب گری ہوئی گھٹوں کے مرگ زار میں ہوں

بس اتنا ہوش ہے مجھ کو کہ اجنبی ہیں سب

رکا ہوا ہوں سفر میں کسی دیار میں ہوں

میں ہوں بھی اور نہیں بھی عجیب بات ہے یہ

یہ کیا خبر ہے میں جس کے اختیار میں ہوں

منیر دیکھ شجر چاند اور دیواریں

ہوا خزاں کی ہے سر پر شب بہار میں ہوں

گل لالہ کی ڈائری سے محسن نقوی کی نظم

”ترے ملنے کا اک لمحہ“

بس اک لمحہ سہی، لیکن

نکھر جائے تو موسم ہے

دفا کا بے کراں موسم

ازل سے مہرباں موسم

یہ موسم آنکھ میں اترے

تو رنگوں سے دہکتی روشنی کا

عکس کہلائے

یہ موسم دل میں منہرے تو

سنہری، سوچتی صدیوں کا

گہرا نقش بن جائے

ترے ملنے کا اک لمحہ

مقدر کی لکیروں میں

دھنک بھرنے کا موسم ہے

یہ موسم

خوبصورت شاعری کرنے کا موسم ہے

جو رہ یہ ناصر کی ڈائری سے احمد فراز کی غزل

وہی عشق جو تھا کبھی جنوں اسے روزگار بنا دیا

کہیں رزم چ کے آگئے کہیں شعر کوئی بنا دیا

وہی ہم کہ جن کو عزیز تھی در آمد کی چمک دک

یہی ہم کہ روز سیاہ میں زر داغ دل بھی بنا دیا

کبھی یہی بھی تھا کہ نرمل تیر جگر میں تنہا دہی نے تھے

مگر اب یہ ہے کہ کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رلا دیا

کبھی خود کھوٹتے پھوٹتے بھی جد پھٹتے تو حزیں نہ تھے

مگر آج خود یہ نظر پڑی تو شکست جاں نے ہلا دیا

کوئی نامہ دلبر شہر کا کہ غزل گری کا بہانہ ہو

وہی حرف دل جسے ملتوں سے ہم اہل دل نے بھلا دیا

زیر ع آفتاب کی ڈائری سے خوبصورت نظم

کنکشن ہے زندگی کتنی

سفر شوار کتنا ہے

کبھی رستہ نہیں ملتا

ہمارا ساتھ دے پائے

کوئی ایسا نہیں ملتا

نظا ایسے گزار دوں تو

یہ روز و شب نہیں کتنے

مجھے پھر بھی میرے مالک

کوئی شکوہ نہیں مجھ سے

میں جان یہ کھیل سکتا ہوں

میں ہر دکھ کھیل سکتا ہوں

اگر تو آج ہی کہہ دے

محبت ہمسفر میری

محبت ہمسفر میری

حاجرہ و جاہت: ڈائری سے خوبصورت غزل

ہے دعا یاد مگر حرف دعا یاد نہیں

میرے لغات کو انداز لوا یاد نہیں

ہم نے جن کے لئے راہوں میں بچھایا تھا لہو

ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں

زندگی جبر مسلسل کی طرح کالی ہے

جانے کسی جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں  
میں نے پلوں سے دریا پر دستک دی ہے  
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں  
کیسے بھر آئیں سر شام کسی کی آنکھیں  
کیسے چترائی چرخوں کی صلیب یاد نہیں  
صرف دھندلاتے ستاروں کی چمک دیکھی ہے  
کب ہوا کون ہوا مجھ سے خفا یاد نہیں  
آؤ اک سجدہ کریں عام مہوشی میں  
لوگ کہتے ہیں ساغر کو خدا یاد نہیں  
فرح طاہر: کی ڈائری سے خوبصورت نظم  
مجھے کچھ بھی نہیں کہنا  
یہ بھی نہیں کہنا  
کہ.....

جب تم یاد آتے ہو

تب.....

تمہاری یاد کی شدت مجھے ہنسا بھلا کر  
بہت آنسو لاتی ہے  
میرا آنسو بھگوتی ہے  
مجھے یہ بھی نہیں کہنا کہ.....  
جس میں بھولنے کی ضد میں  
میری سائیں الجھ کر.....  
مجھے آنکھیں دکھائی ہیں  
مجھے پہرہاں ستانی ہیں.....

پھر جب میں.....

تھک کر ٹوٹنے لگتی ہوں

اس لمحے.....

وہ ”تم“ بن کر.....

بہت نرمی.....

بہت گرمی.....

بہت دلار سے مجھ کو

بڑا پس کہ.....

بڑا ج کہ.....

یہ یاد رکھاتی ہے.....

مجھے تم یاد آتے ہو

بہت ہی یاد آتے ہو

فائدہ قاسم: کی ڈائری سے ایک نظم

”ہم برے لوگ ہیں“

تم ہی اچھے تھے کسی سے کبھی ٹکرا نہ کی

تم کسی ٹکرا کرے خوگر بھی نہ تھے

تم ہی اچھے تھے

جو جملہ ارباب نظر رچے تھے

اتنے سادہ تھے کہ زخموں کو حتا کہتے تھے

شہر پر حوصلہ میں

شیدہ امل ہنر پر کسی تنقید نہ کی

اتنے بے بس تھے کہ جب وقت پڑا

اپنی بھی تائید نہ کی

ہم برے لوگ ہیں سچ کہتے ہیں

ہم برے لوگ ہیں خوشنودی ارباب اثر کے باغی

کبھی قطرے کو سمندر نہ دیکھا

کبھی ذرے کو بھی صحرا نہ کہا

قرض آئینہ چکانے کے لئے عکس سے، محروم

ہوئے

سدرہ علی: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

”خواب“

اسی ایک خواب میں آج تک

میں بندھا ہوں آس کے جال میں

کوئی شہر یاد وفاؤں کا

کبھی آئے عشق کے تخت پر

مجھے مجھ سے جھین کے لئے چلے

کہیں دور شہر جال میں

میرے سر و جسم، کوڈ حانپ دے

وہ سلگتی سانسوں کی شال میں

جہاں میں ہوں اس کے جواب میں

☆☆☆

# جھنا کا دوسرا نسخہ

افراج حارثی

1 چائے کا چمچ

پسی ہری مرچ

فلنگ کے اجزاء:

2 عدد

250 گرام

1/4 چائے کا چمچ

1/2 چائے کا چمچ

چند پتے

ابلے اور کچلے آلو

بھنا چکن کا قیمہ

نمک

چاٹ مصالحہ

ہرا دھنیا

ترکیب

ایک پیالے میں 4 کپ میدہ، 1-1/2 کھانے کے چمچے، نمبر 2 کھانے کے چمچے پسی ہوئی چینی، 1 چائے کا چمچ، نمک، ایک عدد اٹھا، 1/2 کپ تیل، ایک چائے کا چمچ، پسی ہوئی مرچ اور دو کھانے کے چمچے خشک دودھ مکس کریں۔

پھر اسے حسب ضرورت نیم گرم پانی کے ساتھ نرم گوندھ لیں۔

اب اسے پھولنے کے لئے ایک گھنٹے تک چھوڑ دیں۔

فلنگ کے لئے پیالے میں ابلے کچلے آلو بھنا چکن کا قیمہ چائے کا چمچ، نمک چائے کا چمچ چاٹ مسالا اور ہرا دھنیا کے چند پتے ڈال کر مکس کریں۔

آٹے کے پیڑے بنائیں، اب ایک ایک کر کے ہر پیڑے کو بڑی پلیٹ کے برابر تیل ڈالیں۔

اب ایک روٹی پر درمیان میں قھوڑی سی فلینگ رکھیں، کناروں پر قھوڑا سا پانی لگائیں، اس

لچھا دار پر اٹھا آٹا گوندھنے کے لئے اجزاء:

تین کپ

حسب ذائقہ

دو کھانے کے چمچ

اٹھا (اگر چاہیں تو نہ ڈالیں) ایک عدد

تمام چیزوں کو آٹے میں مکس کر کے پانی سے

گوندھ لیں اور کم از کم پندرہ منٹ کے لئے

ڈھک کر رکھ دیں۔

ترکیب

اب آٹے کے مناسب سائز کے پیڑے بنا لیں اور روٹی کی طرح تیل لیں، مگر اس پر اٹھے کے لئے آپ روٹی کو بالکل باریک بنائیں گے، روٹی جتنی باریک ہوگی پر اٹھا اتنا ہی اچھا بنے گا۔ اس کے بعد توڑے پر آئل لگا کر کھلی آج پر تیل لیں۔

چکن آلو خیری پر اٹھا

اشیاء

میدہ

نمبر

پسی چینی

نمک

اٹھا

تیل

خشک دودھ

نیم گرم پانی

4 کپ

1-1/2 چمچ کھانے

2 کھانے کے چمچ

1 چائے کا چمچ

1 عدد

1/2 کپ

2 کھانے کے چمچ

حسب ضرورت

روٹی کی طرح سینک کر لکڑی کے جھجے سے تیل لگائیں، سینکنے کے بعد اسے اتار کر اٹی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

### سحری ڈرنک

اشیاء

دودھ  
پائنا اہل جوس  
شہد  
کیلے  
پسی دار چینی  
ایک پاؤ  
ایک کپ  
چار کھانے کے جج  
دو عدد  
ایک چٹکی

ترکیب

گرائنڈر میں دو عدد میٹھ کیے ہوئے کیلے، ایک پاؤ دودھ، چار کھانے کے جج شہد، ایک کپ پائنا اہل جوس، ایک چٹکی دار چینی شامل کر لیں اور گرائنڈر کی مدد سے گرائنڈ کر لیں۔ اب ایک سردنگ گلاس میں نکال کر سرو کریں۔

مسالا بھری مرچوں کے پکڑے

اشیاء

ہین  
ہری مرچ  
نمک مرچ  
(ذیرہ، اٹلی کارس، یا لیوں کارس، چاٹ مسالا  
مرچوں میں بھرنے کے لئے)  
مٹی تلنے کے لئے  
حسب ضرورت

ترکیب

ایک کڑاہی میں مٹی گرم کریں، مرچوں کو درمیان سے کٹ لگا کر ج نکال دیں، پھر اس میں نمک مرچ، ذیرہ اٹلی کارس یا لیوں کارس، چاٹ مسالا بھر دیں ہین کو نمک مرچ ڈال کر

پر دوسری روٹی رکھ کر کناروں کو اچھی طرح جوڑ دیں، اس کے بعد اچھی طرح تیل کر بیکنگ ٹری میں رکھیں اور 200 ڈگری سینٹی گریڈ تک گرم اودن میں بیک کر لیں یا پھر دو کھانے کے جج مٹی کے ساتھ فرائی کر لیں۔

### دال پراٹھا

اشیاء

جتنے کی دال  
نمک  
پسی لال مرچ  
لیوں  
پودینہ (باریک کٹا ہوا)  
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی)  
تیل  
آدھا کلو

ترکیب

جتنے کی دال کو نیم گرم پانی سے دھو کر ابالیں لیکن دال بہت نرم نہ ہو نہ مٹی بھری رہے، جب دال گل جائے تو اسے ٹھنڈا کر کے چور میں پیں لیں، پھر اس میں حسب ذائقہ نمک، پسی لال مرچ، لیوں کارس، پودینہ اور باریک کٹی ہری مرچ شامل کر کے رکھ دیں، اب کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں مسالا ملی دال کو ہلکا سا بھون لیں، اس کے بعد آٹے میں نمک ملا کر تیلے میں نیم گرم پانی کے ساتھ گوندھیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں، ساتھ ہی تو گرم کر لیں، پھر آٹے کا ایک بیڑا بنا لیں اور روٹی کی طرح تیل کر اس پر تھوڑی دال پھیلا دیں، کنارے تھوڑے تھوڑے چھوڑ دیں، اس کے بعد کناروں پر گیلا میدہ لگا کر دوسری روٹی تیل لیں اور اسے اوپر رکھ کر کناروں کو ہلکا سا دبا کر بند کر دیں، اب گرم توڑے پر اسے

گاڑھا پھینٹ لیں، پھر اس میں مرچوں کو پلٹ کر تل لیں۔

جائے تو آج بھلی کر کے کچوریاں تلتا شروع کر دیں، جب براؤن ہو جائیں تو نکال کر چھلکی میں اخبار بچھا کر اوپر رکھتی جائیں تاکہ تیل جذب ہو جائے، گرم گرم اٹی کی پختی دہی کے راسخ کے ساتھ سرد کریں۔

## قیمہ کی کچوریاں

اشیاء

قیمہ بغیر چربی والا

پیاز درمائی ڈلی

آلیٹ کی پیاز کی طرح کٹی ہوئی

لیموں

ہر ادھیا بار یک کٹا ہوا

ہری مرچ بار یک کٹی ہوئی تین عدد

ادرک لیسن پسا ہوا

لال مرچ پس ہوئی

کالی مرچ پس ہوئی

نمک

کھانے کا سوڈا

تلنے کے لئے تیل

ترکیب

سب سے پہلے آنے میں اجوائن نمک اور

سوڈا ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں اور کسی سیلے

کپڑے سے ڈھانک کر تقریباً پندرہ منٹ کے

لئے رکھ دیں۔

پھر ایک دیہی میں ایک کھانے کا چمچہ ڈال

کر قیمہ ڈال دی ساتھ میں نمک، ادرک لیسن اور

مرچ ڈال دیں، جب پانی خشک ہو جائے تو لکا

سا بمون کر پیاز، ہری مرچ اور ہر ادھیا ڈال

دیں اوپر سے لیموں کا رس ڈال دیں پھر اچھی

طرح مکس کر لیں ٹھنڈا ہونے دیں، اب آنے کا

چھوٹا سا پیڑا لے کر ہاتھ گیلا کر لیں پھر پیڑے،

پھیلا کر تھوڑا سا قیمہ رکھ کر چاروں طرف سے بند

کر دیں، ذرا سادہا کر کچوری کی طرح پھیلا لیں،

کڑا ہی میں تیل گرم کریں، جب خوب گرم ہو

## قیمے کے ککلس

اشیاء

قیمہ

آلو ابے ہوئے

انڈے

ہر ادھیا، بار یک کٹا ہوا

ہری مرچ پس ہوئی

پیاز آلیٹ کی طرح کٹی ہوئی بڑی ڈلی

ڈبل روٹی کا چورا

نمک

تلنے کے لئے تیل

ترکیب

سب سے پہلے آلو کو ابالیں، جب آلو اچھی

طرح گل جائیں تو ان کا چھلکا اتار کر کاٹنے کے

ساتھ بھرتہ بنالیں، ایک دیہی میں ایک کھانے کا

چمچہ تیل ڈال کر قیمہ ڈال دیں، ساتھ سارا مسالا

بھی ڈال دیں، جب قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو

تھوڑا سا بمون کر اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے دیں،

پھر تھوڑے سے آلو ہاتھ میں لے کر اس کو پھیلا

لیں، اب اس میں تھوڑا تھوڑا قیمہ بھر کر ککلس بنا

لیں، انڈا لگا کر چورا لگا لیں اور بھلی آج پر فرانی کر

لیں۔

چکن سموسہ

اشیاء

چکن کا قیمہ

آدھا کلو

54



## لینفل رائس سوپ

اشیاء  
چاول ابلے ہوئے  
آدھا کپ  
چینی  
مسور کی دال گرینڈ کی ہوئی  
آدھا کپ  
گاجر کش کی ہوئی  
ایک کپ  
پیاز براؤن کیا ہوا  
ایک عدد  
سلاڈ  
ایک گٹھی  
نمک  
ایک کھانے کا چمچ  
سبز مرچ پیسٹ کی ہوئی  
دو عدد  
سرکہ  
دو کھانے کے چمچ  
پانی  
ترکیب  
حسب ضرورت

مسور کی دال کو پندرہ منٹ کے لئے دھو کر بھگو دیں، گرینڈز میں ابلے ہوئے چاول اور مسور کی دال کو ڈال کر گرینڈ کریں ایک ساس پین میں ایک لیٹر پانی ڈال کر دال اور چاول والا آمیزہ ملائیں، کش کی ہوئی گاجر، براؤن کیا ہوا پیاز، نمک ملا کر خوب پکائیں، جب آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو چینی ملا دیں اور ایک جوش آنے دیں سوپ کے پالے میں سوپ نکال کر ٹیبل پر لے آئیں ایک ڈش میں سلاڈ کے پتے کاٹ کر ساتھ رکھیں اور سوپر میں سبز مرچوں کا پیسٹ سرکہ ملا کر رکھ دیں سوپ نوش کرتے وقت اپنی پیالی میں سلاڈ اور سبز مرچوں کی ساس ملائیں، بے حد لذیذ سوپ تیار ہے۔



فالسوں کو اچھی طرح صاف کریں، تھوڑے پانی میں فالسے ڈال کر ہاتھوں کے ذریعے مسلیں اور گھٹلیاں الگ کریں، گودا ملا پانی مکسر میں ڈال کر پتلا رس نکال لیں، چینی اور پانی ملا کر چینی حل ہونے تک پکائیں، چھان کر ایک تار کی چاشنی بنائیں، رس ڈال کر تھوڑی دیر تک پکائیں، اسے ٹھنڈا کر کے سٹیرک اینڈ ملائیں، اب اس شربت کو صاف خشک بوتلوں میں بھر کر رکھیں، اب اس کو انگور کے تیار شربت میں اچھی طرح ملا دیں، صاف اور خشک بوتلوں میں اس مشروب کو بھر کر ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں، برف اور ضرورت کے مطابق پانی ڈال کر اس مشروب کو ملا کر پیش کریں۔

## کچے آم کا شربت

اشیاء  
ابلے کے آم کا گودا  
دو کپ  
چینی  
نمک  
بھنا پیازیرہ  
پاپو دینہ  
پانی  
ترکیب  
دو کپ  
چار کپ  
ڈیڑھ چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
دو کپ

پانی اور چینی ملا کر چاشنی بنائیں، چاشنی کو ٹھنڈا کر کے چھان لیں، آم کا گودا مکسر میں ڈالیں، نمک زیرہ اور پودینہ ڈالی اور مکسر چلا کر ہار یک پس لیں، تیار چاشنی میں بے ہوئے کچے آم کا مرکب ملائیں، صاف اور خشک بوتلوں میں بھر کر رکھیں۔

پینے یا پلانے کے وقت ایک حصہ رس یا شربت میں تین حصے پانی اور چورا برف ملائیں اور افطاری میں استعمال کریں۔

# گھر میں کیا عمل کرے وہ فاسد

فزیہ شفیق

اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کریں، اسلام کے اصولوں پر کاربند رہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کے احکامات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

رمضان المبارک کی خصوصی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا، اپنا خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کا خیال رکھتے ہیں، آئیے مئی کے شمارے کی تحریروں پر قارئین کی رائے جاننے کے لئے ”کس قیامت کے یہ تائے“ کی محفل میں ملتے ہیں، درود پاک، کلمہ طیبہ اور استغفار کا ورد کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے آمین۔ یہ پہلا خط ہمیں رفعت سعید کا چیچہ وطنی سے موصول ہوا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

مئی کا شمارہ ماروا حسین کا ناسٹل سے سچا ملا بے حد پسند آیا، حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دل و دماغ پر مصور کن کیفیت طاری کر دی، پیارے غمی کی پیاری باتیں پڑھیں معلومات میں اضافہ ہوا جزاک اللہ۔

انشاء نامہ میں ”کچھ حسب حال“ کے عنوان سے موجودہ صورت حال کی عکاسی کرتی ہوئی انتہا کی دلچسپ تحریر محکم سب سے پہلے بشری سیال کا ناول ”پریت نہ بھیجو کوئی“ پڑھا، واہ بہت خوب بشری سیال نے بہت اچھا لکھا موضوع اگرچہ وہی پرانا ”دنی“ تھا مگر خوب صورت

السلام علیکم! آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

رمضان المبارک کا بابرکت اور فضیلت والا مہینہ اپنی رحمتیں لٹا رہا ہے اور یقیناً آپ سب اس سے فیضاب ہو رہے ہوں گے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے روزہ فرض کرنے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے، تقویٰ کا مطلب ہے خود کو غلط باتوں سے محفوظ رکھنا اور حکام خداوندی کے مطابق صحیح طریقوں پر زندگی بسر کرنا، تقویٰ تمام عبادات کی بنیاد ہے اور اسلام کی تمام عبادات کا بنیادی مقصد باطنی اصلاح اور قلبی کیفیات کی تہذیبی ہے۔

روزہ کی وجہ سے محرمی سے لے کر افطاری تک انسان عملی طور پر صبر اور شکر، اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے ضابطوں اور احکام کی اطاعت کرنے کی تربیت مسلسل اور لمحہ بہ لمحہ ہوتی رہتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مہینے سخاوت کی انتہا کر دیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور سنت کا تقاضا ہے کہ اس مہینے مستحقین کی دل کھول کر امداد کی جائے، ماہ رمضان کے ایک ماہ کے روزے خالق تعالیٰ کی عبادت اور مخلوق کی تربیت ہے، اس ایک ماہ کے روزوں کی تربیت کا حقیقی مفہوم اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب رمضان المبارک کے بعد بھی ہم

لفظوں کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا گیا، ناول میں شامل دونوں نظمیں بے حد شاندار تھیں خصوصاً چل آرک نظم کہوں، کیا یہ بشری سیال جی کی اپنی شاعری تھی، پلیز بتائیے گا ضرور، اعلیٰ قسط کا شدت سے انتظار رہے گا، سونیا چوہدری کا ناول ”متاع جان ہے تو“ کا اینڈ اگرچہ افسردہ کر دینے والا تھا مگر پسند آیا، سونیا چوہدری بے حد خوبصورتی سے کہانی کا اختتام کیا، کاش کہ مصطفیٰ کو حیات کی محبت کا احساس اس کی زندگی میں ہو جاتا، ام ایمان قاضی کی طویل تحریر مکمل ناول کی صورت ”مجھے شفاف رہتا ہے“ بھی اچھی لگی۔

ناولٹ ”ان لکھوں کے دامن میں“ کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ رہا اس کی پہلی قسط بڑی یاد دل بھی مگر آجے چل کر مشیرہ سلسلہ برقرار نہیں رکھ پائیں، بعض جگہ کرداروں سے ایک ہی جملہ بار بار رٹوایا گیا جو کہ پسند نہیں آیا، پلیز مشیرہ اس طرف توجہ دیں۔

”دل گزیدہ“ ام مریم کا ہمیشہ کی طرح پسند آیا، ثاباب جیلانی نے اس مرتبہ کیا کیا ہے، کوئے کو کیوں مار دیا، اتنا اچھا کردار تھا اس کا، اب مورے اور اس کی فیملی کا کیا ہوگا، دوسری طرف ام مریم کا ناول ”دل گزیدہ“ میں بھی کوئی بہار کا جھونکا آئی نہیں رہا، ہر طرف یاسیت، مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، غائبہ پچاری بڑھاپے کی طرف گامزن ہے مگر جب سے وہ فیب چوہدری کی زندگی میں آئی ہے خوشی نام کی چیز اس سے روٹھ گئی ہے، ایسی بھی کیا محبت ہوئی۔

ناولٹ میں مشیرہ انصاری اپنی تحریر کو بلاوجہ لمبا کر رہی ہیں، پلیز اس کا اب اختتام کر دیں، دو قسطوں سے وہی کچھ چل رہا ہے، الحان کا مانو کے بچے خوار ہونا اور باقی لڑکیوں کا الحان کے لئے پاگل ہونا، لگتا ہے مصنفہ صاحبہ ہمسایہ ممالک کے

ایک شو سے متاثر ہو کر اس تحریر کو لکھ رہی ہیں۔ افسانے بھی اچھے تھے لیکن تابندہ جاوید کی تحریر ”معموم شکایتیں“ بے حد پسند آئی، حنا میں ان مصنفہ کا نام پہلی مرتبہ دیکھا ہے پہلی مرتبہ آتے ہی وہ چھائیں ویلڈن تابندہ جاوید، آپ کی ایسی ہی چٹ پٹی تحریروں کا انتظار رہے گا، جبکہ ”دریگی آنے میں“ ثمنینہ بٹ کی تحریر بھی متاثر کن رہی، حنا صفر کا افسانہ ”اک بل“ اگرچہ مختصر تھا مگر بے حد سبق آموز، مستقل سلسلے میں حاصل مطالعہ میں سعدیہ جبار کا ”جب برائی زیادہ ہو جائے“ فرح عامر اور فریال امین کے انتخاب نے متاثر کیا، میری ڈائری اور بیاض سبھی دوستوں کا انتخاب ان اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کر رہا تھا جبکہ حنا کی مغل اور رنگ حنا نے مسکراہٹوں کے جلوے بکھیرے، دستر خوان میں افراح طارق نے حرے حرے کے کھانوں سے ہماری تواضع کی، کس قیامت کے یہ نامے میں گھٹ غفار کی آمد پسند آئی، باقی دوستوں کے تبصرے بھی جاندار تھے۔

رفعت سعید! اس مغل میں خوش آمدید، مئی کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی تعریف و تحقید ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے، بشری سیال کے ناول میں شائع نظم کے خالق کوئی اور ہے، آپ کی رائے کے ہم آئندہ بھی شکر رہیں گے شکریہ۔

ماہ بشیر: ڈنگ سے ملتی ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون بھی، ہم بھی حنا کے بہت پرانے قاری ہیں پر آج آپ کے رو بردہ ہوئے ہیں، پر ایک ڈرا بھی بھی ہے کہ پتا نہیں ہم آپنی نوزیہ کی مغل میں شامل ہو پائیں گے کہ نہیں۔

ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا، مادرا

حسین ہماری پسندیدہ ماڈل ہیں، تو ٹائٹل کیسے نہ پسند آتا ہے، اس کے بعد پہنچے ”پرہیز“ کے اس پار کہیں ”غضب کا ناول ہے یہ، ”دل گزیدہ“ آپ مریم الفاظ نہیں ہے دلیل ڈن بہت خوب، مکمل ناول ”پرہیز نہ تھیو“ اور ”مجھے شفاف رہنا ہے“ یہ دونوں بہت پسند آئے۔

”مناج جاں“ سونیا چوہدری یہ قطع بھی اچھی رہی۔

ناولٹ ”ان لمحوں کے دامن میں“ مبشرہ انصاری اچھا جا رہا ہے، افسانے چار تھے چاروں ایک سے بڑھ کر ایک نکلے۔

حاصل مطالعہ میں سب کے انتخاب اچھے لگے، کس قیامت کے یہ نام سب کے سب کے سب اچھے لگے اب دیکھنا ہے کسی کو ہمارا تبصرہ پسند آئے گا۔

حتا کا دسترخوان، سب ڈشز اچھی لگیں کسی کوئی ایک ٹرائی کروں گی، حنا کا انداز بیاں بہت مختلف ہے اس لئے اس کے علاوہ کوئی ماہنامہ دل کو بھاتا نہیں ہے، اگلے ماہ تک کے لئے اللہ حافظ، حنا دن دینی رات چوگنی تری کرے آمین۔

ماہا بشیر خوش آمدید، دل و جان سے آپ کو اس محفل میں، مئی کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، یہ آپ نے کیا بات کی، ہم آپ کو اس محفل میں جگہ نہیں دیں گے، حنا آپ کا، یہ محفل آپ کی، جسے آپ سب اپنی محبتوں کے دیئے جلا کر روشن کرتے ہیں۔

مئی کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گے شکریہ۔  
شمرہ کا مئی: ذرین سے ملتی ہیں۔

مئی کا شمارہ، ٹائٹل میں ماروا حسین بہت پیاری لگ رہی تھی، حنا ہمیں بہت لیٹ ملتا ہے، ابن انشاء کی باتیں پڑھ کر بے ساختہ مسکراہٹ لبوں کو چھو لیتی ہے، ام مریم کا ناول ”دل گزیدہ“

کچھ خاص پسند نہیں آ رہا، نہ جانے کیوں لگتا ہے کہانی کچھ ابھی ابھی سی ہے، بشری سیال، ام ایمان قاضی، سونیا چوہدری کے مکمل ناول بے حد پسند آئے، افسانوں میں حمیرا الوشین کا افسانہ نمبر دن رہا، میری فوٹ ”پرہیز“ کے اس پار کہیں“ بھی بے حد اچھا جا رہا ہے، نایاب جی لومی کا شانزے کے ساتھ نہ بنائے گا، ویسے حمت اور امام کی جوڑی اچھی لگے گی، ہمام کا کردار میرا فوٹ ہے، نیل بری کی آزمائش بھی اب ختم کر دیں نایاب جی، بچاری کافی عرصے سے جہاندار کی بے رحمی سہہ رہی ہے، آپلی مجھے آپ سے پوچھنا ہے کہ میں مختلف رسائل میں ملتی ہوں اور اب میں یہ چاہتی ہوں کہ حنا بھی اپنی تحریروں سے مجھروں، پلیرز آپ مجھے یہ بتادیں کہ آپ کے ماہنامے میں تحریریں بھیجنے کا طریقہ کار کیا ہے۔

آخر میں بات ہو جائے کس قیامت کے یہ نامے کی تو اس میں اس مرتبہ مزہقت غفار کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔

شمرہ کا مئی اس محفل میں خوش آمدید، مئی کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تعریف و تنقید مصنفین کو ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہیں۔

آپ ضرور حنا میں اپنی تحریریں بھیجیں، ہمیں خوشی ہوگی، آپ تحریر لکھتے وقت ایک لائن چھوڑ کر لکھیں گا اور ”حنا“ میں جو خط و کتابت کا پتہ شائع ہوتا ہے اسی پر اپنی تحریریں بھجوادیں، اب جو سوال ہے اعزاز ہے کا تو تین تحریریں شائع ہونے کے بعد اعزاز یہ دیا جاتا ہے شکریہ۔

☆☆☆